پاکستان کی تاریخ... قدم بہ قدم... نظریات کا ٹکراؤ

آزادی نمبر

اگست ۲۰۲۰ء

اُردو ڈائجسٹ

www.urdudigest.pk
urdudigest.pk

Pakistanipoint
Learning Point

ڈوبتے جہاز کے فرسٹ کلاس مسافر

عالمی استعماری طاقتوں کے عروج و زوال کی ڈرامائی داستان

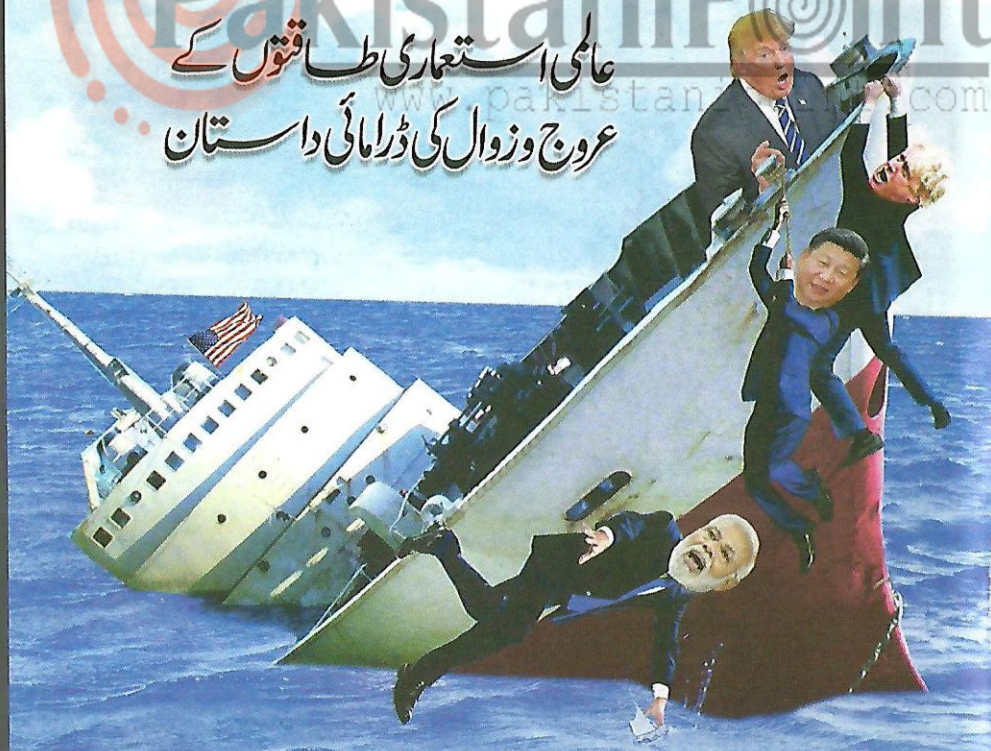

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

اُردو ڈائجسٹ

اگست 2020ء
ذوالحج 1441ھ
جلد نمبر 60 شمارہ نمبر 8

www.urdudigest.pk
urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی

ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر

مجلس تحریر: سیّد عاصم محمود، ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان

مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی

انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی

سرورق: اسلم کمال (تمغۂ حسن کارکردگی)

ڈیزائنر و کمپوزر: کاشف شہزاد، رانا محمد سلیم

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk

مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564

کاشرہ کرم: 0307-0060707

سالانہ خریداری

740 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk

فون: +92-42-35290707

پاکستان 2115 کے بجائے 1375 روپے میں

بیرون ملک ~~100~~ 80 امریکی ڈالر

اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
PK34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731

ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت: 130 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

فہرست

اگست 2020ء

کچھ اپنی زبان میں

آزادی کا جمال وجلال ... عالمی برادری نریندر مودی سے نفرت کرنے لگی ہے — الطاف حسن قریشی — 09

انٹرویو

ہم بھی وہاں موجود تھے ... پاکستان ۱۵ اگست کو آزاد ہوا — زاہد عرفان — 15

عالمِ تمام

ڈوبتے جہاز کے فرسٹ کلاس مسافر ... عالمی استعماری طاقتوں کے عروج و زوال کی ڈرامائی داستان — سیّد عاصم محمود — 46

محرم الحرام

حضرت اسماعیلؑ سے حضرت حسینؓ ... تک حضرت امام حسینؓ نورِ کربلا ہیں اور تا قیامت رہیں گے — عافیہ مقبول جہانگیر — 28

گوشۂ مشاہیر

مولانا عبیداللہ سندھی ... ایسی شخصیت کا دل افروز تذکرہ جس نے محبتِ اسلام میں گھر اور مذہب چھوڑ دیا — حامد سراج — 36

قومی تاریخ

نظریات کا ٹکراؤ ... پاکستانی تاریخ کا قدم بہ قدم نظریاتی تجزیہ پیش کرتی قابلِ فکر تحریر — سجاد میر — 80

شخصیت

دوست کی جدائی ... وہ انسان دوست اور معاشرے کا سچا ہمدرد تھا...... جو ہم سے بچھڑ گیا — ضیاالاسلام زبیری — 89

افسانے/کہانیاں

نورانی نُور ... اُس فوجی کی کہانی جس کے اندر شہادت پانے کی خواہش مچل رہی تھی — راؤ محمد شاہد — 93

روزنِ زنداں ... اُس بہادر لڑکی کی کہانی جس نے اپنے بڑوں کی نام نہاد روایتیں توڑ ڈالیں — کنول بہزاد — 115

دیارِ غیر سے

شاہین باغ اور بیگم ... دہلی میں مسلمان خواتین کے تاریخ ساز احتجاج پر سکھ صحافی کا مسکراتا تجزیہ — جسپال سنگھ — 96

طنز و مزاح

بے روزگار آدمی ... ایسے آدمی کی دلچسپ کہانی جو بار بار ملازمت پکی ہونے کے باوجود بدقسمت ٹھہرتا — شوکت علی تھانوی — 105

مخلوقِ خدا اور ہم ... چرند پرند اور انسانوں کے مابین تعلق اور خصلتوں کا قہقہہ بار تذکرہ — شفیق الرحمن — 130

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

پاکستان کی تاریخ... قدم بہ قدم... نظریات کا ٹکراؤ

80

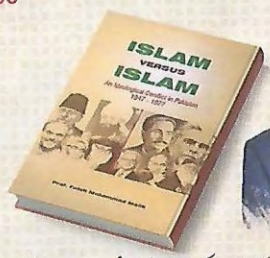

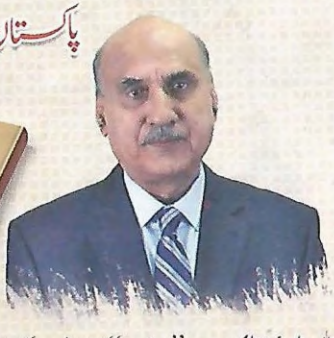

اللہ بنائے جوڑی... دو ''مہذب'' خاندانوں کے ملاپ کی پُرلطف کہانی..... جو بظاہر کچھ اور نظر آتے — محمد فاروق انجم 201

پابندی کی اوقات... اہم آدمی ہمیشہ اس وقت تقریب میں جاتا ہے جب سب آ کر جا چکے ہوں — ڈاکٹر یونس بٹ 209

طب و صحت

گڈ بائے شوگر... دل کو یقیں تھا کہ یہ مرض جواں عمری میں مجھے نہیں ہو سکتا مگر مشیتِ الٰہی.....؟ — ایڈووکیٹ زاہد عرفان 110

برساتی بیماریاں... بعض اوقات معمولی سا مرض بھی بڑھ کر چھوت اور جان لیوا بن جاتا ہے — ڈاکٹر جاوید اقبال 185

آپ بیتی

غمِ عشق اگر نہ ہوتا... اس سفر میں منکسر المزاجی اور درویشی کے دَر وا ہوتے ہیں — ڈاکٹر انیس الرحمن 121

ہجرت کے ان منٹ نقوش

سفرِ یقین... سورج بھی جس منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے بادلوں میں چھپ گیا — پروفیسر ڈاکٹر امتیاز رسول 138

چھوٹا پاکستان... پتلی بی اپنے بیٹے کا جنازہ چھوڑ کر آئی تو اس کے چہرے پر عجب سکون تھا — جمیل عثمان 143

اُنیس اگست... ایسی باحوصلہ خاتون کی کہانی جس کا صبر اپنی مثال آپ تھا — فاطمہ زہرہ 150

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو... کاش ہم اب بھی غلامی کا مفہوم سمجھ لیں تو اس سے بچنے کے اہل ہو سکتے ہیں — فریدہ عظیم 155

خط بے نشاں... جس کی منزل گھر نہ انساں، آخر وہ وہیں پہنچا جہاں اسے جانا تھا — تحسین گل 159

داستانِ آزادی... جب صرف 21 نوجوانوں نے ہندوؤں کو روکے رکھا — سجاد حسین راجا 165

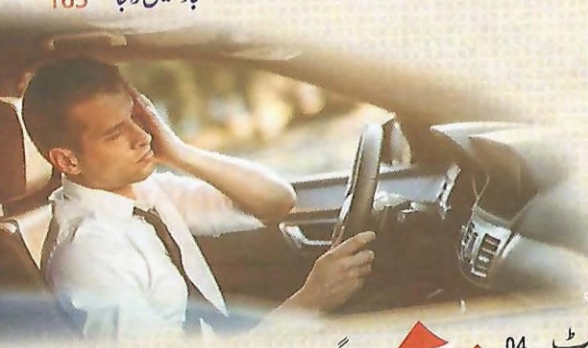

110

گُڈ بائے شوگر

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

چند ہفتوں کا مہمان 211

مندر کا بھوت 190

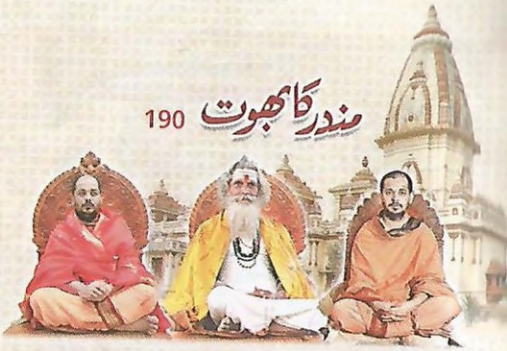

یادِ رفتگاں

عربدہ میداں... غرور اور شہرت کا نشہ آخر کار اُتر ہی جاتا ہے..... مگر تب تک زندگی گزر جاتی ہے | آغا گل | 99

سفرنامہ

ایک تھا امرتسر... سکھوں کے سب سے پوتر نرالے شہر کی سیاحت کا دلچسپ احوال | ثریا حفیظ الرحمن | 171

غذائیات

چند ہفتوں کا مہمان... قدرت نے ہر مہنگے یا سستے پھل کو افادیت میں ہم پلہ بنایا ہے | حکیم سید صابر علی | 211

پُراسرار کہانی

مندر کا بھوت... بوڑھے پروہت کا عجیب قصہ جو اپنا کام ہونے پر کلکٹر پر فدا ہو گیا | شاہ محی الحق فاروقی | 190

فکاہیہ

ہائے اُردو!... جب قومیت ہی مفقود ہو تو قومی زبان کو اہمیت کہاں نصیب ہو گی | منظر علی خان منظر | 214

اخلاقیات

کوئی بات نہیں... یہ ایک چھوٹا سا جملہ بڑے بڑے مسائل کا حل ہے | صدف نایاب | 197

لمحۂ فکریہ

بس ایک جرثومہ... کورونا کی آزمائش نے انسان کو بدل ڈالا یا وہ اب بھی ویسا ہی ہے | ہادیہ امین | 200

مستقل سلسلے

شعر و سخن 217 — تبصرہ کتب 221 — چمنِ خیال 223 — اُردو کہاوتیں 229

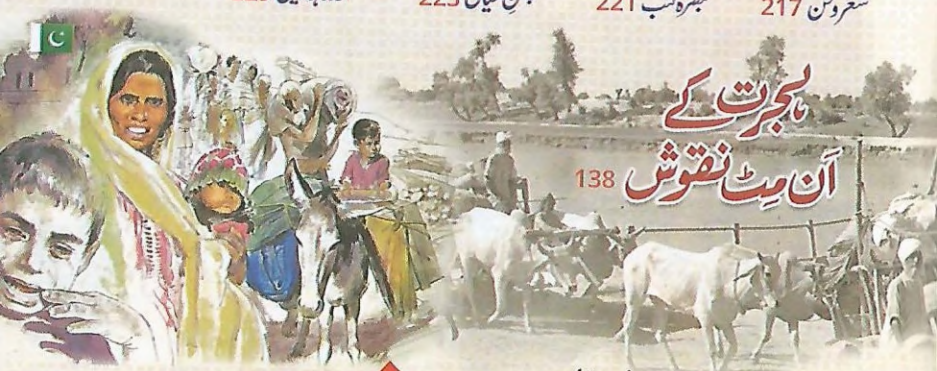

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ہجرت کے اَن مِٹ نقوش 138

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے ان مہاجرین کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی مدد کی، یہ لوگ ایمان کا پورا حق ادا کرنے والے ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔'' (سورۃ الانفال، ۷۴)

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

رسول اللہ ﷺ کا فرمان

حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک شخص سے دو بہتر ہیں اور دو سے تین بہتر ہیں اور تین سے چار بہتر ہیں لہٰذا تم جماعت (کے ساتھ رہنے) کو لازم پکڑو کیونکہ اللہ تعالیٰ میری امت کو ہدایت پر ہی جمع فرمائے گا یعنی ساری امت گمراہی پر کبھی مجتمع نہیں ہو سکتی لہٰذا جماعت کے ساتھ رہنے والا گمراہی سے محفوظ رہے گا۔ (مسند احمد، ۱۴۰)

آزادی کا جمال و جلال

برِصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کا سفر ڈیڑھ صدیوں پر محیط رہا۔ ریشمی رومال کی تحریک اُٹھی جس نے اُن کے اندر ایثار اور استقامت کا ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کیا تھا۔ تحریکِ مجاہدین یوں تو سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف اُٹھی تھی، مگر اُس نے جاں نثاری کی ایک لازوال داستان مرتب کی۔ حکیم الاُمت علامہ اقبال نے اُمت کے تصور کو اِس قدر ہمہ گیر اور حیات افروز بنا دیا تھا کہ مسلمانوں کے تنِ مردہ میں ایک نئی جان پڑ گئی تھی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام قائم کرنے کی جو دعوت دے رہے تھے وہ تعلیم یافتہ گھرانوں میں اقامتِ دین کا گہرا شعور پیدا کر رہی تھی۔ تحریکِ احرار، حکومتِ الٰہیہ کے قیام کو زندگی کا مشن بنائے ہوئے تھی۔ علامہ مشرقی نے تحریکِ خاکسار کی بنیاد رکھی جس کا مقصد فوجی ڈسپلن کے ذریعے انگریزوں سے اقتدار چھین لینا اور مسلمانوں کی ایک مستحکم حکومت قائم کرنا تھا۔ اُسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنی ایمان افروز تحریروں اور خطبات کے ذریعے سینوں میں طوفان اُٹھا رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کا روزنامہ 'زمیندار' حکمران انگریزوں اور تنگ نظر ہندو برہمنوں پر آئے دن بجلی گرا رہا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں نواب سلیم اللہ خاں نے پورے ہندوستان سے دو ہزار مسلم اکابرین کو اجتماعی معاملات پر غور و خوض کرنے کے لیے ڈھاکہ آنے کی دعوت دی۔ اِس تاریخی اہمیت کے اجتماع کا افتتاحی اجلاس 30 دسمبر 1906ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت نواب وقار الملک نے کی اور اپنے خطبے میں 1857ء کے بعد کے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنے آپ کو اُس وقت کے لیے تیار کرنا چاہیے جب انگریز ہندوستان سے رخصت ہو رہے ہوں گے اور مسلمان ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اِس بصیرت افروز تقریر کی روشنی میں گہرے غور و فکر کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ نواب سلیم اللہ نے اِس جماعت کے اغراض و مقاصد پیش کیے جو علم و اقدار کے تحفظ اور سیاسی مفادات کے فروغ پر مشتمل تھے۔ پھر برِصغیر میں ایک تاریخی تحریک شروع ہوئی جسے پاکستان کے حصول کا اعزاز حاصل ہوا۔

اِن مختلف تحریکوں اور اجتماعی کوششوں نے مسلمانوں کی بیداری میں اپنے اپنے طور پر حصّہ لیا اور بعض مسلم زعما انیسویں صدی کے آخر میں اِس حقیقت کی نشان دہی کرنے لگے تھے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو قومیں بستی ہیں جو متضاد تہذیبی اور تاریخی پس منظر کی حامل ہیں۔ انگلستان میں زیرِ تعلیم نوجوان چودھری رحمت علی نے "Now and Never" کے عنوان سے

ایک پمفلٹ تحریر کیا تھا اور مسلمانوں کے مجوزہ وطن کا نام پاکستان رکھا تھا، مگر یہ انفرادی کوششیں تھیں۔ سب سے پہلے حکیم الاُمت حضرت علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ وطن کا تصور ایک سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے باقاعدہ طور پر پیش کیا تھا۔ 1930ء میں ہندوستان کا آئینی مسئلہ حل کرنے کے لیے انگلستان میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہو رہی تھی اور الٰہ آباد کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ اِس اجلاس کی صدارت علامہ اقبالؒ فرما رہے تھے اور اُنھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں پیش گوئی کی کہ میں ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلمانوں کی ریاست قائم ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ دس برس بعد خطبۂ الٰہ آباد کی اساس پر آل انڈیا مسلم لیگ نے قائدِ اعظمؒ کی صدارت میں قراردادِ لاہور منظور کی جو بنگال کے وزیرِ اعظم مولوی فضل الحق نے پیش کی تھی۔ اِس تاریخ ساز اجلاس میں پورے ہندوستان سے ایک لاکھ کے لگ بھگ مندوبین نے حصّہ لیا تھا اور جداگانہ وطن کا حصول مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کا نصب العین قرار پایا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے اپنے خطبے میں فرمایا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو الگ الگ تہذیبوں سے ہے۔ ان کی تاریخ ایک دوسرے سے مختلف اور ان کے مذہبی مقتدات، سماجی تصورات ایک دوسرے سے متضاد ہیں یعنی جو ایک قوم کے ہیرو ہیں، وہ دوسری قوم کے وِلن ہیں۔ ان کے مابین شادیاں ہوتی ہیں نہ آپس میں کھانے پینے کا رواج ہے۔ یہ دونوں قومیں ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اِس لیے مسلمان قوم کے لیے جداگانہ وطن کا قیام ایک فطری تقاضا ہے۔

قائدِ اعظمؒ نے خطبے کے اختتام پر فرمایا کہ اسلام کے سپاہیو اور دانش ورو! پورے ملک میں پھیل جاؤ اور ہم نے آج کے اجلاس میں جو نصب العین طے کیا ہے، اس کے حصول کے لیے اپنی تمام توانائیاں صَرف کر دو۔ اِس موقع پر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن وجود میں آئی جس کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے اجلاسوں سے وہ بصدِ شوق خطاب فرماتے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے 20 مارچ 1941ء کو خطاب کرتے ہوئے کہا: ''خوب یاد رکھیے یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد اب تک سب سے بڑا کام ہے جو آپ نے اپنے ذمے لیا ہے۔''

قراردادِ لاہور کی بنیاد پر جسے ہندو پریس نے 'قراردادِ پاکستان' سے موسوم کرنا شروع کر دیا تھا، حضرت قائدِ اعظمؒ نے بے مثال سیاسی بصیرت، لازوال استقامت، بے داغ کردار کی قوت اور مسلمانوں کی بے پناہ حمایت سے صرف سات سال کی قلیل مدت میں پاکستان وجود میں آیا جو مؤرخین کی نظر میں بیسویں صدی کا بہت بڑا معجزہ قرار پایا۔ برطانوی مؤرخ والپورٹ نے لکھا ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے بیک وقت منتشر لوگوں کو ایک مضبوط قوم کے قالب میں ڈھالا اور ایک پُرامن سیاسی جدوجہد کے ذریعے ریاست قائم کی جسے دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ انڈین کانگریس کی قیادت کے لیے ہندوستان کی تقسیم کسی طور قابلِ قبول نہیں تھی جبکہ برطانوی حکومت بھی تقسیم کی سخت مخالف تھی، مگر قائدِ اعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت اور اُن کی بے نظیر مذاکراتی صلاحیت سے دونوں ہی قومیں مات کھا گئیں اور اُنھیں برِصغیر کے مسلمانوں کے لازوال آدرشِ آزادی کو تسلیم کرنا پڑا۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

تقسیمِ ہند کے بعد دو ایسے بڑے واقعات رونما ہوئے جو مستقبل پر ایک مدت تک اثر انداز ہوتے رہے۔ گاندھی جی تقسیم ہند کے پوری شدت سے مخالف تھے، لیکن جب اُنھوں نے محسوس کر لیا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے، تو وہ مسلمانوں کو ہندو عوام کے غیظ و غضب سے بچانے کے لیے میدانِ عمل میں نکل آئے، دور دراز فسادات زدہ علاقوں میں گئے اور قیامِ امن کے لیے سرگرم رہے۔ پھر جب بھارتی حکومت نے پاکستان کے واجب الادا پینتیس کروڑ رُوپے دینے سے انکار کیا، تو اُنھوں نے نہرو اور پٹیل سے کہا کہ وہ معاہدے کے مطابق پاکستان کا حصّہ ادا کریں، مگر اُنھوں نے لیت و لعل سے کام لیا۔ اِس پر گاندھی جی نے مرن بھرت رکھا جس کے باعث بھارتی حکومت پر انگلیاں اُٹھنے لگیں۔ اِس پر آر ایس ایس کے ایک سنگ دل جیالے نے گاندھی جی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ یہ وہی آر ایس ایس ہے جو آج بھارت میں بی جے پی کی صورت میں برسرِ اقتدار ہے۔ گاندھی جی تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، مگر پاکستان کو پینتیس کروڑ مل گئے۔ گاندھی جی کے بہیمانہ قتل سے شروع ہی میں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے زمانوں میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہو گی اور ہندو انتہا پسندی بھارت کی سالمیت کے لیے کس قدر خطرناک بن جائے گی۔

ہندو ذہن تقسیمِ ہند کو گاؤ ماتا کے دو ٹکڑے کر دینے کے مترادف سمجھ کر مسلمانوں سے انتقام لینے پر تُلا ہوا تھا، چنانچہ جن سنگھ، ہندو مہا سبھا، آر ایس ایس اور کانگرس نے بھی ہندو، مسلم فسادات کو ہوا دی اور لاکھوں کی تعداد میں آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان آئے۔ پاکستان میں بھی فسادات رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے، کیونکہ اس وقت پولیس کا نظام قائم تھا نہ سول انتظامیہ کا کہیں وجود تھا۔ حکومت کا ڈھانچہ بری طرح متزلزل تھا۔ دفتر خالی پڑے تھے، کیونکہ ہندو اور سکھ ملازمین بھارت چلے گئے تھے۔ لاہور کے والٹن میدان میں لاکھوں خون میں لتھڑے ہوئے مہاجرین تھے جن کو دیکھ کر قائدِ اعظم آبدیدہ ہو گئے تھے۔ انتہائی سوگوار اور خون کے آنسو رُلا دینے والے حالات کے باوجود اُنھوں نے یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں ایک عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ عہدِ حاضر میں پاکستان اسلام کی جدید ترین تجربہ گاہ ہو گا اور یہ ثابت کیا جائے گا کہ اسلام آج بھی اسی طرح نافذ العمل ہے جس طرح صدیوں پہلے تھا۔ اُن تاریک دنوں میں آزادی کی شمع روشن ہوئی، تو پورا منظر ہی بدلتا چلا گیا۔ مقامی لوگوں نے مہاجرین کا کھلے بازوؤں سے استقبال کیا۔ اُنھیں اپنے گھروں میں ٹھہرایا اور اِن میں حصّے دار بنا لیا۔ بھارت سے آنے والے مہاجرین نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا، دفتروں میں بے سروسامانی کے باوجود فرض شناسی اور جاں فروشی سے کام ہونے لگا۔ آنے والے مہاجرین بڑی خوش اسلوبی سے بستے چلے گئے۔ بھارت کی ریشہ دوانیوں کے باوجود پاکستان اپنے بنیادی مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ عوام کے ایثار اور اُن کی اپنے وطن سے محبت اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آئی اور اس نے پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں زریں مواقع فراہم کیے۔ یہ ہماری آزادی کا عکسِ جمال تھا۔

پھر جیسا کہ سپریم کورٹ کے دو رکنی بینچ نے خواجہ برادران کے خلاف پیراگون ہاؤسنگ اسکیم کیس میں آبزرویشن دی ہے کہ ''بونے اور پست قد لوگ چُنے جاتے ہیں، اُن کی پرورش کی جاتی ہے، اُنھیں پروان چڑھایا جاتا ہے، پھر اُنھیں اقتدار میں لایا

جاتا ہے اور پھر بدنما ماضی اور مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے قوم پر مسلط کر دیے جاتے ہیں۔'' حصولِ آزادی کے چند ہی سال بعد قومی سطح کی سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کی شکست و ریخت کا سلسلہ مختلف انداز سے شروع ہوا اور صوبائی خودمختاری کے جائز مطالبات ملک سے غداری کے زمرے میں شامل کیے جانے لگے۔ جب اور عوام اپنے سیاسی، معاشی اور بنیادی حقوق سے محروم کیے جاتے رہے، تو ملکی یک جہتی کے بندٹوٹنے لگے۔ اِس کا بھیانک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب 1970ء میں پہلی بار قومی انتخابات منعقد ہوئے، تو دو علاقائی جماعتیں بے پناہ جذباتی قوت کے ساتھ فتح یاب ہوئیں۔ اُس وقت اقتدار فوج کے ہاتھ میں تھا جس کی قیادت نے عالمِ مدہوشی میں پاکستان کو خانہ جنگی کے شعلوں میں دھکیل دیا اور 16 دسمبر 1971ء کے دن سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔ جب ہم نے آزادی کی صحیح قدر نہ کی اور کھلی ناانصافیوں کا راستہ اختیار کیے رکھا، تو آزادی اپنے پورے جلال کے ساتھ نمودار ہوئی اور ہماری تاریخ کا چہرہ مسخ ہو گیا۔

اِس دردناک سانحے پر تقریباً 49 سال گزرنے والے ہیں اور ہم نے اِس دوران فقط ایک سبق سیکھا ہے کہ آئین کو کسی بھی حال میں منسوخ نہ کیا جائے۔ اِس المیے کے بعد بھی پاکستان میں دو بار فوجی انقلاب آئے، لیکن اُن میں 1973ء کا آئین سالہا سال معطل تو رکھا گیا جو بعد میں آئینی ترامیم کے ذریعے بحال ہوتا رہا جو تمام صوبوں اور علاقوں کے مابین وحدت کا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہے، لیکن بونے آج بھی قوم پر مسلط ہیں جس کے سبب داخلی انتشار اور اعلیٰ قیادت کے فقدان کا چیلنج گمبھیر ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان کے 73 ویں یومِ آزادی پر دل بیٹھا جا رہا ہے، تاہم اِس موقع پر بھی قدرت بہت مہربان دکھائی دیتی ہے اور تین ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں جو ہمارے وطن اور اِس پورے خطے کی تقدیر بدل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک چین-ایران معاہدہ، دوسرا آیا صوفیہ کی مسجد کی 86 سال بعد بحالی، اس کے میناروں سے اذانوں کے بلند ہونے والے زمزمے اور صدر طیب اردگان کی تلاوت کا فسوں اور تیسرا بھارت میں ایک متنازع قانونِ شہریت کا نفاذ جو ایک طرف اس کے اندر ایک زبردست تحریکِ مزاحمت کو پروان چڑھا رہا ہے اور دُوسری طرف بنگلہ دیش کو بھارت سے دور لے جا رہا ہے۔

یہ عہد ساز واقعات اُس وقت رونما ہوئے ہیں جب کورونا وائرس کی وبا نے پوری دنیا کو زیروزبر کر ڈالا ہے۔ امریکا جو اپنے آپ کو واحد سپر طاقت سمجھتا تھا، وہ روز بروز ضعف کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ صدر ٹرمپ نے اس کی ساکھ اور وقار خاک میں ملا دیے ہیں۔ وہ ایشیا پیسیفک میں اپنا تسلط جمانے اور چین کی بڑھتی ہوئی معاشی اور سیاسی طاقت کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے زیادہ تر بھارت پر انحصار کر رہا ہے جسے خود ہمالیہ جیسے داخلی اور خارجی چیلنجز کا سامنا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں ایک سال سے لاک ڈاؤن ہے اور اَسّی لاکھ کشمیری زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ عالمی برادری میں پہلی بار اِس ہولناک صورتِ حال پر گہری تشویش پیدا ہوئی ہے اور اَیک دنیا وزیرِاعظم نریندر مودی کی سفاکیوں سے نفرت کرنے لگی ہے۔ اِس کے علاوہ اس کے 5 راگست 2019ء کے اقدام نے تنازع کشمیر کو ایک نئی تزویراتی اور سفارتی جہت عطا کر دی ہے۔ اس اقدام کے تحت مودی نے لداخ کو جموں و کشمیر سے علیحدہ کر کے اُنھیں غیر آئینی طور پر بھارت کے اندر ضم کر لیا۔ لداخ کے ایک حصے پر چین مدت دراز

سے اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتا آیا ہے اور اس نے 1962ء کی سرحدی جھڑپوں میں اکسائی چن پر قبضہ کرلیا تھا جہاں سے اب سنکیانگ کو تبت سے ملانے والی شاہراہ گزرتی ہے۔ اِس طرح وہ تنازع کشمیر کا فریق بن گیا ہے۔ بھارت کی فوجی قیادت نے امریکی شہ پر اس علاقے میں سڑکوں اور ہوائی اڈوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ فوج کا ایک پورا کور اِس علاقے میں تعینات کر دیا۔ چین نے نئی تعمیرات اور تنصیبات پر اعتراض کیا، تو بھارت اپنی فوج کو حرکت میں لے آیا، لیکن اسے بہت مار پڑی۔ درجنوں فوجی مارے گئے، سینکڑوں قیدی بنے اور خاصی تعداد میں دریا میں ڈوب گئے، چنانچہ بھارتی فوجیوں کو سفید جھنڈے لہرا کر اور بینروں پر معافی کی درخواستیں لکھ کر جنگ بندی کی بھیک مانگنا پڑی۔ اِس عبرت ناک شکست سے بھارت کی فوجی طاقت کا بھرم کھل گیا اور سفارتی برادری میں اس کا وزن کم ہوتا گیا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ ایران جس کے تعلقات بھارت کے ساتھ بڑے مستحکم نظر آتے تھے، اس نے اپنے اہم اور اَسٹریٹیجک منصوبوں سے بھارت کو باہر نکال دیا۔ 2016ء میں ایران اور بھارت کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا کہ چابہار بندرگاہ کی تعمیر اور اسے ریل کے ذریعے زاہدان سے ملانے کے منصوبے میں بھارت سرمایہ کاری کرے گا۔

بھارت نے اِس منصوبے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ حُسنِ اتفاق سے چینی صدر شی چن 2016ء میں سرکاری دورے پر تہران آئے تھے اور اُنھوں نے دوطرفہ تعلقات کو فروغ دینے میں گہری دلچسپی ظاہر کی۔ وادیٔ گلوان میں بھارتی شکست کے بعد ایران نے چین کی طرف سے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی پیشکش قبول کرلی جس کے مطابق چین چار سو اَرب ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا اور ریلوں، سڑکوں اور بندرگاہوں کا ایک جال بچھائے گا، فوجی مشقوں میں حصّہ لے گا اور ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ میں بھرپور حصّے دار ہوگا۔ اِس کے عوض ایران پچیس سال تک رعایتی قیمتوں پر چین کو پٹرول فراہم کرے گا۔ اِس معاہدے کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ایران نے بھارت کو گیس کی ترقی کے منصوبوں سے بھی خارج کر دیا ہے۔ ایران کے ساتھ چین کے روابط مضبوط ہوجانے سے پاکستان کی پوزیشن اِس خطے میں بہت مضبوط ہوتی جائے گی اور اس کی مغربی سرحدیں پہلے سے کہیں زیادہ محفوظ نظر آئیں گی۔ ایک نہایت اہم پیش رفت یہ کہ ایران سے بھارت کے اخراج کے باعث چابہار اَور گوادر اَیک دوسرے کی مددگار ثابت ہوں گی اور یقینی طور پر ایران سی پیک میں شامل ہوجائے گا اور اَفغانستان بھی اِس پیش رفت سے بہت فائدہ اُٹھا سکے گا جو قیامِ امن کے سلسلے میں پاکستان کا ممنونِ احسان ہوگا۔ چین کی پیہم سرگرمیوں سے بحری راستوں پر بھارت کے راج کا خواب بھی چکنا چُور ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر ہمارے وطن کے لیے نئے امکانات کا دروازہ کھول دیا ہے۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف نے یہ خوشخبری بھی سنادی ہے کہ 2024ء میں چین دنیا کی پہلی معیشت کا مقام حاصل کرلے گا۔ اِس طرح جنوب ایشیا اور ایشیا پیسی فِک میں طاقت کا ایک نیا توازن قائم ہوگا جس میں پاکستان ایک اہم حیثیت کا حامل ہو گا اور بھارت کی تنہائی میں اضافہ بڑھتا جائے گا۔

مزید بدقسمتی یہ کہ نریندر مودی نے ہندوتوا کے زیرِ اثر بھارت کے قانونِ شہریت میں ایک ایسی ترمیم کی ہے جس نے بھارت کے

سنجیدہ طبقوں میں ایک بلاخیز ہیجان پیدا کر دیا ہے جن میں مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں کے علاوہ ہندو آبادی بھی شامل ہے۔ اس ترمیم شدہ قانون کے مطابق بھارت میں آباد پانچ ملکوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کو بھارتی شہریت ثابت کر دینا اور اسے رجسٹر کروانا ہو گا۔ اس نئے قانون کا مقصد بھارت کی آبادی سے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو بے دخل کرنا ہے۔ اس تعصب کے خلاف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ اور طالبات مہینوں جلوس نکالتے رہے اور ہندو خواتین پیش پیش رہیں۔ احتجاج کرنے والوں کا نعرہ جناب فیض احمد فیض کی نظم کا ایک مصرع ہے: 'لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے'۔ اس غیر منصفانہ اور جابرانہ قانون سے سب سے زیادہ بنگلہ دیش متاثر ہو رہا ہے جہاں سے لاکھوں کی تعداد میں باشندے آسام اور مغربی بنگال میں نصف صدی سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے مابین تعلقات اس قدر کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں کہ مارچ 2020ء میں نریندر مودی نے شیخ مجیب الرحمٰن کی سالگرہ کے موقع پر ڈھاکا آنے کا اعلان کیا، تو بنگلہ دیش کے عوام و خواص میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور اُسے اپنا دورہ منسوخ کرنا پڑا۔ چین بنگلہ دیش کی ترقی اور خوشحالی میں بڑی دلچسپی لے رہا ہے اور حالات پاکستان اور بنگلہ دیش کو ایک دوسرے کے قریب لا رہے ہیں۔ وزیرِ اعظم پاکستان جناب عمران خاں کا وزیرِ اعظم حسینہ واجد سے ٹیلی فونک رابطہ منجمد تعلقات کو پگھلانے میں پہلا قدم ثابت ہو سکتا ہے۔ ماضی کے زخم اگرچہ بہت گہرے ہیں اور حسینہ واجد نے جس بے رحمی سے پاکستان کا ساتھ دینے والے مجاہدین کو دار پر لٹکایا ہے، اسے آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکے گا، مگر وقت زخموں پر مرہم بھی رکھتا ہے اور نئے امکانات کی پرورش بھی کرتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ریشمی رومال کی تحریک نے مسلم بنگال میں جو گہرے اثرات مرتب کیے تھے اور دسمبر 1906ء میں جس جوش و خروش سے پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی، روح کے وہ پھول دوبارہ تر و تازہ ہوں گے اور دونوں طرف کے رویوں میں تبدیلی آئے گی۔ باہمی رشتوں سے تازگی اور توانائی پیدا ہو سکتی ہے۔ یورپ کے ممالک جو آپس میں صدیوں خون کی ہولی کھیلتے رہے، تاریخی تجربات کے بعد آج باہمی تعاون کی اعلیٰ مثال بنے ہوئے ہیں۔ ماضی کی طرح پاکستان اور بنگلہ دیش کا مستقبل ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔

اِس خوش رنگ فضا میں 24 جولائی 2020ء ایک نئی شان اور اَیک نئی سطوت کے ساتھ طلوع ہوا ہے جس نے اسلام کی عظمت کی راہ کشادہ کر دی ہے۔ سلطان محمد فاتح نے جب پندرہویں صدی میں قسطنطنیہ فتح کیا، تو اس نے عیسائیوں سے استنبول کا عظیم الشان گرجا خریدا اور اس کا ایک ٹرسٹ قائم کر دیا۔ ٹرسٹ میں لکھا کہ یہاں مسجد تعمیر کی جائے گی اور اس کے علاوہ کسی اور عمارت کی گنجائش نہیں ہو گی۔ اِس مسجد میں صدیوں نماز اَدا ہوتی رہی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مصطفیٰ کمال اتاترک جو جدید ترکی کے بانی ہیں، اُنھوں نے 1934ء میں اِس مسجد کو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا اور اَذانوں کا سلسلہ یکسر بند ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ترک صدر جناب طیب اردگان کو 86 سال بعد عجائب گھر کو بند کرنے اور اللہ کا گھر کھولنے کا اعزاز عطا کیا ہے۔ وہ حافظِ قرآن ہیں اور قدرت نے اُنھیں لحنِ داؤدی عطا کیا ہے۔ 24 جولائی کو بلا مبالغہ لاکھوں ترکوں نے نمازِ جمعہ ادا کی۔ فضا اذان اَور اللہ اکبر کے نعروں سے معمور تھی۔ پورا عالمِ اسلام اللہ کے حضور سجدہ ریز تھا اور اُن کے سینوں سے قوتِ ایمانی کے چشمے اُبل رہے تھے۔ آرزوؤں کا ایک نیا جہان جلوہ افروز تھا جس نے اہلِ پاکستان کے یومِ آزادی میں ایک نیا رنگ بھر دیا تھا۔

خصوصی انٹرویو

زاہد عرفان

ہم بھی وہاں موجود تھے

پاکستان قانونی طور پر 15 اگست 1947 کو آزاد ہوا

کرۂ ارض پر پاکستان 18 اگست 1947 کو وجود میں آیا

جسٹس (ر) سید افضل حیدر کا انکشافات سے بھرپور انٹرویو

روایت ہے کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کو پھوڑا نکل آیا، بہت علاج کیے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ کسی نے مہاراجا کو بتایا کہ لاہور میں ایک حکیم گل محمد طبیب حاذق ہیں۔ ان سے علاج کروایا جائے تو شفایابی ہوسکتی ہے۔ مہاراجا کے ہرکارے مطب میں پہنچے اور طبیب کو بتایا کہ رنجیت سنگھ بیمار ہے اور اسے دیکھنا ہے لیکن گل محمد نے انھیں کہا کہ وہ کسی کے گھر جا کر مریض نہیں دیکھتے، اگر مہاراجا نے علاج کروانا ہے تو پھر انھیں مطب پر آنا ہوگا۔ ہرکارے بے نیل ومرام واپس پہنچے تو مہاراجا نے حکیم صاحب کو طلب کرنے کے لیے سرکاری حکم نامہ بھیجا۔ جب مہاراجا کا طلبی کا حکمنامہ وحکیم صاحب کو ملا تو انھوں نے اس کی پشت پر لکھا: زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد (زمین اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے، گل محمد نہیں)

مہاراجا نے حکیم صاحب کا جواب پڑھا تو محظوظ ہوئے اور مطب چلے گئے۔ علاج سے شفایابی ہوئی۔ جس محلے میں حکیم صاحب مقیم تھے، اس کا نام بازار حکیماں پڑ گیا۔ جو آج بھی اندرون لاہور میں موجود ہے۔ مہاراجا نے حکم دیا کہ روزانہ پانچ رُوپے اور پانچ من کڑاہ پرشاد حکیم صاحب کے مطب پر غربا میں تقسیم کے لیے بھجوایا جائے۔

حکیم گل محمد، جسٹس (ر) سید افضل حیدر کے اجداد میں سے تھے۔ سید افضل حیدر 1931ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پاکپتن میں حاصل کی اور 1955 میں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے قانون کی سند حاصل کی اور

پاکپتن سے وکالت کا آغاز کیا۔ 1958 میں لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بارکی سیاست کی اور لاہور ہائی کورٹ بار کے سب سے کم عمر سیکریٹری منتخب ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ پاکستان بار کونسل کے رکن بھی منتخب ہوتے رہے اور اس ادارہ کے وائس چیئرمین اور چیئرمین انتظامی کمیٹی بھی رہے۔ پنجاب

یونیورسٹی لاء کالج اور قائداعظم لاء کالج میں پڑھاتے رہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور پاکستان لا کمیشن کے رکن بنے۔ آئین اور قانون کی کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔

2008ء میں نگران حکومت میں وفاقی وزیر قانون کے عہدے پر فائز ہوئے اور پھر فیڈرل شریعت کورٹ میں جج مقرر ہوئے۔ کئی اُردو اور انگریزی کتب تصنیف کیں جن میں بھٹو ٹرائل، شریعت بل، رحمت اللعالمین نمایاں

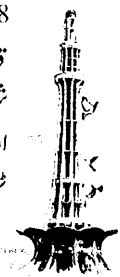

ہیں۔

قانون آزادی ہند مجریہ 1947ء کے تحت پاکستان اور بھارت کے مابین دو صوبوں بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرنے کے لیے سرحدوں کے تعین کے لیے سرحد بندی کمیشن تشکیل دیا گیا، جس کا نام اس کے چیئرمین کی مناسبت سے ریڈکلف کمیشن رکھا گیا۔ کمیشن چیئرمین سمیت پانچ ممبران پر مشتمل تھا۔ دو ممبر جسٹس (ر) دین محمد اور محمد منیر مسلم لیگ نے نامزد کیے اور دو ممبر مسٹر مہر چند مہاجن اور مسٹر تیجا سنگھ کانگریس نے نامزد کیے۔ کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کے مقدمے کی تیاری میں وکلا کی جو ٹیم بنی اس میں جسٹس (ر) سید افضل حیدر کے والد محترم سید محمد شاہ بھی شامل تھے۔ سید افضل حیدر مقدمہ کی تیاری میں بطور معاون شامل رہے۔ یوں وہ اس معاملے کے چشم دید گواہ ہیں۔ قارئینِ اُردو ڈائجسٹ کو تشکیلِ پاکستان کے اس نازک مرحلے سے روشناش کروانے کے لیے ہم نے ان کے انٹرویو کا قصد کیا۔

سترہ جولائی کی سہ پہر ملاقات کا وقت طے ہوا اور میں مقررہ وقت پر گلبرگ لاہور میں ان کی رہائش گاہ پہنچ گیا۔ اس دن لاہور میں مون سون کے بادل خوب برسے اور جل تھل ایک ہو گیا۔ جج صاحب ہمارے منتظر تھے اور ہمارے بروقت پہنچنے پر خوش بھی تھے۔ زندگی بھر پابندیٔ وقت کو شعار بنانے والی شخصیات وقت کی قدر خوب جانتی ہیں۔ استقبالیہ کمرا ان کی وسعت مطالعہ کی غمازی کر رہا تھا۔ الماریوں میں تمام مکتبہ فکر کے علما کرام کی تصانیف اور قرآن پاک کی تفاسیر، قانون کی کتابوں کے ساتھ سجی ہوئیں تھیں۔ زندگی کی نو دہائیاں پوری کر چکے لیکن ان کی یادداشت ابھی بھی حیران کن ہے۔ واقعات پوری جزیات کے ساتھ ان کے ذہن میں موجود تھے۔ اس کے باوجود جہاں پر انھیں ضرورت محسوس ہوئی انھوں نے فوراً ماخذ کتب سے رجوع کیا۔

میں نے بلاتمہید جسٹس صاحب سے سوال کیا کہ وہ ہمیں ان حالات سے آگاہ کریں جو کمیشن کی تشکیل کا سبب بنے؟

جج صاحب نے دھیرے سے بولنا شروع کیا اور بتایا کہ دوسری جنگ عظیم نے انگریزی راج کی چولیں ہلا دیں تھیں اور وہ اپنی نوآبادیوں سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ ادھر ہندوستان میں آزادی کی تحاریک بھی زور پکڑ چکی تھیں۔ مسلم لیگ قرارداد لاہور میں مسلمانوں کے لیے علاحدہ وطن کا مطالبہ کر چکی۔ انڈین نیشنل کانگریس بھی ہندوستان کی پر تقسیم طوعاً کرہاً راضی ہو چکی تھی۔ ان حالات میں برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ اٹیلی نے 20 فروری 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں خطاب کرتے ہوئے 30 جون 1948 تک ہندوستان سے برطانوی راج کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ تقسیم کے عمل کو قانونی حیثیت دینے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ نے بڑی عجلت میں 15 جولائی 1947ء کو ایک قانون Indian Independence Act 1947 منظور کیا جس کے تحت ہندوستان میں برطانوی راج 15 اگست 1947ء کو ختم ہو جائے گا اور ہندوستان کو دو نئے ملکوں بھارت اور پاکستان میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اسی قانون میں یہ طے پایا کہ بنگال اور پنجاب کے صوبے انڈیا اور پاکستان میں تقسیم کیے جائیں گے۔ دونوں ملکوں میں گورنر جنرل کا ادارہ قائم کیا جائے گا جس کا تقرر بطور نمائندہ تاج برطانیہ ہو گا۔ شاہی ریاستوں کے حکمرانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ دونوں ممالک میں سے کسی ایک سے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اس قانون کے دوسرے شیڈول میں سترہ اضلاع کے نام تھے جو مغربی پنجاب میں شامل ہونے تھے اور ان میں گرداس پور کا ضلع بھی شامل تھا۔

یاد رہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کے لیے مکمل چھے صوبے چاہتے تھے۔ جن میں بنگال، آسام، سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب شامل تھے۔ قائداعظمؒ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے حامی نہ تھے۔ مارچ 1947 میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، لارڈ ویول کے بعد ہندوستان کا نیا وائسرائے بن کر آیا اور اس کو جو بنیادی ٹاسک دیا گیا تھا وہ جلد سے جلد ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی تھا۔ اگلے دس دنوں میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو کانگریس کی طرف سے بتا دیا گیا کہ وہ پاکستان کے مطالبے کو مانتے ہیں لیکن اس میں پنجاب کے 13 مشرقی اضلاع شامل نہیں ہوں گے جن میں گورداس پور اور امرتسر شامل تھے۔ قائداعظمؒ کی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ان کا مطالبہ پورے چھے صوبوں کا ہے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر کے پاکستان کو تباہ کر رہا ہے۔ اصل میں گورداس پور کا ضلع مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان وجہ تنازع بن رہا تھا۔

اپریل 1947ء میں اس وقت کے پنجاب کے گورنر مسٹر ایوان جینکن نے وائسرائے کو تجویز پیش کی کہ پنجاب کو مسلمانوں اور غیر مسلم اکثریت کے اضلاع کو مدنظر رکھتے تقسیم کر دیا جائے اور وہ علاقے جو ان اضلاع کی نواحی تحصیلوں پر مشتمل ہوں ان کی تقسیم بھی انھی اصولوں پر کی جائے۔ اس نے مزید یہ تجویز پیش کی کہ اس مقصد کے لیے ایک سرحد بندی کمیشن بنایا جائے جس میں دو مسلمان اور دو غیر مسلم نمائندے شامل ہوں اور ان نمائندوں کی نامزدگی پنجاب قانون ساز اسمبلی کرے اور اس کمیشن کا چیئرمین ہائی کورٹ کا انگریز جج ہو۔

ان حالات میں تین جون کے تقسیم کے منصوبے کا اعلان ہوا۔ جس میں سترہ مغربی اضلاع پاکستان اور بارہ مشرقی اضلاع ہندوستان میں شامل ہونے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حتمی سرحدوں کے تعین کے لیے سرحد بندی کمیشن قائم کرنے کا

اعلان ہوا۔"

گفتگو جاری تھی کہ جج صاحب کا مددگار ایک ٹرالی پر پُرتکلف چائے و دیگر لوازمات لے آیا۔ تازہ بنے ہوئے پکوڑوں نے چائے کا لطف دوبالا کر دیا۔

سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے جج صاحب کہنے لگے:

"جون کے مہینے میں برطانیہ نے سر سائرل ریڈکلف کو سرحد بندی کمیشن کا چیئرمین مقرر کیا اور انھیں سرحدوں کے تعین کے لیے متصل مسلم اور غیر مسلم اکثریتی آبادی کے علاوہ دیگر اُمور (Other factors) کو بھی مدنظر رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ دیگر اُمور کیا تھے؟ کسی کو معلوم نہ تھے اور اس کا ایک مطلب یہ بھی کہ ریڈکلف کو اپنا ایوارڈ جاری کرنے میں آزادی ہو۔"

8 جولائی 1947ء کو ریڈکلف ہندوستان پہنچے اور ان کے پاس 175000 مربع میل علاقے کی سرحدوں کے تعین کے لیے صرف پانچ ہفتے تھے۔ تقریباً نو کروڑ لوگوں کا مستقبل اس سے وابستہ تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پارٹیشن کونسل پر زور دیا کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ سے تحریری یقین دہانی حاصل کرے کہ کمیشن کا جو بھی فیصلہ ہوگا وہ اسے تسلیم کریں گے۔ پنڈت نہرو نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو خط لکھا کہ وہ کسی صورت کشمیر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے اور بہرصورت کشمیر ہندوستان کو ملنا چاہیے۔ ریڈکلف نے اپنی تقرری کے وقت یہ شرط بھی منوا لی تھی کہ کمیشن کا فیصلہ چیئرمین کرے گا۔ ممبران کا اس میں کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔ سرحد بندی کمیشن کے فیصلے کے خلاف کسی فورم پر کوئی اپیل یا نظرثانی کی گنجائش نہ تھی۔"

میں نے یہاں پر سوال اُٹھایا کہ اگر اتنی کڑی شرائط تھیں تو پھر قائداعظمؒ نے ایسا کمیشن قبول کیوں کیا؟

جج صاحب مسکرائے اور بولے: "بات یہ ہے کہ کانگریس اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن تو یہی چاہتے تھے کہ جناح

ریڈکلف

صاحب اسے قبول نہ کریں اور انھیں بہانہ مل جائے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے پاس اسے قبول کرنے کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔"

"اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ پنجاب رقبے کے حساب سے بہت بڑی مسلم اکثریت کا صوبہ تھا۔ پنجاب میں مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کرنے کے لیے انگریزوں نے 1901ء میں اسے تقسیم کیا اور صوبہ سرحد میں پنجاب کا کافی علاقہ شامل کر دیا۔ 1911ء میں انگریز حکومت نے اپنا دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کیا تب بھی پنجاب کو اپنے بہت سارے رقبے سے محروم ہونا پڑا۔ اسی طرح دوسری

گول میز کانفرس کے ناکام ہونے کے بعد انگلستان کے وزیراعظم نے 1931ء میں Communal Award جاری کیا جس کے تحت مسلمانوں اور ہندوستان میں بسنے والی دیگر اقلیتوں کے لیے جداگانہ انتخابات کے لیے نشستیں مختص کی گئیں۔ اس موقع پر بھی بنگال اور پنجاب میں مسلمان آبادی کو کم کیا گیا۔ پھر 1941ء کی مردم شماری میں ریکارڈ میں ردّوبدل کر کے مسلمانوں کی آبادی کو کم کیا گیا۔ 1931ء کی مردم شماری کے دوران میرے والد محترم سید محمد شاہ نے پاک پتن اور اس سے ملحقہ علاقوں میں گھوم کر مسلمان گھرانوں کی مردم شماری میں اندراج کو یقینی بنایا۔ ان خدمات کے اعتراف میں اس وقت کی پنجاب حکومت نے انھیں تعریفی سند بھی جاری کی تھی۔ جب کمیشن کے رُوبرو کارروائی جاری تھی تو میرے والد صاحب کو 1931ء کی مردم شماری کے تجربے کی بنیاد پر شک ہوا کہ 1941ء کی مردم شماری میں بھی مسلمانوں کی آبادی کو کم نہ کیا گیا ہو۔ انھوں نے اس بات کا تذکرہ چودھری ظفراللہ سے کیا جو اس وقت مسلم لیگ کی طرف کمیشن کے سامنے پیش ہو رہے تھے۔ چودھری ظفراللہ کے شور مچانے پر ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے ریکارڈ کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ کمیشن کو پیش کی۔ کمیٹی نے ضلع گورداس پور کے مختلف علاقوں میں کی گئی مردم شماری کے ریکارڈ کو دیکھا تو کچھ جگہوں پر اندراج میں ردّوبدل پایا۔ مثلاً ایک گاؤں میں صرف 2 ہندوؤں تھے جنہیں 220 لکھا گیا اور اسی گاؤں میں مسلمانوں کی تعداد 53 تھی جسے بدل کر 35 کر دیا گیا۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں ریکارڈ کے اندر کی گئی جعلسازی کو کمیشن کے رُوبرو پیش کیا اور اسے کمیشن کی دستاویزات کا حصہ بنا دیا گیا۔

اسی طرح چودھری ظفراللہ کی ہدایت پر میں نے اور کچھ دیگر نوجوان طالب علموں نے 1881ء سے لے کر 1941ء کی مردم شماریوں کی دستاویزات کا مطالعہ کیا اور مشرقی پنجاب کی تحصیلوں میں ہندو مسلم آبادی کے چارٹ تیار کیے۔ ریکارڈ کی چھان بین کے دوران ہم پر انکشاف ہوا کہ وہ علاقے جن پر ہندو اپنا حق جتلاتے تھے، وہاں پر وہ ہمیشہ اقلیت میں رہے۔ مثال کے طور پر فاضلکا

چودھری سر محمد ظفراللہ خاں

کے موضع میں ہندوؤں کی آبادی 6.60 فیصد، مخضر میں 11.44 فیصد، لدھیانہ میں 19 فیصد اور ہشیارپور میں 16 فیصد تھی۔ یہ چارٹ 29 جولائی کو کمیشن کے سامنے پیش ہوئے اور انھیں کارروائی کا حصہ بنا لیا گیا۔''

تازہ پکوڑوں کی مہک نے ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کروائی اور سلسلۂ کلام کچھ دیر کے لیے رک گیا۔ میرا اگلا سوال جج صاحب سے یہ تھا کہ قانون آزادئ ہند 1947ء

میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لیے بنیادی یونٹ ضلع کو رکھا گیا یا تحصیل کو؟

''جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا کہ قائداعظمؒ کا مطالبہ چھے مکمل صوبوں پر مشتمل پاکستان تھا۔ اصل میں قائداعظمؒ کے سامنے برطانوی پارلیمنٹ کے رکن John Bright کی وہ تقریر تھی جو اس نے پارلیمان میں جون 1958 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1858 پر بحث کرتے ہوئے کی۔ اس نے برطانوی حکومت کو تجویز پیش کی کہ وہ ہندوستان میں پانچ پریذیڈنسیاں قائم کریں جن میں سے دو، لاہور اور کلکتہ مسلمانوں کے لیے اور تین، بمبئی، مدراس اور آگرہ ہندوؤں کے لیے ہوں اور پھر برطانوی حکومت جب ہندوستان چھوڑے تو وہاں پر پانچ مہذب ملک ہوں جن کے آپس میں بہترین تعلقات ہوں۔

ضلع کو بنیادی یونٹ مان کر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تقسیم کرنے کا فارمولا سب سے پہلے محمڈن نیشنل کانگریس نے جنوری 1889ء میں دیا تھا۔ یہ تنظیم عبدالحلیم شرر، محرم علی چشتی اور سید امیر علی نے قائم کی تھی۔ محرم علی چشتی ہی نے دوقومی نظریہ پیش کیا تھا۔ اس تنظیم کے صدر سید امیر علی مقرر ہوئے اور پورے ہندوستان میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی علیحدہ جماعت کا تصور دیا۔ مسلم لیگ کا قیام تو بہت بعد کی بات ہے۔

اسی طرح علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبۂ الہ آباد میں جس مسلمان مملکت کا تصور پیش کیا اس میں بھی ہندو اکثریت کے علاقوں کو متصل مسلم اکثریتی علاقوں سے علیحدہ کرنے کی تجویز تھی اور پھر اسی اصول کو قرارداد لاہور میں اختیار کیا گیا۔

برطانوی حکومت نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لیے ضلعوں کو بنیاد بنایا تھا۔''

جج صاحب تاریخ کے حوالے سے علم کا دریا بہائے چلے جا رہے تھے کہ میں نے ان سے پوچھا کہ کمیشن کے سامنے پیش ہونے کے لیے مسلم لیگ کے وکلاء کی ٹیم کی تشکیل کیسے ہوئی؟

وہ بتانے لگے: ''یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ قائداعظمؒ کی نظر ہندوستان کے چوٹی کے وکلاء پر تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کانگریس کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک قابل وکیل موجود ہے جو کانگریس کی طرف سے کمیشن کے سامنے پیش ہوگا۔ قائداعظمؒ کی نظرِ انتخاب فیڈرل کورٹ انڈیا کے سب سے سینئر جج چودھری ظفراللہ خاں پر پڑی۔ قائداعظمؒ نے انھیں کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے کو کہا۔ انھوں نے قائداعظمؒ کی ہدایت کے مطابق فیڈرل کورٹ سے استعفا دیا اور لاہور میں نواب افتخار حسین ممدوٹ سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ نواب صاحب اس وقت پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ چودھری ظفراللہ خاں نے دہلی سے لاہور روانہ ہوتے وقت سید مراتب علی کو ٹیلی فون کیا کہ وہ پاک پتن سے سید محمد شاہ کو بلوا لیں۔ مراتب علی شاہ نے نواب افتخار حسین ممدوٹ کو بتایا کہ چودھری ظفراللہ خاں لاہور آ رہے ہیں اور انھوں نے سید محمد شاہ کو پاکپتن سے بلوانے کو کہا ہے۔ نواب صاحب نے رانا عبدالحمید کو جو اس وقت پاکپتن سے ایم ایل اے تھے، گاڑی دی اور کہا کہ سید محمد شاہ کو لاہور لے آئیں۔ اس طرح میرے والد صاحب نے گاڑی میں ضروری سامان اور کاغذات جو انھوں نے اپنی وکالت کی پریکٹس کے دوران اکٹھے کیے تھے، ساتھ لے کر لاہور روانہ ہو گئے۔ کچھ کاغذات کے بارے مجھے ہدایت کی کہ میں ریل گاڑی کے ذریعے لاہور لے آؤں۔

لاہور میں ڈیوس روڈ پر ایک گلی میں دو بنگلے تھے۔ ان میں ایک نواب افتخار حسین ممدوٹ کا تھا جس کا نام ممدوٹ وِلا

تھا اور دوسرا سید مراتب علی کا جس کا نام نشیمن تھا۔ قائداعظمؒ جب بھی لاہور تشریف لاتے، تو ان کا قیام ممدوٹ ولا میں ہی ہوتا۔ وکلا کی ٹیم نے ممدوٹ ولا میں ڈیرے جمالیے۔ سید مراتب علی شاہ روزانہ پچاس آدمیوں کا تین وقت کا کھانا نشیمن سے بھجواتے تھے۔

سید محمد شاہ

چودھری ظفر اللہ خاں لاہور پہنچے تو انھوں نے نواب افتخار حسین ممدوٹ سے کہا کہ وہ لاہور میں موجود مسلم لیگی زعما اور وکلاء کو اگلی صبح ناشتے پر بلائیں تاکہ ان کے ساتھ مل کر مقدمے کے حوالے سے لائحہ عمل ترتیب دیا جاسکے۔ ظفر اللہ خاں نے نواب صاحب سے کہا کہ انھیں کمیشن سے کوئی اچھی اُمید نہیں لیکن پھر بھی ہم اپنا کیس پوری مستعدی سے تیار کریں گے۔

اگلی صبح ممدوٹ ولا میں، میں نے اس وقت کی مسلمان قیادت کو ایک چھت تلے اکٹھے دیکھا۔ ان میں میاں ممتاز دولتانہ، خلیفہ شجاع الدین، محمود علی قصوری، ڈاکٹر تصدق حسین نمایاں تھے۔ چودھری ظفر اللہ کہنے لگے کہ مجھے مقدمے کی فائل دے دیں تاکہ اس پر بات چیت ہو سکے۔ سارے مسلم لیگی زعما ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے پھر خلیفہ شجاع الدین بولے: جناب کون سی فائل؟ ہم تو آپ کو ویسے ہی ملنے آئے ہیں۔ مقدمے کے حوالے سے ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں۔ چودھری ظفر اللہ خاں نے کہا کہ آپ لوگ میری راہنمائی کریں کہ میں کمیشن کے سامنے تقسیم پنجاب کے حوالے سے کون سا پوائنٹ رکھوں۔ آیا ہمیں ضلعوں کی تقسیم پر بات کرنی ہے یا تحصیلوں پر یا پھر موضع یا گاؤں کو بنیادی یونٹ ماننا ہوگا؟ لیکن مسلم لیگی راہ نماؤں کی خاموشی اس بات کی غماز تھی کہ ان کا ذہن سلیٹ کی طرح صاف تھا۔ جو کچھ بھی کرنا تھا وہ انھی کو کرنا تھا۔ اس کام کے لیے وقت بہت کم تھا۔

چودھری ظفر اللہ خاں نے نواب افتخار حسین ممدوٹ سے کہا کہ انھیں مقدمے کی تیاری کے لیے دو ٹائپسٹ اور زُود نویس (اسٹینوگرافر) درکار ہیں۔ وہ انھیں مہیا کر دیے جائیں تاکہ بلا تاخیر تیاری شروع ہو سکے۔ زُودنویس کا لفظ سب کے لیے نیا تھا اور کسی کو اس کے معنی نہیں معلوم تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ اسٹینوگرافر کو اُردو میں زُودنویس کہتے ہیں۔ سید محمد شاہ نے چودھری ظفر اللہ سے کہا کہ کام بہت زیادہ ہے۔ ہمیں کچھ ایسے افراد چاہئیں جو ہمارے ساتھ مل کر کام کر سکیں اور قانونی نکات بھی سمجھتے ہوں۔ والد صاحب نے قانونی ٹیم کے لیے ساہیوال سے شیخ نثار (سابق نگران وزیر اعلیٰ پنجاب اور سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ جسٹس اعجاز نثار کے والد)، صاحبزادہ نوازش علی اور ہشیار پور سے علی اکبر کے نام تجویز

کیے۔ ان سب کو فوری طور پر بلا لیا گیا۔
مقدمے کے لیے کاغذات کی چھان بین شروع ہو گئی لیکن مسلم لیگ کی طرف سے ٹائپسٹ اور رُودنویس مہیا نہ ہو سکے۔ میں ٹیم کے ساتھ بطور مددگار کام کر رہا تھا اور آنے جانے والے مہمانوں کی دیکھ بھال بھی میرے ذمہ تھی۔ اگلے دن ایک تانگہ ممدوٹ وِلا کے باہر آ کر رُکا جس پر انگریزی سوٹ اور پگڑی پہنے ہوئے ایک صاحب آئے اور انھوں نے کہا کہ وہ چودھری ظفر اللہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے بتایا: خواجہ عبدالرحیم (سابق گورنر پنجاب خواجہ طارق رحیم کے والد)۔

''میں'' نے چودھری ظفر اللہ خاں کو بتایا کہ کوئی خواجہ عبدالرحیم ان سے ملنے آئے ہیں۔ چودھری صاحب نے انھیں فوراً اندر بلانے کے لیے کہا۔ خواجہ عبدالرحیم اس وقت کمشنر کے عہدے پر فائز تھے۔ انگریز حکومت نے ہندوستانی سول سروس کے دو انتہائی سینئر افسر مقدمے کی تیاری میں معاونت کے لیے مسلم لیگ اور کانگریس کو مہیا کیے تھے۔

خواجہ صاحب اپنے ساتھ بوریوں میں کاغذات بھر کر لائے تھے۔ یہ کاغذات انھوں نے مختلف جگہوں پر بطور اسسٹنٹ کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور کمشنر تعینا تیوں کے دوران اکٹھے کیے تھے۔ وہ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کی جائیدادوں اور محصولات کے کاغذات کی نقول اکٹھی کرتے رہے تاکہ جب کبھی ضرورت پیش آئے تو یہ کام آ سکیں۔ خواجہ صاحب کی زیرک نگاہیں یہ اندازہ کر چکی تھیں کہ ایک دن تقسیم کا مرحلہ درپیش ہو گا۔ 1930ء کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں خواجہ صاحب بطور ٹرینی آفیسر انگلستان میں مقیم تھے جہاں پر ان کی دوستی چودھری رحمت علی سے ہو گئی تھی جنہوں نے Now or Never کے نام سے رسالہ جاری کیا تھا اور لفظ پاکستان تخلیق کیا۔

چودھری ظفر اللہ کے کہنے پر خواجہ صاحب نے اپنے دفتر سے ٹائپسٹ اور اسٹینوگرافر مہیا کر دیے اور یوں مقدمے کی تیاری زور و شور سے شروع ہو گئی۔

کیس کی تیاری کے دوران بہت سے سوالات پیدا ہوئے۔ مثلاً پنجاب میں مسلمانوں کے اوقاف کتنے ہیں؟ تاریخی عمارات کون کون سی ہیں؟ مسلمانوں نے سکھوں کے گردواروں کے لیے جو جائیدادیں وقف کیں، ان کے متعلق معلومات کیا ہیں؟ (ننکانہ صاحب میں گرو نانک کے گردوارے کے لیے ایک مسلمان زمیندار رائے بُلر بھٹی نے 18500 ایکڑ زمین وقف کی تھی) اس طرح کے اور بہت سے سوالات تھے جن کے جوابات کے لیے تاریخی کتابوں کی ضرورت تھی۔ چودھری ظفر اللہ خاں نے ہمارے ذمہ یہ کام لگایا کہ لاہور کی لائبریریوں سے متعلقہ کتابیں لے کر آئیں۔ ہمارے دو وکلا نے سارا دن پنجاب پبلک لائبریری، دیال سنگھ لائبریری، اسلامیہ کالج لائبریری اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری چھان ماری مگر کوئی کتاب نہ ملی۔ سب کتابیں ہندو یا سکھ دو تین دن پہلے اجراء کروا چکے تھے۔ اس موقع پر چودھری ظفر اللہ خاں نے اپنے ذرائع استعمال کیے اور اگلے دو تین دن میں لندن سے یہ کتابیں صندوقوں میں بھر کر لاہور پہنچا دی گئیں۔

کمیشن نے تمام فریقوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے عرضی دعووں کی پچاس پچاس نقول 18 جولائی کو جمع کروا دیں۔ جب دن رات کی محنت کے بعد مقدمے کی فائل تیار ہو گئی تو پنجاب مسلم لیگ سے کہا گیا کہ اس کی پچاس نقول چھپوا کر دیں تاکہ کیس جمع کروایا جا سکے لیکن وہاں سے کورا جواب آیا کہ ان کے پاس تو کوئی فنڈ ہی نہیں۔ چودھری ظفر اللہ نے شیخ نثار اور صاحبزادہ نوازش علی کو فیروز سنز والوں کے پاس بھیجا

اور انھوں بلا معاوضہ پچاس نقول چھاپ کر ہمارے حوالے کر دیں۔ چودھری ظفر اللہ خاں اور ان کے ساتھ کام کرنے والی قانونی ٹیم کے تمام ارکان نے قومی خدمت سمجھ کر بلا معاوضہ کام کیا تھا اور مسلم لیگ سے کسی قسم کی کوئی فیس نہ لی تھی۔''

گفتگو خاصی دلچسپ مرحلے میں داخل ہو گئی تھی اور ہمارے سامنے تشکیل پاکستان کے اس نازک مرحلے کی تاریخ اپنے اوراق پلٹ رہی تھی۔ میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ آزادیٔ ہند کے قانون کے مطابق جب پنجاب کی تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی تب پنجاب کی مسلم لیگی قیادت نے اس حوالے سے کوئی تیاری کیوں نہ کی؟ میرے سوال پر جج صاحب کہنے لگے: ''مسلم لیگ کے ہوم ورک کا آپ کو کیا بتائیں۔ ایک واقعہ سنیں۔ میں ایف سی کالج کے ہاسٹل میں رہتا تھا اور اس وقت ہم کل سات مسلمان طلبا تھے۔ باقی سو سے زیادہ ہندو اور سکھ تھے۔ ہمیں رات کو خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں وہ ہمیں نقصان نہ پہنچا دیں۔ ہاسٹل میں اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم کھانے والے چھری کانٹے بطور ہتھیار اپنے پاس رکھ کر سوتے تھے۔ میں چونکہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا عہدیدار تھا۔ اس لیے میں نے لاہور میں مسلم لیگی قیادت سے اپنے خوف کا اظہار کیا تو انھوں نے چاقو لے کر دینے کے لیے ہم سے پانچ پانچ روپے لیے اور وہ چاقو ہمیں آج تک نہیں ملے۔

اصل بات یہ تھی پنجاب مسلم لیگ کی قیادت اس وقت بہت مایوس ہو چکی تھی۔ خضر حیات وزارت کی برطرفی کے بعد اکثریت میں ہونے کے باوجود انھیں حکومت بنانے کی اجازت نہ ملی اور پنجاب میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ صوبائی قیادت سیاسی معاملات میں بہت مصروف تھی۔ البتہ لاہور میں رہنے والے ہندو اور سکھ حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے نوجوانوں کو لٹھ بازی اور تلوار بازی کی تربیت دینا شروع کر دی تھی۔''

میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا سرحد بندی کمیشن کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز کس تاریخ کو ہوا اور کیا ریڈ کلف مقدمے کی کارروائی کے دوران لاہور میں ہی مقیم رہا؟

جج صاحب بتانے لگے: ''ریڈ کلف نے مقدمے کی کارروائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ کمیشن کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز 5 جولائی کو پنجاب اسمبلی کی عمارت میں ہوا۔ پہلی میٹنگ میں کوئی وکیل پیش نہ ہوا بلکہ مختلف محکموں کے افسران کو بلایا گیا تھا اور کارروائی کے حوالے سے جن دستاویزات کی ضرورت تھی اور جو اُمور طے ہونے تھے، ان پر بات چیت ہوتی رہی۔ ریڈ کلف نے 14 اور 15 جولائی کے دو دن لاہور میں گزارے تھے پھر وہ بنگال روانہ ہو گیا۔ کمیشن کی سربراہی جسٹس دین محمد نے کی، کیونکہ وہ سب سے سینئر رکن تھے۔

جب سر ریڈ کلف لاہور میں تھے تو انھوں نے جسٹس دین محمد سے کہا کہ وہ تقسیم ہونے والے علاقوں کا فضائی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ دین محمد نے کہا کہ ابھی تو کوئی کارروائی نہیں ہوئی، آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟ ریڈ کلف کہنے لگا کہ آپ بھی ساتھ چلیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دہلی سے اپنا جہاز بھجوا دیا تھا۔ والٹن ایئرپورٹ پر جہاز کے ٹیک آف کرنے سے قبل شدید آندھی آ گئی اور پائلٹ نے جہاز اُڑانے سے انکار کر دیا۔ اس دوران دین محمد، ریڈ کلف اور کانگریسی رکن ایئرپورٹ پر موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ دین محمد کونے میں کھڑے پائلٹ کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ کون سے علاقوں پر پرواز کرنی ہے۔ پائلٹ کے پاس ایک نقشہ تھا جس پر ایک لائن کھینچی ہوئی تھی۔ اس نے وہ نقشہ دکھا کر کہا مجھے حکم ملا ہے کہ اس لائن کا فضائی معائنہ کرواؤں۔ نقشہ دیکھ کر دین محمد کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ وہاں سے ممدوٹ ولا پہنچے اور چودھری ظفر اللہ سے ملے اور کہنے لگے

چودھری صاحب مجھے تو کمیشن ایک ڈراما دکھائی دیتا ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن فیصلہ کر چکا کہ اس نے تقسیم کیسے کرنی ہے۔ چودھری ظفر اللہ خاں نے کہا کہ میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ محض ایک ڈھونگ ہے۔ بہرحال آپ فوراً دہلی جا کر قائداعظمؒ سے ملیں اور انھیں اس حوالے سے آگاہ کریں۔ اصل میں دین محمد اب کمیشن کا حصہ نہیں رہنا چاہتے تھے۔

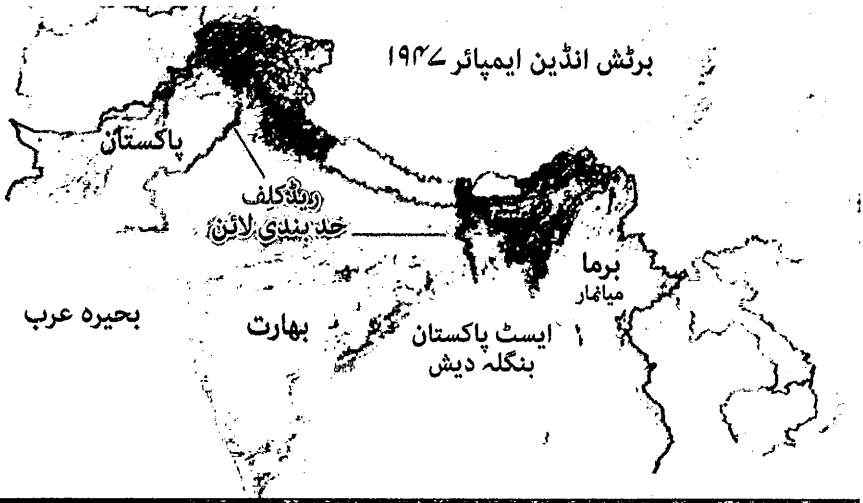

قائداعظمؒ نے تمام واقعہ سنا اور دین محمد سے کہا کہ وہ استعفا نہ دیں اور کمیشن کا حصہ رہیں کیونکہ ہم کمیشن کے ایوارڈ کو ماننے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ قائداعظمؒ نے چودھری محمد علی کو ماؤنٹ بیٹن کے پاس بھیجا کہ وہ اسے قائداعظمؒ کا پیغام دیں کہ وہ اچھا نہیں کر رہے ہے۔

بعد میں ہمیں پتا چلا کہ جب چودھری محمد علی، وائسرائے لاج، دہلی پہنچے تو وائسرائے کے سیکریٹری نے انھیں اپنے کمرے میں بٹھایا اور خود وائسرائے کو اطلاع دینے چلا گیا۔ اسی اثنا میں محمد علی نے دیکھا کہ کمرے کی دیوار پر ہندوستان کا نقشہ آویزاں ہے اور اس پر پنجاب کے صوبے پر اسی طرح کی لکیر کھنچی ہوئی تھی جیسی جسٹس دین محمد نے پائلٹ کے پاس نقشے پر دیکھی تھی۔ جب انھوں نے سیکریٹری سے اس لکیر کے بارے استفسار کیا تو وہ صاف مکر گیا اور اس نے کہا کہ شاید کسی نے شرارت سے ایسا کر دیا ہو۔ ہمیں اس بابت کوئی معلومات نہیں۔“

بارڈر لائن پاکستان انڈیا

18 جولائی کو جب آپ نے عرضی دعوے کی پچاس نقول کمیشن کے روبرو پیش کر دیں تو اس کے بعد کیا کارروائی ہوئی؟ میرا اگلا سوال تھا۔

”18 جولائی کو مسلم لیگ، کانگریس، سکھوں، ریاستوں کے نمائندوں اور دیگر متعلق اداروں نے اپنے اپنے عرضی دعوے کمیشن کو جمع کروا دیے۔ اس دن یہ فیصلہ ہوا کہ کمیشن کی

باقی کارروائی لاہور ہائی کورٹ میں ہوگی۔ اوقات کار کا تعین کیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی ہوا کمیشن کی کارروائی 21 جولائی سے 31 جولائی تک روزانہ ہوگی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کو اپنا اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے ساڑھے چار چار دن دیے گئے اور بقیہ لوگوں کے لیے ایک دن کی کارروائی مختص کی گئی۔ عدالت میں داخلے کے لیے 20 ٹکٹ مسلمانوں اور 20 ٹکٹ غیر مسلموں کے رکھے گئے۔ اس کے علاوہ پریس کے نمائندوں کے لیے بھی سیٹیں مخصوص کی گئیں۔ اس بات کا بھی فیصلہ کیا گیا کہ مقدمے کی کارروائی کا آغاز کون کرے گا۔

کانگریس کے وکیل مسٹر سیتل واد جو بعد میں بھارت کے اٹارنی جنرل بنے، نے خواہش ظاہر کی کہ وہ مقدمے کا آغاز کرنا چاہیں گے۔ جسٹس دین محمد نے چودھری ظفر اللہ کی طرف دیکھا تو انھوں نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ سب اس بات پر خوش ہوئے کہ مقدمے کا آغاز خوشگوار طریقے سے ہو رہا ہے۔

اس طرح پہلے کانگریس نے اپنا مقدمہ بڑے زوردار طریقے سے پیش کیا۔ اس کے بعد مسلم لیگ کی طرف سے چودھری ظفر اللہ خاں پیش ہوئے۔ آخری دن سکھوں کے وکیل نے اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے کمیشن سے کہا کہ ہم پنجاب کی دھرتی کے اصل وارث ہیں۔ انگریزوں نے ہم سے حکومت چھینی تھی لہٰذا ہمیں ہی واپس کرے۔ پنجاب کی آبادکاری میں ہمارا بہت دخل ہے اور غیر مسلم اکابرین نے لاہور کو ملک بھر میں اہم مقام دلانے کے لیے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ ہم خزانے میں مسلمانوں سے زیادہ محصولات جمع کرواتے ہیں۔ ہمارے مقدس مقامات یہاں پر ہیں۔ سکھوں کی خواہش تھی کہ گرداس پور، شیخوپورہ، لائلپور (فیصل آباد) اور ساہیوال کو مشرقی پنجاب کا حصہ بنایا جائے۔ ان کے وکیل ہرنام سنگھ نے کہا کہ پنجاب کے اصل مالک سکھ ہیں۔ مسلمان تو کمی کمین ہیں اور انگریزوں کو ہمارے ساتھ بات چیت کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ سکھوں کی برطانوی فوج میں ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

اس کے بعد مسیحی برادری کے وکیل مسٹر ایس پی سنگھا کمیشن کے روبرو پیش ہوئے اور کہنے لگے کہ اس نے ہرنام سنگھ کی باتیں سنی ہیں اور اس کا سر شرم سے جھک گیا۔ سکھوں اور ہندوؤں کے نزدیک دولت ہی سب کچھ ہے۔ سکھ نمائندے نے اپنے گورونانک کی تعلیمات کا پاس نہیں رکھا جو انسانی شرف کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ہم عیسائی ہندوستان کی کل آبادی کا چار فیصد ہیں اور مسلمانوں کی آبادی گرداس پور ضلع میں 52 فیصد ہے۔ میں کمیشن سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ہماری آبادی بھی مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال دیں اور گرداس پور مسلمانوں کو دیا جائے کیونکہ ہمارا پیغمبر بھی خدا کا بھیجا ہوا ہے اور مسلمانوں کا پیغمبر بھی۔ ہمیں مسلمانوں کے ساتھ رہنا قبول ہے۔

عیسائی نمائندے کے دلائل نے ہمارے دل جیت لیے۔ اس دن سے میرے دل میں اپنے مسیحی بھائیوں کی بہت قدر ہے کیونکہ جب میرے نبی ﷺ کے اصحاب پر کٹڑا وقت پڑا تو ایک عیسائی نے ہی انھیں پناہ دی اور جب مسلمانان ہند پر مشکل آئی تو ہمارے یہ بھائی کندھے سے کندھا ملا کر ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔

ریڈکلف دوران سماعت دہلی میں رہا اور روزانہ کی کارروائی کی نقول تیار ہوتیں اور ایک ایک نقل فریقین کو مہیا کر دی جاتی اور ایک نقل اسپیشل جہاز کے ذریعے ریڈکلف کو دہلی بھجوا دی جاتی۔''

جب کمیشن نے اپنی سماعت مکمل کر لی اس کے بعد کے حالات و واقعات کیا تھے؟ میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا کمیشن نے انصاف کا ترازو تول میں پورا رکھا یا نہیں؟

''اکتیس جولائی کی شام، میرے والد سید محمد شاہ نے صاحبزادہ نوازش علی اور شیخ نثار سے کہا کہ وہ شملہ چلے جائیں کیونکہ کمیشن کے ارکان وہاں جا رہے تھے اور انھیں اگر کسی مدد کی ضرورت ہو تو وہاں پر موجود ہوں۔ والد صاحب خود پاکپتن واپس آ گئے کیونکہ وہاں پر مہاجرین کی آمد شروع ہو چکی تھی اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔

کمیشن کی تمام کارروائی اور دستاویزات چیئرمین کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ ہم سے جو ہو سکتا تھا، وہ ہم نے کیا لیکن سرحد بندی کیسے ہو گی سب اس کے انتظار میں تھے۔ اگرچہ ہمیں اس کمیشن سے کوئی اچھی توقعات وابستہ نہ تھیں۔ پنڈت نہرو گرداس پور ضلع کو ہر صورت بھارت میں شامل دیکھنا چاہتا تھا تاکہ کشمیر تک بھارت کی براہ راست رسائی ممکن ہو سکے۔ اسی طرح سے مادھو پور ہیڈ ورکس پر بھی اس کی نظر تھی۔ اس کے علاوہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا رجحان شروع دن سے کانگریس کی طرف تھا۔

ریڈ کلف دستخط کرنے کے بعد ایوارڈ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے حوالے کر کے برطانیہ چلا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایوارڈ کی اطلاع 17 راگست کو دی اور اگلے دن ریڈیو کی خبروں میں اعلان ہوا۔ چھے سے اٹھارہ اگست تک ایوارڈ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پاس رہا اور بعد میں جو کتابیں چھپیں ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے یہ ایوارڈ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کو دکھایا اور ان کے کہنے پر اس میں ردّوبدل کیا۔ تین تحصیلیں فیروز پور، زیرہ اور فاضلکا پاکستان میں شامل تھیں اور ان کو جسٹس محمد منیر اور جسٹس دین محمد نے اپنے حتمی ایوارڈ کا حصہ بنایا تھا لیکن بعد میں انھیں بھارت میں شامل کر دیا گیا۔''

یہاں پر میں نے سوال کیا کہ ایک قانون دان کی حیثیت سے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ریڈ کلف نے کن مسلمہ قانونی اصولوں کی خلاف ورزی کی؟

''سب سے بڑی زیادتی تو یہ ہوئی کہ کمیشن کی کارروائی کے دوران ریڈ کلف موجود ہی نہ تھا۔ دوسری بات کہ اسے اپنا فیصلہ تمام فریقین کی موجودگی میں عدالت میں سنانا چاہیے تھا۔ تیسرا نکتہ یہ کہ برطانوی قانون کی روایات کے مطابق جب ایک جج کسی فریق کا مؤقف نہیں مانتا تو وہ اپنے فیصلے میں اس کی وجوہ بیان کرتا ہے جبکہ اس نے ایوارڈ میں ایسی کوئی وجوہ بیان نہیں کیں۔ اس کے علاوہ ریڈ کلف نے برطانیہ واپس جانے سے قبل اپنے تمام کاغذات ضائع کر دیے جو ایوارڈ کی کارروائی کے متعلق تھے۔ ایوارڈ میں کوئی غیر مسلم اکثریتی علاقہ پاکستان میں شامل نہیں کیا گیا لیکن مسلم اکثریتی علاقے بھارت کا حصہ بنا دیے گئے۔ قائداعظمؒ نے اس ایوارڈ کو ناانصافی پر مبنی سیاسی ایوارڈ قرار دیا۔

یہاں میں ایک اہم عدالتی روایت کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ہر جج کو ایک مجلد ڈائری ملتی تھی جس میں جج کارروائی کے دوران اٹھائے گئے نکات لکھ لیتا تھا۔ جب یہ ڈائری بھر جاتی تو عدالت کی لائبریری میں محفوظ کر دی جاتی۔ ریڈ کلف نے اس تاریخی روایت سے بھی انحراف کیا۔

ریڈ کلف کو جو ہدایات دی گئی تھیں ان میں Other factors کے الفاظ کو اس نے بھرپور طریقے سے بھارت کے حق میں استعمال کیا اور پاکستان کو نقصان پہنچایا۔

حالات و واقعات سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ کمیشن کٹھ پتلی تھا۔ پنجاب، جس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 57 فیصد تھا، پاکستان کے حصے میں پنجاب کے 29 میں سے صرف 16 اضلاع آئے۔ اس وقت کانگریس نے سکھوں کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔

پاکستان قانونی طور پر 15 راگست 1947ء کو معرض وجود میں آیا اور اصل یوم آزادی 18 راگست بنتی ہے جس دن

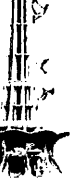

ایوارڈ کے اعلان کے ساتھ بھارت اور پاکستان کی سرحد بندی ہوئی۔"

میں نے بے ساختہ پوچھا: "پندرہ یا چودہ اگست آزادی کا دن ہے؟"

کہنے لگے: "آپ جس دن مرضی یوم آزادی منائیں، یہ آپ کا حق ہے لیکن تاریخی ریکارڈ کی درستی ضروری ہے۔ درحقیقت پاکستان اور بھارت ایک ہی دن یعنی پندرہ اگست 1947ء کو معرض وجود میں آئے۔ میرے پاس تمام تاریخی اور قانونی حوالے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی کا دن 15/اگست 1947ء بروز جمعہ بمطابق 27 رمضان المبارک 1366 ہجری تھا۔

میرے والد صاحب نے اس دن پاکپتن کچہری میں پاکستان کا جھنڈا لہرایا تھا اور میں اس تقریب میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان میں عہدیداروں کی تقرریوں کے تمام نوٹیفیکیشن 15/اگست 1947ء کے دن جاری ہوئے۔ آپ تعزیرات پاکستان 1860 کی دفعہ 123-A کا مطالعہ کریں۔ اس شق میں مملکت پاکستان کے حوالے سے جرائم کا بیان اور ان کی دس سال سزائے قید اور جرمانے کا ذکر ہے۔ یہ شق پاکستان بننے کے کافی برسوں بعد تعزیرات کے قانون میں شامل کی گئی اور یہ آج بھی موجود ہے۔ اس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ وہ پاکستان جو ہندوستان کی تقسیم کے بعد 15/اگست 1947 کو معرض وجود میں آیا۔ یاد رکھیں قانون کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

روئے ارض پر پاکستان کا قیام اس دن عمل میں جب اس ملک کی سرحدیں مقرر ہوئیں اور وہ دن تھا 18 اگست 1947۔ قانون برائے آزادی ہند 1947ء کے دوسرے شیڈول میں ان ضلعوں کے نام دیے گئے تھے جو پاکستان میں شامل ہونے تھے۔ ان میں گرداس پور کا ضلع بھی شامل تھا۔ میرے ایک ہم جماعت ڈاکٹر محمد ظفر نیازی جو بھٹو صاحب کے دانتوں کے معالج تھے، ان کے والد محمد عمر خان گرداسپور میں ایس پی تعینات تھے۔ 18 اگست تک وہاں موجود تھے اور جیسے ہی ایوارڈ کا اعلان ہوا، ان سے ہتھیار لیے گئے اور وہ پاکستان آ گئے۔ اسی طرح مشتاق احمد چیمہ 17 اگست تک گرداس پور ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے فرائض سرانجام دیتے رہے لیکن جب ایوارڈ کا اعلان ہوا تو وہ اپنا چارج چھوڑ کر پاکستان چلے آئے۔

پاکستان بن جانے کے بعد میرے والد صاحب نے پنجاب حکومت کو دو لاکھ روپے بطور امداد پیش کیے۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ نواب افتخار حسین ممدوٹ نے پاک پتن میں ایک جلسہ عام میں یہ چیک وصول کیا۔ چودھری ظفراللہ خان کی وساطت سے قائداعظم نے والد صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ ان کے مہیا کردہ کاغذات جو کمیشن کے ریکارڈ کا حصہ بنے کی وجہ سے ساہیوال ضلع پاکستان میں شامل ہو سکا۔"

ہمیں گفتگو کرتے دو گھنٹے گزر چکے تھے اور میں نے محسوس کیا کہ جج صاحب کچھ تھک سے گئے ہیں۔ اس دوران قانونی مشورے کے لیے ایک اور صاحب بھی آ چکے تھے جو ہماری گفتگو ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے جج صاحب سے اجازت لی۔ مغرب کی اذان بلند ہوئی اور اس کی ترنم ریزیوں میں انٹرویو جذب ہو گیا۔

ہجرت کے لازوال
ان مٹ نقوش
چھے داستانوں کا مجموعہ
صفحہ نمبر 137 پر

حضرت اسماعیلؑ سے حضرت امام حسینؓ تک

عافیہ مقبول جہانگیر

اللہ اپنے خاص بندوں کی قوت ایمانی کا امتحان بھی لیتا اور انھیں ارفع و اعلیٰ مقامات پر فائز بھی کرتا ہے
حضرت امام حسینؓ نور کربلا ہیں اور تاقیامت رہیں گے

انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح کائنات میں سب سے بلند مراتب پر فائز فرمایا اور اپنے قرب و وصال کی نعمتوں سے نوازا، اسی طرح انھیں بڑی کٹھن منزلوں سے بھی گزرنا پڑا۔ انھیں بڑی سے بڑی قربانی کا حکم ہوا لیکن ان کے مقام بندگی کا یہ اعجاز تھا کہ سرمو حکم ربی سے انحراف یا تساہل نہ برتا۔ سلسلۂ انبیاء میں سیدنا ابراہیمؑ کی داستان عزیمت بہت دلچسپ اور قابل رشک ہے۔ ان کے لیے اللہ کی راہ میں بیٹے کو قربان کرنے کا حکم ایک بہت بڑی آزمائش تھی لیکن سیدنا ابراہیمؑ اس آزمائش میں بھی پورا اُترے کیسے؟ قرآن میں ارشاد ہے:

اے میرے پروردگار مجھ کو نیک بیٹا عطا فرما۔ پس ہم نے ان کو ایک بردبار بیٹے کی بشارت دی۔ پھر جب وہ (اسمٰعیل) ان کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچے فرمایا اے میرے بیٹے، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں پس تم بھی غور کر لو کہ تمہارا کیا خیال ہے (اسمٰعیل نے بلا تردد) عرض کیا اے ابا جان (پھر دیر کیا ہے) جو کچھ آپ کو حکم ہوا کر ڈالیے (جہاں تک میرا تعلق ہے) آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ پھر جب دونوں نے (اللہ کا) حکم مان لیا اور (ابراہیم نے) ان کو ماتھے کے بل لٹایا۔ اور ہم نے ان کو ندا دی کہ اے ابراہیم (کیا خوب) تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ ہم نیکو کاروں کو یوں ہی بدلہ دیتے ہیں۔ (بے شک باپ کا بیٹے کے ذبح کے لیے تیار ہو جانا) یہ ایک بڑی صریح آزمائش تھی (حضرت ابراہیم اس آزمائش میں پورا اُترے) اور ہم نے ایک عظیم قربانی کو ان کا فدیہ (بنا) دیا۔
(الصفت:37:107_100)

اب سوال یہ ہے کہ اگر حضرت اسمٰعیلؑ کو بچانا ہی

مقصود تھا تو پھر ان کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا حکم کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ سراپائے ایثار و قربانی پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے لختِ جگر سے ذبح کی تاریخ کی ابتدا ہو جائے کہ راہِ حق میں قربانیاں دینے کا آغاز انبیاء کی سنت ہے اور بچایا اس لیے گیا کہ اس عظیم پیغمبر کی نسل پاک میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ولادت باسعادت ہونا تھی۔ اولاد ابراہیمؑ میں تاجدار کائنات ﷺ کو تشریف لانا تھا۔ آزمائش کا مرحلہ گزر گیا۔ کامیابی کا نور حضرت ابراہیمؑ کی مقدس پیشانی پر چمکنے لگا۔

پھر تعمیر کعبہ کا حکم ہوا۔ عظیم باپ اور عظیم بیٹا تعمیر کعبہ میں مصروف ہو گئے۔ ایک ایک پتھر لاتے اور کعبہ کی دیواریں تعمیر کرتے۔ ایک پتھر عطا ہوا جس پر کھڑے ہو کر تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ جوں جوں دیواریں اونچی ہوئیں، یہ پتھر بھی بلند ہوتا گیا۔ حضرت اسماعیلؑ تعمیر کعبہ میں اپنے والد گرامی کی معاونت فرماتے۔ پتھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ، جب سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا اسماعیلؑ تعمیر کعبہ میں مصروف ہوتے تو یہ کلمات ان کی زبان اقدس پر جاری ہوتے "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، مولا! ہم تیرے گھر کی تعمیر کر رہے ہیں، ہماری یہ مشقت قبول فرما، ہماری اس مزدوری کو قبولیت کا شرف عطا کر، رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ، یا باری تعالیٰ! ہماری جبینیں تیرے حضور جھکی رہیں، ہمارے سجدوں کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما۔ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ، ہماری آل اور ذریت میں سے امت مسلمہ پیدا کر۔ پھر اگلی آیت میں حکم ہوا تم نے آج ہمارا گھر تعمیر کیا ہے جو مانگنا ہے مانگ لو، اپنی مشقت کا صلہ طلب کرلو، بارگاہ خداوندی میں ہاتھ اٹھ گئے "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ O"۔ باری تعالیٰ ہم نے تیرے گھر کی دیواریں بلند کی ہیں ہم نے اپنی ذریت میں سے امت مسلمہ مانگ لی ہے۔ اے خدائے رحیم و کریم، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر مجھ تک ہر زمانے میں نبی آخر الزماں ﷺ کے ظہور کا اعلان کرتا رہا ہے، یہ سلسلہ نبوت و رسالت اس مقدس ہستی پر جا کر ختم ہو جائے گا۔ وہ رسول معظم ﷺ جس کی خاطر تو نے یہ بزم کائنات سجائی۔ کرہ ارض پر ہزارہا انبیاء کو مبعوث فرمایا وہ رسول آخر ﷺ جس کے لیے تو نے ملتوں کو پیدا کیا۔ دنیائے رنگ و بو کو آراستہ کیا، آبشاروں کو تکلم کا ہنر بخشا، ہواؤں کو چلنے کی خو عطا فرمائی۔ وہ رسول برحق جس کی خاطر تو نے اپنا جلوہ بے نقاب کیا، جس کی خاطر تو نے اپنی مخلوقات کو پردہ عدم سے وجود بخشا، جس کی خاطر تو نے انسانوں کے لیے ہدایت آسمانی کے سلسلے کا آغاز کیا، اس رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس کائنات رنگ و بو میں ظہور ہونے والا ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: ہاں ابراہیم ہمارا وہ محبوب رسول آنے والا ہے، بتا ابراہیم! تو کیا چاہتا ہے۔ فرمایا: رب کائنات! اگر تو تعمیر کعبہ کی ہمیں مزدوری دینا چاہتا ہے، اگر تعمیل حکم میں ہمیں تو کچھ عطا کرنا چاہتا ہے تو اے پروردگار اپنے اس آخری رسول ﷺ کو میری اولاد میں مبعوث ہونے کا شرف عطا فرما۔ میری ذریت کو نور محمدی ﷺ کے جلووں سے ہمکنار کر دے، میری اولاد کو حضور ﷺ کی قدم بوسی کی سعادت بخش دے، مولا! مجھے اپنا محبوب ﷺ دے دے۔

ارشاد ہوا، ابراہیم تو نے تین چیزیں نبوت و رسالت، ختم نبوت اور امت مسلمہ اپنی ذریت کے لیے مانگ لی ہیں، ابراہیم تو نے میری محبت اور رضا کے لیے میرا گھر تعمیر کیا ہے

اور دعا بھی وہ مانگی ہے جسے میں رد نہیں کر سکتا اس لیے ابراہیم! جا ہم نے تجھے تیری مزدوری کے صلے میں یہ تینوں چیزیں عطا کر دیں۔ (حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا پہلے پارے کے آخر میں ہے۔ (البقرہ آیت ۱۲۴ تا ۱۲۹)

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے قوموں کی امامت کا سوال کیا، امامت کی دو شکلیں کر دی گئیں۔ کیونکہ حضور ﷺ کے ساتھ نبوت کو ختم ہونا تھا اور تاجدار کائنات ﷺ کے سر اقدس پر ختم نبوت کا تاج سجایا جانا مقصود تھا، اس لیے امامت کے دو جزو کر دیے گئے۔ ایک امامت سے نبوت اور دوسری امامت سے ولایت۔ حکمت یہ تھی کہ جب حضور ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو جائے تو پھر فیض نبوت بشکل امامت میرے نبی ﷺ کی امت کو ملنا شروع ہو جائے یوں سورہ بقرہ آیت 151 سے 157 تک دعائے ابراہیم کا جواب ہے۔

دعا تو فقط یہ تھی کہ مولا! اپنا وہ پیغمبر، رسول آخر الزماں ﷺ میری آل میں میری نسل میں مبعوث فرما۔ اللہ رب العزت نے جواب میں فرمایا کہ دو چیزیں عطا کرتا ہوں ایک نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت اور پھر شہادت۔ فرمایا" كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ ، آگے اس سے متعلق فرمایا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اسْتَعِينُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ إِنَّ اللّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ O اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگنا" وَلاَ تَقُولُواْ لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّهِ أَمْوَاتٌ، جو اللہ کی راہ میں شہید ہوں انھیں مردہ نہ کہو بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِن لاَّ تَشْعُرُونَ O "وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں"

بعثت محمدی اور شہادت کا باہمی ربط مذکورہ آیات میں بڑے اہم نکات کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ دعائے ابراہیمؑ کے جواب میں ایک طرف حضور ﷺ کی ختم نبوت بیان کی

جا رہی ہے تو دوسری طرف شہادت کا ذکر ہے۔ اس وجدانی اور عرفانی نکتے کی وضاحت میں یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ حضور ﷺ کی شان ختم نبوت کے ساتھ آپ کو مرتبہ شہادت پر بھی فائز کرنا مقصود تھا جس کا مظہر نواسہء رسولؐ سیدنا امام حسینؓ قرار پائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کو ہی ذبح عظیم کا مصداق سمجھتے ہیں۔

ذبح اسمٰعیل اور شہادت امام حسین کا باہمی تعلق

اگر شہادت حسینؓ کا تعلق ذبح اسماعیل سے جوڑا نہ جائے تو شہادت کا عمل ادھورا رہ جاتا ہے اور بات مکمل نہیں ہوتی۔ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کو صرف "ذبح" کے لفظ سے ذکر کیا گیا۔ ان کی جگہ مینڈھے کی قربانی ہوئی تو اسے "ذبح عظیم" کہا گیا۔ اب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مینڈھے کی قربانی کو ذبح عظیم اور پیغمبر کے بیٹے کی قربانی کو محض ذبح کہا جائے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ذبح عظیم سے مراد کون سی قربانی ہے؟ ذبح عظیم یقیناً وہی قربانی ہوگی جو ذبح اسمٰعیل سے بڑی قربانی کی صورت میں ادا ہوگی۔

اسماعیلؑ حضرت سیدنا ابراہیمؑ کے فرزند تھے جبکہ سیدنا حسینؓ حضور سرور کونین ﷺ کے لخت جگر اور نور نظر تھے۔ قطع نظر اس کے کہ نبی اور صحابی کے مرتبے میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن نسبت ابراہیمی سے نسبت مصطفوی یقیناً ارفع و اعلیٰ ہے علاوہ ازیں سیدنا حسین علیہ السلام کو سبط پیغمبر اور پسر بتول وحیدر ہونے کے ساتھ ساتھ نسبت ابراہیمی بھی حاصل ہے۔ نیز شہادت امام حسینؓ چونکہ سیرت رسول ﷺ کا ہی باب ہے اس لیے کائنات کی اسی منفرد اور یکتا قربانی کو ہی ذبح عظیم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لہٰذا بڑی صداقت کے ساتھ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے ضمن میں جس ذبح عظیم کا فدیہ دیا گیا وہ ایک مینڈھا نہ تھا بلکہ وہ

لختِ جگر مصطفیٰ ﷺ حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی قربانی تھی۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت شعری قالب میں ڈھالا ہے۔

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر

ذبح عظیم کے لیے نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتخاب کیوں؟

غور طلب بات یہ ہے کہ ذبح عظیم کا مصداق اگر امام حسینؓ ہیں تو آپؓ کا تعلق حضور نبی اکرم ﷺ سے وہ نہیں جو سیدنا اسماعیلؑ کو سیدنا ابراہیمؑ کے ساتھ تھا۔ یعنی وہ باپ بیٹا تھے اور یہاں بیٹا نہیں بلکہ نواسہ رسول ﷺ کا انتخاب ہو رہا ہے۔ ذبح عظیم کا اعزاز حضور ﷺ کے حقیقی بیٹے کے حصے میں آنا ممکن نہ تھا کیونکہ حضور صلی ﷺ کا کوئی بیٹا جوانی یا بلوغت کی عمر کو پہنچا ہی نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی جس کی طرف قرآن نے یوں راہنمائی فرمائی۔

مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًاO

محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو جاننے والا ہے۔ (احزاب، 40:33)

یعنی وحی الٰہی کا دروازہ بند اور حضور تاجدار کائنات ﷺ کے بعد اب قیامت تک کوئی نبی نہیں۔

قرآن آسمانی ہدایت پر مشتمل آخری صحیفہ ہے جو تا قیامت اللہ کے بندوں کی راہنمائی کے لیے کافی ہے۔

جس طرح سورۃ اخلاص میں بیان ہے: ''آپ فرما دیجئے وہ اللہ ہے جو یکتا ہے۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ ہی وہ پیدا کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے۔ (الاخلاص، 112)۔ جس طرح توحید الوہیت نے رب کو بیٹے سے پاک رکھا، اسی طرح شان ختم نبوت نے حضور ﷺ کو جوان بیٹے سے علیحدہ رکھا۔

حضرت ابراہیمؑ نے دو دعائیں مانگی تھیں۔ ایک یہ کہ باری تعالیٰ میری ذریت سے خاتم الانبیاء پیدا فرما، دوسری میری ذریت کو منصب امامت عطا کر۔ چنانچہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شکل میں نبی آخر الزماں تشریف لے آئے۔ حضور ﷺ پر نبوت ختم ہو جانے کے بعد اب یہ لازمی تقاضا تھا کہ حضور رحمت کونین ﷺ کی نبوت کا فیض اب امامت وولایت کی شکل میں آگے چلے۔ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں ولایت بھی آ گئی، حضور ﷺ کا اپنا صلبی بیٹا نہ تھا لہٰذا اب نبوت مصطفیٰ ﷺ کا فیض اور امامت وولایت مصطفوی کا مظہر تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ یہ کسی مقدس اور محترم خاندان سے چلے۔ ایسے افراد سے چلے جو حضور رحمت عالم ﷺ کا صلبی بیٹا تو نہ ہو مگر ہو بھی جگر گوشہ رسول۔ چنانچہ اس منصب عظیم کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضور ﷺ کی لاڈلی بیٹی خاتون جنت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا پر قدرت کی نگاہ انتخاب پڑی۔

حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ سے حب رسول ﷺ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے حضرت فاطمہؓ کا حضرت علیؓ سے نکاح کرنے کا حکم دیا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، 156:10، ح:10305)

یہ شادی امر الٰہی سے سرانجام پائی اس لیے کہ حضرت علیؓ سے ولایت مصطفیٰ کے سلسلے کو قائم ہونا تھا اور حضرت علیؓ کو تکمیل دعائے ابراہیمؑ کا ذریعہ بنانا تھا۔ اسی مقصد کے لیے

تاجدار کائنات ﷺ سے ان کی حضرت فاطمہؓ کے ذریعہ ایک اور مضبوط اور پاکیزہ نسبت بھی قائم ہوئی۔ قدرت نے ان دو منتخبہ شخصیات کے نور نظر سیدنا امام حسینؓ کی قسمت میں ذبح عظیم کا منصب جلیلہ لکھ دیا تھا۔

حضرت فاطمہ الزہراؓ خاتون جنت ہیں۔ یہ حضور ﷺ کی وہی لاڈلی بیٹی ہیں جن سے تاجدار کائنات ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری فاطمہ کیا تُو اس بات پر راضی ہے کہ ساری کائنات کے مومنوں کی عورتوں کی تُو سردار ہو۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (میری بیٹی) فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے پس جس نے اسے ناراض کیا بے شک اس نے مجھے ناراض کیا۔ (صحیح البخاری، 532:2)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو (اچانک) پردوں کے پیچھے سے کوئی منادی اعلان کرے گا کہ اے اہل محشر! اپنی نگاہیں جھکا لو فاطمہ بنت محمد ﷺ سے (وہ آرہی ہیں) حتیٰ کہ وہ گزر جائیں گی۔ (المستدرک للحاکم، 153:3)

حضرت جمیع بن عمیر التیمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اپنی پھوپھی کے ساتھ مل کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے پوچھا لوگوں میں سے کون سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو محبوب تھا؟ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جواب دیا حضرت فاطمہ، دوبارہ پوچھا گیا کہ مردوں میں سے کون سب سے بڑھ کر محبوب تھے؟ فرمایا فاطمہ کا شوہر (علی رضی اللہ عنہ) اور پھر فرمایا کہ میں خوب جانتی ہوں کہ وہ بڑے روزہ رکھنے والے اور تہجد پڑھنے والے تھے۔ (جامع الترمذی، 227:2، المستدرک، 155:3)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر نبی کی ذریت اس کی صلب سے جاری فرمائی اور میری ذریت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی صلب سے چلے گی۔ (4. کنزل العمال 11 : 400، ح : 32892، 1. المعجم الکبیر لطبرانی، 3 : 44، ح : 2630)

حضرت علیؓ نبی ﷺ کے قائم مقام

حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ اصحاب رسول ﷺ میں سے بعض کے گھروں کے دروازے مسجد نبویؐ (کے صحن) کی طرف کھلتے تھے۔ ایک دن حضور ﷺ نے فرمایا ان تمام دروازوں کو بند کر دو سوائے باب علی کے۔ راوی کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے چہ مہ گوئیاں کیں۔ اس پر حضور نبی اکرم ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا: مجھے باب علی کے سوا ان تمام دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا گیا ہے، پس تم میں سے کسی نے اس بات پر اعتراض کیا ہے، خدا کی قسم نہ میں کسی چیز کو کھولتا اور نہ بند کرتا ہوں مگر یہ کہ مجھے اس چیز کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے پس میں اس (حکم خداوندی) کی اتباع کرتا ہوں۔ (المستدرک للحاکم، 125:3)

منافق کی نشانی

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ چیرا اور جس نے جانداروں کو پیدا کیا، رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ مجھ سے صرف مومن ہی محبت کرے گا اور صرف منافق مجھ سے بغض رکھے گا۔ (صحیح مسلم، 60:1)

ام المومنین حضرت سلمہؓ فرماتی ہیں کہ: حضور ﷺ یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ کوئی منافق علیؓ سے محبت نہیں کرسکتا اور کوئی مومن علیؓ سے بغض نہیں رکھ سکتا۔ (جامع الترمذی، 2: 213)

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا، "علی کے چہرے کی طرف دیکھنا

عبادت ہے۔" یارِ غار حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں کہ علی کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ حضرت علی شیرِ خدا کا ذکرِ جمیل بھی عبادت ہے۔ (4۔کنز العمال، 60:11، ح:32895، 1۔المستدرک للحاکم، 141:3-142)

علی مجھ سے اور میں علی سے ہوں

بخاری شریف میں حضرت براءؓ کی ایک روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: انت منی وانا منک (صحیح البخاری، 610:2) "اے علی تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔" یہی بات انھوں نے حضرت حسینؓ کے لیے بھی فرمائی۔

حضرت یعلی بن مرۃؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ اللہ اس شخص سے محبت کرتا ہے جس نے حسین سے محبت کی۔ حسین نواسوں میں ایک نواسا ہے۔ (جامع الترمذی، 29:2)

چونکہ ولایت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض حضرت علی سے چلنا تھا اور "ذبح عظیم" حسینؓ کو ہونا تھا اس لیے ضروری تھا کہ ولایت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ولایت علی شیر خدا بن جائے اور ولایت علی شیر خدا ولایت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تصور کی جائے۔ روایت کے آئینہ خانے میں اس حدیث مبارک سے ایک اور عکس ابھرتا ہے اور غبارِ نفاق چھٹ جاتا ہے۔

حضرت ریاح بن حرثؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک گروہ حضرت علیؓ کے پاس رحبط کے مقام پر آیا۔ انھوں نے کہا اے ہمارے مولا! تجھ پر سلام ہو۔ آپؓ نے فرمایا، میں کیسے تمہارا مولا ہوں جبکہ تم عرب قوم ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے "غدیر خم" کے مقام پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جس کا میں ولی ہوں اس کا یہ (علی) مولا ہے۔ (مسند احمد بن

حنبل، 419:5) جامع الترمذی، 213:2 میں یہی حدیث حضرت زید بن ارقمؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں جس کا مولا ہوں اس کا علی مولا ہے۔

پہلی حدیث میں تاجدارِ عرب وعجم نے فرمایا ہے کہ جس کا میں ولی ہوں علی اس کا مولا ہے، پھر فرمایا جس کا میں مولا ہوں اس کا علی بھی مولا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تمام لوگ جدا جدا درختوں سے ہیں مگر میں اور علی ایک ہی درخت سے ہیں۔ (معجم الاوسط للطبرانی، 89:5، ح:4162)

حضرت علیؓ سے روایت ہے بے شک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسنؓ و حسینؓ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا، جس نے مجھ سے محبت کی اور ان دونوں سے اور ان کے ماں باپ سے محبت کی وہ قیامت کے روز میرے ساتھ میری قربت کے درجہ میں ہو گا۔ (جامع الترمذی، 642:5، ح:3733)

ساری دنیا جب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہوتی ہے یا اصحاب رسولؐ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں تو کہتے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں خدا کی عزت کی قسم میں نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی سنا ہے کہ جب آپ فاطمہؓ کو بلاتے تو فرماتے، فاطمہ! میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں، مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ماں باپ کو فاطمہؓ پر قربان کر رہے ہیں، اس لیے کہ فاطمۃ الزہراؓ ولایت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امین ہیں، یہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ قربت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ فاطمہؓ صرف مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لختِ جگر ہی نہیں حسنین کریمینؓ کی امی بھی ہیں۔ اس گود میں حسینؓ کی پرورش ہوئی۔ جنت کے سرداروں کی تربیت ہوئی۔

حسنینؓ کی محبت، محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے فرمایا جس نے حسن اور حسین دونوں سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی جس نے ان دونوں سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ (مسند احمد بن حنبل،288:2)

حضرت عطاء سے روایت ہے کہ کسی شخص نے اسے بتایا کہ اس نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے حضرات حسنین کریمین کو اپنے سینے سے چمٹایا اور فرمایا ''اے اللہ میں حسن اور حسین سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر، (مسند احمد بن حنبل،369:5)

حضور نبی اکرم ﷺ کے جسم اطہر سے مشابہت

حضور ﷺ کا لخت جگر ہونے کے ناطے حضرت امام حسینؓ کو چونکہ قربانی مصطفےٰ ﷺ کا مظہر بنایا گیا تھا اور انھیں ذبح عظیم کی خلعت فاخرہ عطا کی گئی تھی، اس لیے امام حسینؓ کے جسم کو جناب رسالت مآب ﷺ کے جسم اطہر سے قریبی مشابہت کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ آقائے دو جہاں ﷺ کے وصال کے بعد جب لوگوں کو اپنے عظیم پیغمبر کی یاد ستاتی تو وہ فاطمہؓ کے در دولت پر حاضر ہوتے اور حسینؓ کی زیارت کر کے اپنی آنکھوں کی تشنگی کا مداوا کرتے۔

حضور ختمی مرتبت ﷺ کا فیض دو طریق سے عام ہوا۔ مشابہت مصطفےٰ ﷺ کا فیض اور روحانیت مصطفےٰ ﷺ کا فیض، ایک فیض کے عام ہونے کا ذریعہ حضرت علیؓ بنے اور دوسرے فیض کے عام ہونے کا اعزاز حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے حصے میں آیا۔ فیض کے یہ دونوں دھارے حسین ابن علی مرتضیٰؓ کی ذات میں آ کر مل گئے کیونکہ حسینؓ کو ذبح عظیم بنانا مقصود تھا؟ ذبح اسماعیلؑ کے بارے میں تو حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حکم ملا لیکن ذبح حسینؓ کے لیے حضور آئینہ رحمتؐ کو عالم خواب میں نہیں، عالم بیداری میں وحی خداوندی کے ذریعہ مطلع کیا گیا۔

آپ ﷺ کو عالم بیداری میں جبرئیل امین علیہ السلام نے اطلاع دی کہ یا رسول اللہ ﷺ! عراق کی سرزمین میں

آپ کے شہزادے حسینؓ کو قتل کر دیا جائے گا اور حضور ﷺ کے طلب کرنے پر جبرئیل امین علیہ السلام نے آپ ﷺ کو حسینؓ کے مقتل کی مٹی بھی لا کر دی کہ یہ ہے سرزمین کربلا کی مٹی جہاں علیؓ کے نور نظر اور فاطمہؓ کے لخت جگر کا خون ناحق بہا دیا جائے گا۔ وہ حسینؓ جو حضور ﷺ کی آغوش رحمت میں پروان چڑھا تھا۔ وہ حسینؓ جو نماز کی حالت میں پشت اقدس پر چڑھ بیٹھا تو تاجدار کائنات ﷺ نے اپنے سجدے کو طول دے دیا کہ کہیں گر کر شہزادے کو چوٹ نہ آ جائے۔ وہ حسینؓ جو یتیموں کے آقا اور غریبوں کے مولا ﷺ کی محبتوں اور شفقتوں کا محور تھا اور وہ حسینؓ جس کے منہ میں رسول آخر ﷺ نے اپنی زبان اقدس دے دی اور اپنے لعاب دہن کو لب حسین سے مس کیا کہ ایک دن میدان کربلا میں ان نازک ہونٹوں کو پر تشنگی کی فصلوں کو بھی لہلہانا ہے۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے جبرئیل امین نے (عالم بیداری میں) بتایا کہ میرا یہ بیٹا حسین عراق کی سرزمین میں قتل کر دیا جائے گا۔ میں نے کہا، جبرئیل مجھے اس زمین کی مٹی لا کر دکھا دو جہاں حسین کو قتل کر دیا جائے گا پس جبرئیل گئے اور مٹی لا کر دکھا دی کہ یہ اس کے مقتل کی مٹی ہے۔ (البدایہ والنہایہ، 196:8-200)(کنز العمال،126:12، ح:34313)

حضور صلی ﷺ نے فرمایا: اے ام سلمہ! جب یہ مٹی خون میں بدل جائے تو جان لینا کہ میرا یہ بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ ام سلمہؓ نے اس مٹی کو بوتل میں رکھ دیا تھا اور وہ ہر روز اس کو دیکھتیں اور فرماتیں اے مٹی! جس دن تو خون ہو جائے گی وہ دن عظیم ہوگا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی،108:3)(الخصائص الکبری،125:2)

شہادت امام حسینؓ کی عظمت کا یہ پہلو بطور خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے تذکرے عہد رسالت میں ہی ہونے لگے تھے۔ آقا ﷺ نے نہ صرف حضرت امام حسینؓ کے مقتل

کی نشاندہی کردی کہ یہ عراق کا میدان کربلا ہوگا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ یہ عظیم سانحہ 61 ہجری کے اختتام پر رونما ہوگا۔ ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے وہ مٹی سنبھال کر رکھی حتیٰ کہ ہجری کے 60 برس گزر گئے، 61 کا ماہ محرم آیا۔

10 محرم الحرام کا دن تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں لیٹی ہوئی تھی۔ خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ تشریف لائے ہیں۔ آپ ﷺ رو رہے ہیں، ان کی مبارک آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، سر انور اور ریش مبارک خاک آلودہ ہے۔ میں پوچھتی ہوں یارسول اللہ ﷺ! یہ کیفیت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، ''میں نے ابھی ابھی حسینؓ کو شہید ہوتے دیکھا ہے۔'' (سنن، ترمذی، ابواب المناقب)

شہادت حسینؓ تاریخ انسانی کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ پیغمبر کے پیروکاروں نے اپنے نبی ﷺ کے نواسے کو بیدردی سے شہید کر کے اس کا سر اقدس نیزے پر سجایا۔ یہی نہیں، خاندان رسول ﷺ کے شہزادوں اور اصحاب حسینؓ کو بھی اپنے انتقام کا نشانہ بنا کر انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ ایک فاسق اور فاجر کی بیعت کر کے دین میں تحریف کے مرتکب نہیں ہوئے۔ انھوں نے اصولوں پر باطل کے ساتھ سمجھوتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے آمریت اور ملوکیت کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ حسین ابن علی رضی اللہ عنہ اور ان کے 72 جاں نثاروں کے خون سے کربلا کی ریت ہی سرخ نہیں ہوئی، بلکہ اس سرخی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

محدثین بیان کرتے ہیں کہ امام عالی مقامؓ کی شہادت پر نہ صرف دنیا روئی، زمین و آسمان نے بھی آنسو بہائے۔ شہادت حسینؓ پر آسمان بھی نوحہ کناں تھا۔ انسان تو انسان جنات نے بھی مظلوم کربلاؓ کی نوحہ خوانی کی۔ محدثین بیان کرتے ہیں کہ نواسہ رسول ﷺ کی شہادت کے وقت بیت المقدس میں جو بھی پتھر اُٹھایا گیا اس کے نیچے سے خون نکلا۔ شہادت حسینؓ کے بعد ملک شام میں بھی جس پتھر کو ہٹایا گیا اس کے نیچے سے خون کا چشمہ اُبل پڑا۔ محدثین کے مطابق شہادت حسینؓ پر پہلے آسمان سرخ پھر سیاہ ہو گیا۔ ستارے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے کائنات ٹکرا کر ختم ہو جائے گی۔ یوں لگا جیسے قیامت قائم ہوگئی ہو۔ دنیا پر اندھیرا چھا گیا۔

امام طبرانی نے ابوقبیل سے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے کہ:

''جب سیدنا امام حسینؓ کو شہید کیا گیا تو سورج کو شدید گہن لگ گیا حتیٰ کہ دوپہر کے وقت تارے نمودار ہو گئے یہاں تک کہ انھیں یقین ہونے لگا کہ یہ رات ہے۔'' (مجمع الزوائد، 197:9، معجم الکبیر، ح:2838)

ابن زیاد کا انجام

مختار ثقفی کے لشکر کے سپہ سالار نے ابن زیاد کا سر قلم کیا اور اسے نیزے پر چڑھا کر مختار ثقفی کے پاس بھیجا۔

بدبخت ابن زیاد کا سر مختار ثقفی کے سامنے رکھا تھا۔ ایک سانپ کہیں سے نمودار ہوا۔ وہ مقتولین کے سروں کو سونگھتا رہا۔ جب ابن زیاد کے سر کے قریب پہنچا تو اس کے منہ میں داخل ہوتا اور ناک کے نتھنوں سے باہر آتا۔ یہ عمل اس نے کئی بار دہرایا گویا زبان حال سے کہہ رہا تھا: یزیدیو! تمہارے چہروں پر لعنت بھیجتا ہوں۔

ابن زیاد قتل ہوا..... یزید برباد ہوا لیکن حسینؓ زندہ ہے اور قیامت تک حسینؓ زندہ رہے گا۔ یزید مر گیا۔ آج کوئی یزید کا نام بھی نہیں لیتا۔ کربلا میں آج حسینؓ کی قبر بھی زندہ ہے۔ جبکہ دمشق میں یزید کی قبر بھی مردہ ہے۔ وہاں ہر لمحہ لعنت برس رہی لیکن ساری دنیا حسینؓ کی قبر پر سلام کے پھول نچھاور کر رہی ہے۔ ◆◆◆

محمد حامد سراج

مولانا عبیداللہ سندھی

میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیانوالی) میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری تھا لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہوگیا اور بعض افراد ساہو کاری بھی کرتے رہے ہیں۔ عموماً سلمان فارسی کی اتباع میں اپنا نام عبیداللہ بن اسلام لکھنا شروع کیا مگر بعض دوستوں کے اصرار سے والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبیداللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیر کا نام جیونی تھا۔

میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ کسی نے اگر اس سے زیادہ تصریح کے لیے کہا تو عبیداللہ بن راما بن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش و یتیمی

میں بہ شب قبل صبح/12 محرم 1289ھ/10 مارچ 1872ء کو پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب ہی پر میرا والد سکھ بن گیا تھا۔ دو ماموں جامپور، ضلع ڈیرہ غازی میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوئے تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم 1878ء سے جامپور اُردو مڈل اسکول میں شروع ہوئی۔ 1887ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ دو سال کے لیے ضلع سیالکوٹ میں رہا، اس لیے ایک اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا، ورنہ اپنے اسکول میں شروع ہی سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

مطالعۂ اسلام

1884ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماج لڑکے کے ہاتھ سے 'تحفتہ الہند' ملی۔ میں اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا۔ بتدریج اسلام کی صداقت پر میرا یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفتہ الہند کے گرویدہ تھے۔ انھی کے توسط سے مجھے مولانا اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان ملی۔ اس کے مطالعہ سے اسلامی توحید اور پرانک شرک اچھی طرح سمجھ گیا۔ اس کے بعد مولوی محمد صاحب ''لکھوکی'' کی کتاب احوال الآخرۃ پنجاب کے ایک صاحب سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی اور تحفتہ الہند کے

اللہ کی رحمت سے مجھے اسلام کی فلاسفی سمجھنے کی توفیق ملی اور میں اسلامی معاشرت کا حصہ بنتا گیا

مصنف کے نام پر اپنا نام خود بخود تجویز کیا۔

احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں، یہی دو چیزیں جلد اظہار اسلام کا باعث نہیں، ورنہ اصلی ارادہ تھا کہ جب میں کسی ہائی اسکول میں اگلے سال تعلیم کے لیے جاؤں، اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔

اظہار اسلام

15 اگست 1887ء کو توکلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبدالقادر تھا۔ ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ (مظفر گڑھ) پہنچے۔ 9 ذی الحجہ 1304ھ کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند دن بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہوگیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستے میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

سید العارفین کی صحبت

اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہوگئی اس طرح سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب (بھرچونڈی والے) کی خدمت میں پہنچ گیا جو اپنے وقت کے جید اور سید العارفین تھے۔ چند ماہ ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت اس طرح میری طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا کہ عبیداللہ نے اللہ کے لیے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے۔ اس کلمۂ مبارکہ کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انھیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور محض اس لیے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس کیا کہ بڑے سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ تین یا چار ماہ بعد میں حصولِ علم کے لیے رخصت ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ حضرت نے میرے لیے خاص دعا فرمائی کہ ''خدا کرے عبیداللہ کا کسی راسخ عالم سے واسطہ پڑے۔''

میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دیا۔

بھرچونڈی سے رخصت ہو کر میں اسی طالب علم کے ساتھ بہاول پور کی دیہاتی مسجد میں پہنچا، جہاں حضرت کے خلیفہ مولانا غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک میں نے یہیں مولوی عبدالقادر صاحب سے پڑھی۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آ گئیں اور مجھے واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا مگر میں بحمداللہ ثابت قدم رہا (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچیں)۔ شوال 1305ھ میں دین پور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھی۔ یہیں ایک نووارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا اور میں مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔

دارالعلوم دیوبند

صفر 1306ھ کو میں دارالعلوم میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ

> **آپ بیتی لکھنے کا پس منظر بہ زبانی مصنف**
>
> ''لاہور کے اخبارات میں میرے متعلق محبت آمیز مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ مقالہ نگار عزیزوں کی قدر کرتا ہوں لیکن میری شخصیت اور ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر فحش غلطیاں موجود ہیں کہ میں شرم محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا، اس لیے چند مختصر واقعات لکھنے پر مجبور ہوں۔''

مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل مختلف اساتذہ سے اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقۂ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ حکمت و منطق کی کتابیں جلد ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسے میں چلا گیا اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رامپور میں رہ کر مولوی ناظر الدین سے کتابیں پڑھیں۔ اس طرح صفر 1307ھ کو دیوبند واپس آ گیا۔

حضرت مولانا شیخ الہند

دیوبند دو تین مہینے تک حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہند کے درس میں شامل ہو گیا۔ 1307ھ کو ہدایہ، تاریخ، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد دہلوی مدرس اوّل نے میرے جوابات کی بہت تعریف فرمائی۔ فرمایا اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہو گا۔ چند دوستوں نے مبشرہ خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی اور امام ابوحنیفہ کو بھی خواب میں دیکھا۔ رمضان میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا جسے شیخ الہند نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے جن میں جمہورِ علم کے خلاف تحقیقی کی رائے کو ترجیح دی گئی تھی، مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن نہیں، بلکہ راسخین فی العلم جانتے ہیں۔ شوال 1307ھ سے بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔

ترمذی حضرت شیخ الہند سے پڑھی۔ ابو داؤد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔ بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا۔ حکیم محمود خاں کے علاج سے فائدہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کرلیں۔ مجھے یاد ہے کہ نسائی اور ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں اور سراجی دو گھنٹے میں ختم کر لی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور رشید احمد کے غیر مشہور لیکن محقق شاگرد تھے۔ دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر حسین صاحب کی خدمت میں گیا۔ بخاری ترمذی کے دو سبق بھی سنے۔ 20ر جمادی الثانی 1308ھ کو دہلی سے سیدھا بھکر پہنچا۔ میرے مرشد میرے آنے سے 10 دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب 1308ھ میں شیخ الہند نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور ملاں کمال الدین صاحب نے مجھ سے ابوداؤد پڑھی۔ شوال سے سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا تاج محمود کے پاس امروٹ (سکھر) چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ میرے لیے بمنزلۂ باپ کے تھے۔ انھوں نے میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر محمد اعظم کی لڑکی سے کرایا اور میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس آخری وقت تک میرے طرز پر ہیں۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ظل عاطفت میں 1315ھ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔ گوٹھ پیر جھنڈا (حیدرآباد) میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علوم دینیہ کا کتب خانہ تھا، میں وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار لاتا رہا۔ میرے تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانہ کا فیض بھی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا رشید الدین صاحب کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کرامات دیکھیں۔ ذکر اسما الحسنیٰ میں نے انھی سے سیکھا۔ وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ علم و حدیث کے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز

اللہ کی رحمتوں سے ایک نعمت عظمیٰ جس کا میں شکریہ ادا کر

سکتا، یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی سے شروع کر کے امام ولی اللہ دہلوی تک کا سلسلۂ علما میرا راہبر بنا اور ان کو میں نے اپنا امام بنالیا۔ مجھے اپنی علمی و سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے میری تمام کوششیں ایک اصول پر منظم ہوگئیں اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ میں نے دہلی میں قبلہ نما کا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری روح میں پیوست ہوگئے۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف شیخ الہند نے کرایا تھا۔ آخر میں اس طرح کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ میں نے علما کو حجۃ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد شیخ الہند سے پڑھی۔

میرا سیاسی میلان

دوران مطالعہ مولانا اسماعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق مولانا سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات و حکایات سے اتنا قابل کر دیا تھا، مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی محبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اب اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا۔ پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا، اب دہلی کے لیے سوچنے لگا۔ مولانا اسماعیل شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنالیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا اور اس طرح آہستہ آہستہ کام شروع کر دیا۔

دیوبند واپسی

1315ھ میں دیوبند پہنچا۔ اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر لے گیا۔ ایک حدیث، دوسرا فقہ حنفی میں، حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے۔ اس دفعہ دس بارہ حدیث کی اطراف سنا کر دوبارہ اجازت حاصل کی۔ بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اسے اتحاد اسلامی کی ایک کڑی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تمام تعلیمی و سیاسی مشاغل حضرت شیخ الہند رہے۔

دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا

امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی و سندھی میں نایاب کتابیں طبع ہوئیں اور ایک ماہوار رسالہ ہدایت الاخوان چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ چل نہیں سکتا تھا اس لیے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ مولانا راشد اللہ صاحب نے 1319ھ میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ میں اس میں شریک ہوگیا۔ سات سال مدرسہ میں، میں نے رسول اللہ ﷺ اور امام مالک کو خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند

1327ھ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جماعت کی تحریک و تاسیس میں مولانا صادق سندھی اور مولانا احمد لاہور اور مولانا احمد علی میرے شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی

حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ 1331ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کے

سرپرستوں میں شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رہ کر میرا تعارف کرایا، اس طرح وہ دہلی پہنچ کر نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس لیے دہلی آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ملایا۔ اس طرح میں دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرت کابل

1915ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سالہ محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں 6، 7 سال تک حکومتِ کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ 1919ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔ یہ بات عجیب معلوم ہو گی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلامی کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

1922ء میں امان اللہ خان کے دور میں، مَیں نے کابل کانگریس کمیٹی بنائی، جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں۔

سیاحت روس

1923ء میں ترکی جانا ہوا۔ سات مہینے ماسکو رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لیے سوویت روس نے اپنا معزز مہمان بنا لیا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ وہ اس وقت بیمار تھا اور اپنے دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا)۔ میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک، جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے، اس زمانہ کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

جدید ترکی

1923ء میں انقرہ پہنچا۔ سفیر ترکی اور وزارت خارجہ ماسکو نے سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا۔ برطانوی کارندے اس کا پتا نہ لگا سکے۔ تخمیناً تین سال ترکی میں رہا۔ میں نے تحریک اتحاد اسلامی کا تاریخی مطالعہ کیا۔ مجھے مستقبل قریب میں اس کا مرکز نظر نہیں آیا، اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور جس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی۔

ہمارا پروگرام

میرا خیال ہے کہ میں اس طرح یورپ کو اسلام سے متعارف کرانے میں مولانا قاسم نانوتوی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہناتا ہوں۔

مکہ معظّمہ

1344ھ موسم حج پر مکہ میں مؤتمر خلافت منعقد ہوئی۔ میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر براہ اٹلی مکہ پہنچنے کی کوشش کی مگر مؤتمر ختم

ہونے کے بعد صفر 1345ھ میں پہنچا۔
میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا ہوں۔
حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں کوئی
سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔ اس طرح
ـے میں محفوظ ہوگیا۔

علمائے مکہ سے استفادہ

مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عربی خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی، دوسرے عبدالستار نبی عبدالوہاب، تیسرے ابوالشرف مددی۔ ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق، شیخ الحدیث مکہ اور شیخ عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ

میں یقیناً 12، 13 سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ کا بنظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے، اس زمانہ میں شاہ ولی اللہ کے اصول پر باطمینان حاصل کر سکا، جو لوگ میری طرح ان کو نہیں مانتے، میں انھیں مطمئن کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میں نے شاہ صاحب کی مشہور کتابوں کا مطالعہ خاص طور پر جاری رکھا، مثلاً بدور بازغ، خیر کثیر، تفہیمات، مطعات، الطاف قدس، لمعات وغیرہ کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے پڑھی۔ رفیع الدین کی تکمیل رضوان، مولانا شہید کی طبقات اور مولانا قاسم کی قسم العلوم، تقریر دلپذیر اور آب حیات کو استعمال کیا۔ اگر مجھے موقع دیا جائے کہ امام ولی اللہ دہلوی کو حکمت کا مستقل مجتہد فرض کر لیں اور امام عبدالعزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کو اس حکمت و معرفت مولانا اسماعیل شہید اور مولانا نانوتوی کو مجتہد فی المذہب کے مرتبہ پر تسلیم کر لوں، تو میں اس حکمت قرآنی کا ایسا اسکول قائم کر سکتا ہوں جس میں قرآن عظیم، سنت رسولؐ، سنت خلفائے راشدین، تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو سکے۔ بعد میں تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحقیق و تطبیق اس اصول پر آسان ہو جائے۔

مراجعت وطن

36ء سے کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کر دی اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے۔ اس لیے مجھے یکم نومبر 37ء کو اجازت کی اطلاع ملی اور یکم جنوری 38ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ ہوا۔ حج کا موسم سر پر آ گیا اس لیے ادائے مناسک کے بعد واپسی کا ارادہ ہے۔

ہندوستان میں پروگرام

ہندوستان پہنچ کر یہ پروگرام اس کے قریب قریب ہوگا۔
ا۔ کانگریس کی معمولی ممبری، نہ کہ عملی حصہ۔
۲۔ میرا محبوب مشغلہ فلسفہ امام ولی اللہ کی تعلیم و اشاعت ہوگا۔ میں اہل علم کے اعلیٰ طبقے کو اس طرف متوجہ کرتا رہوں گا۔
۳۔ جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوئے تو میں کانگریس میں فلسفہ ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کروں گا۔

کابل میں 7 سال

15 اگست کی نماز مغرب سرحد افغانستان میں پڑھی اور بغیر کسی پاسپورٹ کے افغانستان میں داخل ہوا۔ قندھار میں ہمیں دو شخص ایسے ملے جو نائب الحکومت سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ ایک صاحب ہمیں سندھ میں مل چکے تھے۔ نائب الحکومت سے ہماری ملاقاتیں اچھی رہیں۔ بعض علمی مسائل کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اگرچہ مثنوی رومی سے ہمارا اشغال کم رہا ہے لیکن اس امتحان میں کامیاب رہے۔ ہمیں خاص راہداری دی اور اوّل درجہ کے سفر کا نظام کر دیا۔ اپنے پرائیویٹ دوستوں کے نام خطوط بھی دیے۔ غزنی سے ہم نے

سردار محمود طرزی کو اطلاع بھیج دی تھی۔ اس لیے ان کا آدمی ہمیں شیخ ابراہیم کے ہاں سب سے پہلے خوش آمدید کہنے کے لیے آیا۔ وہ نوجوان سردار عبدالہادی خاں تھا۔

ہمارا تعارف

شیخ ابراہیم کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں اُترے اور ان کے توسط سے ان لوگوں سے مل گئے جن کے لیے ہمارے پاس خطوط تھے۔ اس میں قابل ذکر سپہ سالار محمد نادر خان اور سردار محمود خاں طرزی تھے۔ سپہ سالار نے ہمیں ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا اور ہمارے قیام کابل میں جو مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں، ان کے حل کے لیے اپنی تمام توجہ مبذول رکھی۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم بظاہر ان سے اجنبی رہیں اور اس پر ہم نے عمل کیا۔ ان کے خاندان کا ہمارے مشائخ سے خاص رابطہ چلا آتا ہے۔ اس لیے ان کا ہر قول و فعل اخلاص پر مبنی تھا۔ ترکی کے شریک جنگ ہونے کا اثر طرزی پر نسبتاً زیادہ تھا، اس لیے ہمارا رابطہ ان سے زیادہ ہوتا گیا۔ انھوں نے ہمیں سردار معین السلطنت سے ملایا۔ اس وجہ سے ہمارا ذکر سلطنت کے تمام سرداروں تک پہنچ گیا۔ سلطنت افغانیہ میں شرعی فیصلوں کا ایک محکمہ ہے جسے میزان التحقیقات الشرعیہ کہتے ہیں۔ اس محکمہ کا رئیس قاضی عبدالرزاق خاں ہمارے دارالعلوم دیوبند کا تعلیم یافتہ ہے۔ میں نے حدیث حضرت گنگوہیؒ سے پڑھی تھی۔ انھیں جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ میرا ہی نام عبیداللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔

امیر حبیب اللہ کے حضور میں باریابی

ایک دن سردار نائب سلطنت نے مجھے اپنے قصر زین العمارۃ میں بلایا۔ عصر کے بعد وہیں اعلیٰ حضرت تشریف لائے اور کوئی آدمی نہ تھا۔ سردار نائب السلطنت نے میرا عریضہ میں پیش کیا۔ آدھ گھنٹے تک اعلیٰ حضرت اسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ آخر میں دعائی فقروں سے بہت متاثر ہوئے اور مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کام کرنے کے لیے زبانی ایک حکم ارشاد فرمایا، جس کی تعمیل میں اپنے امکان بھر آخر تک کرتا رہا۔

جنود اللہ کا قیام!

(چند جوانوں کی مدد سے) میں نے پرانے نظام کو تازہ کرنے کی کوشش شروع کی۔ ایک نوجوان عبدالباری ایم اے جماعت کا صدر منتخب ہوا۔ جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہمیں دہلی کے نظارۃ المعارف کا سا لطف آنے لگا۔ ان کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ اس جماعت میں کم از کم دس آدمی ایسے تھے جو تین سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے۔ انھیں ہم نے علیحدہ کرلیا اور کسی قدر مذہبی و سیاسی عام اصول پر ان سے مذاکرات ہونے لگے۔ اس میں شیخ ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری بھی شریک تھے۔

اسی عرصہ میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے پہنچ گئے جن میں مولانا منصور انصاری جمعیۃ الانصار میں ہم دونوں کے ساتھ کام کرچکے تھے اور مولانا سیف الرحمٰن دہلی سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ ان کے وکیل مولانا محمد بشیر، جولاہور جماعت اہل حدیث کے معزز کارکن تھے اور ہجرت کر کے جماعت مجاہدین میں آئے تھے، نوجوانوں کی ہجرت میں ان کا خاص مقام تھا۔ وہ بھی اپنی جماعت کے فرائض انجام دینے کے لیے کابل پہنچے۔ ان لوگوں کے مشورے سے ہم لوگوں نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنائی جسے جنود اللہ کہا جاتا۔ اس میں اگر عسکریت تھی تو اس قدر تھی جتنی سالویشن آرمی میں موجود ہے۔ اس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابت دُور کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے آنے سے افغانی مجاہدین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی۔ وہ چونکہ حضرت شیخ الہند کے خاص دوستوں میں سے تھے، ان کے ساتھیوں میں سے بہت

سے لوگ دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے جب ان کے وکلاء کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہو گئے۔

ممبروں سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ اس میں ہمارے دوست عبدالباری بی اے کی رفاقت ہمارے کام آئی۔ راجا مہندر

مولانا عبیداللہ سندھی تحریک آزادی ہند کے کارکن تھے۔ ہندوستان میں برطانوی استعمار سے آزادی کے لیے سیاسی طور پر سرگرداں رہے۔۔1884ء میں بارہ سال کی عمر میں ایک نومسلم عالم عبیداللہ مالیرکوٹلی کی کتاب ''تحفۃ الہند'' پڑھنے کے بعد آپؒ نے اسلام قبول کیا اور اس کے مصنف کے نام پر آپؒ نے اپنا نام ''عبیداللہ'' رکھا۔ ان کا نام پیدائشی نام بوٹا سنگھ تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام عبیداللہ رکھا۔

1901ء میں گوٹھ پیر جھنڈو میں دارالرشاد قائم کیا اور سات برس تک تبلیغ اسلام میں منہمک رہے۔

1909ء میں اسیر مالٹا محمود الحسن کے حکم کی تعمیل میں دارالعلوم دیوبند گئے اور وہاں طلبہ کی تنظیم ''جمعیت الانصار'' کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔

1912ء میں دلی نظارۃ المعارف کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا جس نے اسلامی تعلیمات کی اشاعت میں بڑا کام کیا ہے۔

ترکی میں 1924ء میں اپنی ذمہ داری پر تحریک ولی اللہ کے تیسرے دور کا آغاز کیا۔ اس موقع پر آپ نے آزادئ ہند کا منشور استنبول سے شائع کیا۔

ترکی سے حجاز پہنچے اور 1939ء تک مکہ معظمہ میں رہے۔ اسی عرصہ میں انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق اور دینی مسئل کو تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ عوام تک پہنچایا۔

آپ نے تحریک ریشمی رومال میں سرگرم حصہ لیا۔

افغانستان کی آزادی کی سکیم آپ ہی نے مرتب فرمائی تھی، 25 سال تک جلاوطن رہے۔

افغانستان میں آل انڈیا کانگریس کی ایک باضابطہ شاخ قائم کی۔

ساری زندگی قائد حریت کی حیثیت سے اسلامی اور سیاسی خدمات انجام دیتے رہے۔

حکومت موقتہ ہند

راجا مہندر پرتاب اور مولانا برکت اللہ نے مل کر حکومت موقتہ ہند کی بنیاد ڈالی جس میں بعض جرمن اور ترک بھی شامل ہوئے۔ اس حکومت نے ایک وفد روسی گورنمنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ سردار نائب السلطنت نے اسے منظور کر لیا۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ اور ڈاکٹر خوشی محمد جالندھری وفد میں تھے۔ اس مشن کے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی دوسرے ہندوستانی سے ملیں۔

ہماری ملاقاتوں کا تسلسل دیکھ کر ہی حکومت موقتہ ہند میں شمولیت کی دعوت دی۔ میں نہایت مسرت سے اس میں شامل ہو گیا۔ البتہ حلف نامہ تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد ہمارے ہندوستانی معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی مداخلت سے پاک ہو گئی۔ ابتدا حکومت موقتہ کے تین ممبر رہے۔ امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں جنگ افغانستان کے خاتمہ پر اور رکن بڑھائے گئے۔ اس میں جماعت مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر

صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

راجا صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ مگر اپنی شخصی ڈکٹیٹرشپ کا خیال ان کے دماغ پر غالب تھا۔ ہم نے بڑے داؤ پیچ سے انھیں راضی کیا کہ حکومت موقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دے گی۔ جب انڈین نیشنل کانگریس نے اس کام کے لیے معین کیا تھا۔ جب پہلی بار راجا صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومت موقتہ کے لیے تین مراکز تجویز ہوئے؛ کابل نیپال اور بنگال۔ کابل کے مرکز کا کام ہمیں ملا۔

اس کے بعد ہم نے جنود اللہ اور باقی تمام کارروائیوں کو حکومت موقتہ مرکز کابل سے متعلق کر دیا۔

امیر امان اللہ خان جب برسر اقتدار آئے تو انھوں نے ہی حکومت کا نمائندہ مان کر سرکاری معاملات صلح و حرب میں شریک کر لیا۔ جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں مجھے بلا کر سرفراز فرمایا۔ دوران جنگ میں بعض اہم امور میرے حوالے کیے گئے۔ جن کی کامیابی میں ہماری خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئیں۔ آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے، امیر صاحب نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومت موقتہ کا کام کرنے سے روک دیا کہ انٹرنیشنل سیاسیات کی پابندی ضروری ہے۔ ہم نے ایک شرط پر اسے منظور کر لیا۔ مگر ان کے تذبذب پر ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

ہماری نظر بندی اور قید

اس کے بعد (ہم پر) ہندوستانی حکومت کے اعتراض کا یہ اثر ہوا کہ مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمان کابل سے یاغستان روانہ کر دیے گئے۔ جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے۔ وہاں مولانا سیف الرحمٰن کو برٹش افغانوں نے اپنی حراست میں لے لیا اور ہندوستانی معاملات سے علیحدگی کا وعدہ کرا لیا۔ انور پاشا کے نام حضرت شیخ الہند کا خط جلا دیا گیا۔

اس کے بعد ہمیں یکم رمضان 1335ھ کو ایک تنگ مکان میں بلا کر قید کر دیا گیا۔ ہم لوگ 20، 25 آدمی تھے اور وہ گھر کسی حالت میں دس آدمیوں کے لیے موزوں نہ تھا۔ ہماری نگرانی سردار سپہ سالار کے سپرد تھی۔ انھیں ہم نے توجہ دلائی۔ اس نے ہمارے لیے سرکاری باغ میں خیمے لگوائے اور عید پر خود خیمہ میں تشریف لائے۔ ایک عرصہ کے بعد ہماری نگرانی مستونی ممالک کے سپرد کی گئی۔ اب ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کی مدد سے مستونی کے گھر رہنا شروع کر دیا۔

امیر امان اللہ خاں سے ہمارا تعارف

جب امیر امان اللہ خاں کابل میں مستقل ہو گئے تو انھوں نے ہمیں جلال آباد سے طلب فرمایا۔ جب ہم دربار میں حاضر ہوئے تو مسکرا کر فرمایا:

''من ہمو ستم'' اس خاص ملاقات کی طرف اشارہ فرمایا۔

اعلیٰ حضرت کی سلطنت میں ہم نے چند روز اپنی حکومت کی ذرا سی جھلک دیکھ لی تھی، جس قدر وہ اپنے وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اسی کے قریب قریب تھا۔ ہم ان کی ذاتی مجالس میں شامل ہوتے تو جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے۔ ہم سے ان کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا۔

ہم نے کوئی ایسا مشورہ عرض نہیں کیا جو انھوں نے قبول نہ فرمایا ہو۔ ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کی گئی ہو۔ ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا، ہم نے افغانستان کے استقلال و استحکام میں کوئی دریغ نہیں کیا۔

حضرت شیخ الہند کی وفات پر جس شان بے نظیر سے مجلس فاتحہ خوانی منعقد ہوئی، وہ ایک یادگار ہے۔ میں اس تقریر کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں:

''مولانا محمود حسن یک کار را شروع کردند من اورا پورا می کنم۔''

ملک بھر کے اساتذہ کے لیے راہ نما کتاب، تعلیمی دنیا کے لیے ''گفٹ بک'' از پروفیسر رشید احمد انگوی

وادیٔ سون سکیسر کی مردم خیز بستی انگہ..... جہاں سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ، شاعرِ پاکستان احمد ندیم قاسمیؒ، ممتاز صحافی ظہیر بابر، خطیب شاہی مسجد مولانا غلام مرشد اور محدث کبیر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ و شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے مایہ ناز شاگرد شیخ الحدیث قاضی محمد خلیلؒ جیسی نابغہ روزگار ہستیوں نے جنم لیا۔ اسی بستی کے ایک ممتاز دینی و علمی گھرانے میں رشید احمد نامی ایک بچہ پیدا ہوا جو اپنے گاؤں کی نسبت سے انگوی کہلایا۔ بیک وقت دینی و دنیاوی تعلیم حاصل کرتے ہوئے سائنس کا طالب علم بنا اور لائف سائنسز (ذوالوجی) میں ملک کے معروف اُستاد و معلم راہنما کے طور پر جانا گیا۔ پٹھانوں کے شہر ژوب کے کالج کا لیکچرر بنا اور آخر میں پہلوانوں کی سرزمین گوجرانوالہ کے سب سے بڑے کالج کا پرنسپل بن کر ریٹائر ہوا۔ اگلے ہی روز جماعت اسلامی کے منصورہ کالج (لاہور) سے وابستہ ہو کر آٹھ سال تعلیمی خدمات سرانجام دیں..... اور وہاں سے فارغ ہو کر قلم ہاتھ میں پکڑا، اور تحدیثِ نعمت کے جذبے سے نصف صدی پر پھیلی سرگزشت اس اُمید کے ساتھ رقم کر دی کہ اگر کسی اُستاد کو راہ نمائی مل گئی تو ان شاء اللہ یہ مصنف کے لیے توشہ آخرت ہوگا۔

پروفیسر رشید احمد انگوی 03004723514

قیمت صرف -/400 (تین نسخے منگوانے پر 50% رعایت)

پتہ برائے خط کتابت
16-G مرغزار کالونی، ملتان روڈ، لاہور
ای میل: rasheedangvi16@gmail.com

برائے رابطہ:
03004723514
03404242227
03354517250

دنیا میں بستے انوکھے انسان

ڈوبتے جہاز کے فرسٹ کلاس مسافر

انسانی تاریخ کے بحرِ ذخار پر رواں اس عجیب و غریب سفر کی تحیر خیز و عبرت اثر داستان جو کبھی ہمیں سپر پاورز کا خوفناک تصادم دکھاتا ہے تو کہیں استعماری قوتیں نہتے و بے بس مرد و زن پر ایسے سنگین مظالم ڈھاتی دکھائی دیتی ہیں کہ بدن پر لرزہ طاری ہو جائے

پانچ صدیوں پر محیط معاشی و سیاسی انقلابات کی ڈرامائی کہانی

عالم تمام

سیّد عاصم محمود

''وہ ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جہاں میں پہنچی۔ دیواروں پر گولیوں کے جابجا نشان نظر آئے۔ اسی میں بادشاہ ہند اور شاہی خاندان کی 82 خواتین اور 47 بچوں کو رکھا گیا تھا۔ مکان کے کمرے چھوٹے اور تنگ و تاریک تھے۔ شاہ کو بھی ایک ایسے ہی تباہ حال کمرے میں تنہا مقید کر رکھا تھا۔

''کمرے میں صرف ایک چارپائی بچھی تھی۔ وہ اس پر ساکت و جامد بیٹھا زمین کو گھورے جا رہا تھا۔ چہرہ حزن و ملال کی تصویر تھا۔ سفید کپڑے میلے کچیلے ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں مجھے بے انتہا مایوسی دکھائی دی۔ میں نے غم و اندوہ میں ڈوبی ایسی آنکھیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ جو کبھی شاہ ہند تھا، اب بے بسی اور لاچاری کا مجسمہ بن چکا تھا۔

''میں شاہی حرم کی بیبیوں سے بھی ملی۔ آہ، ان کا کچھ دوش نہ تھا پھر بھی انھیں آسائشوں بھرے محل سے اس کال کوٹھڑی میں آنا پڑا۔ جن خواتین کے چہرے کسی نے نہیں دیکھے تھے، اب انگریز فوجی ٹکر ٹکر انھیں دیکھتے۔ جب بھی کمرے میں کوئی مرد داخل ہوتا، وہ اپنا چہرہ دیوار کی سمت کر لیتیں۔ انھیں پردہ کرنے سے زبردستی روک دیا گیا تھا۔

''میں سوچنے لگی کہ کبھی اس شاہی خاندان کے اردگرد ملازموں اور خواصوں کا ہجوم رہتا ہوگا مگر آج یہ دنیا کی بے ثباتی کی منہ بولتی کہانی بیان کر رہا ہے۔''

یہ الفاظ روتھ کوپ لینڈ کے ہیں جو آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کو دیکھنے گئی تھی۔ وہ ایک پادری کی بیوی تھی جو ہندوستان مشنری مہم پر آیا تھا۔ یہاں اس نے جنگ آزادی 1857ء کو بچشم خود دیکھا۔ انگلستان واپس جا کر اپنی آپ بیتی ''A Lady's escape from Gwalior'' تحریر کی جس سے اقتباسات آپ نے درج بالا ملاحظہ فرمائے۔

جنگ آزادی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں نے بوڑھے بہادر شاہ ظفر کو زیرحراست لے لیا تھا۔ ان پر عنقریب مقدمہ چلنے والا تھا۔ شاہ ہند اس عظیم مغلیہ سلطنت کے وارث تھے جس کا پھریرا کبھی بنگال سے لے کر حیدرآباد دکن اور پھر افغانستان تک لہراتا تھا۔ ایک زمانے میں مغل بادشاہ کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ برطانوی سفیر اس کے دربار میں جاتے ہوئے گھبرا گیا۔ اب وہی مغل شاہ انگریز کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ اُسے روزانہ دو آنہ خرچہ دے کر اس پر احسان جتاتے۔

مغلیہ سلطنت آخری تاجدار، حالتِ کسمپرسی میں

اکیس دن مقدمہ چلا کر انگریز نے بوڑھے شاہ کو مع خاندان زبردستی رنگون (برما) بھجوا دیا۔ ان کی زندگی کے بقیہ ایام اسیری ہی میں بسر ہوئے۔ شاہ ہند کو 16x16 فٹ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رکھا گیا تھا۔ وہ عموماً چارپائی پر لیٹے عظمت رفتہ کو یاد کرتے آنسو بہاتے اور اسی دلدوز کیفیت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یوں ہندوستان میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کی آخری شمع بھی بجھ گئی۔

ایک پُراسرار عمل

ہر ذی حس اور باشعور انسان کے لیے قوموں کا عروج و زوال غم واندوہ میں ڈوبا پُراسرار عمل ہے۔ ایک قوم کی داستان تباہی پڑھتے ہوئے انسان سبق وعبرت تو پاتا ہے، ساتھ ساتھ یاس کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔

دنیا بھر کے دانشوروں اور فلسفیوں نے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ ایک قوم کیونکر عروج پاتی اور پھر تابناک ماضی کی نشانیاں پیچھے چھوڑ زوال پزیر ہو جاتی ہے۔ عظیم مسلمان مفکر، ابن خلدون پہلے فلسفی ہیں جنہوں نے قوموں کے عروج و زوال کو سائنسی انداز میں بیان کرنے کی سعی فرمائی۔

ابن خلدون کے نزدیک ایک قوم کی زندگی انسانی حیات سے مشابہ ہے۔ ایک انسان بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے ادوار سے گزرتا موت کو گلے لگالیتا ہے۔ بعینہ اسی طرح قوم بھی قابل قدر کارنامے انجام دے کر آخر کار دنیا سے مٹ جاتی ہے۔ گویا ابن خلدون کے نزدیک ایک قوم کا نیست و نابود ہونا تقدیر ہے جس سے وہ مفر نہیں پاسکتی۔

جرمنی کے ممتاز مورخ و فلسفی، اسوالڈ اشپنگلر کا نظریہ عروج و زوال نیا زاویہ نظر عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک قوم کی تہذیب و تاریخ کا سفر ادلتے بدلتے موسموں کے مترادف ہے: گرمی، سردی، بہار اور خزاں۔ جب ایک قوم خزاں میں داخل ہو جائے تو اس کا پیغام اجل آ پہنچتا ہے۔

اشپنگلر پھر یہ کہتا ہے کہ یہ مقام آنے پر ایک قوم کو خوفزدہ ہونے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں بلکہ اُسے چاہیے کہ وہ بہادری سے موت قبول کر لے۔ جرمن فلسفی کی دلیل یہ ہے کہ جب ایک قوم اعلیٰ تہذیب و تمدن تخلیق کر دے تو پھر رفتہ رفتہ اس کی تخلیقی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں اور جب وہ نزع کے عالم میں ہو تو موت اس کی نجات دہندہ بن جاتی ہے۔

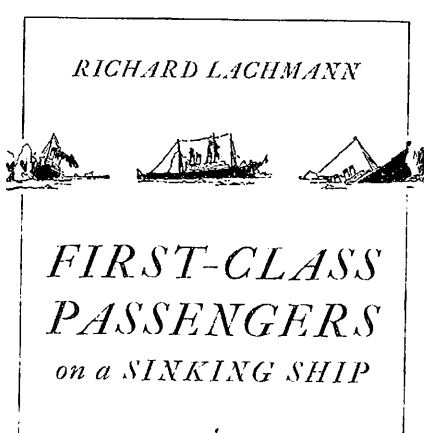

برطانیہ کے منفرد فلسفی و مورخ، آرنلڈ ٹائن بی نے بھی قوموں کے عروج و زوال کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ وہ بارہ جلدوں پر محیط اپنی قابل قدر تصنیف ''مطالعہ تاریخ'' میں لکھتا ہے کہ ایک قوم کو ہر وقت متفرق چیلنج درپیش رہتے ہیں۔ اگر وہ ان چیلنجوں کا مقابلہ بخوبی کرتی رہے تو ترقی جاری رہتی ہے۔ جیسے ہی وہ مقابلے میں کمزوری دکھائے، اس کے زوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ گویا ٹائن بی کے نزدیک قوم کی بقا اسی میں مضمر ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتیں زندہ رکھ کر چیلنجوں کا مقابلہ کرتی رہے۔

ایک قوم کشتی پر سوار ہو تو حکمران طبقہ اس کے کھیون ہار

کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے حکمران اور ان کی سیاست بھی صدیوں سے فلسفیوں اور دانش وروں کی توجہ کا مرکز ہے۔ ڈھائی ہزار سال قبل یونان میں ایک شاعر اگاتھون گزرا ہے، ارسطو اور افلاطون کی محفلوں میں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ وہ اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:

''ہر حکمران کو تین باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ اوّل یہ کہ وہ انسان پر حکومت کرتا ہے۔ دوم یہ کہ وہ قانون کے مطابق حکومت کر رہا ہے۔ سوم یہ کہ وہ سدا حکمران نہیں رہے گا۔''

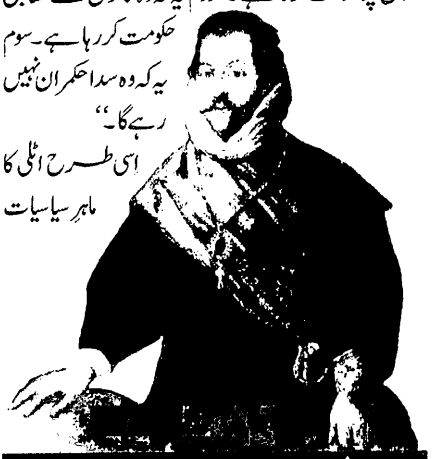

فرانسس ڈریک، قزاق جو ''سر'' بن گیا

اسی طرح اٹلی کا ماہر سیاسیات میکاولی ہمیں بتاتا ہے ''حکمران کی عقل و دانش پر کھنے کا بہترین طریق کار یہ ہے کہ دیکھا جائے، اس نے اپنے اردگرد کن لوگوں کو اکٹھا کیا ہے۔'' چین کا فلسفی زونگ زو حکمرانوں کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتا۔ کہتا ہے ''معمولی چور تو جیل میں ڈالا جاتا ہے۔ سب سے بڑا بدمعاش قوم کا لیڈر بن بیٹھتا ہے۔''

پروفیسر رچرڈ لیکن امریکا کے فلسفی و ماہر عمرانیات ہیں۔ اُنھوں نے ایک تازہ کتاب ''ڈوبتے جہاز کے فرسٹ کلاس مسافر'' (First Class Passengers on a Sinking Ship) تصنیف کی ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوموں کے عروج و زوال کا ایک نیا نظریہ پیش کرتی ہے۔

پروفیسر امریکا کی یونیورسٹی آف البانی میں عمرانیات پڑھاتے ہیں۔ تاریخ کا عمرانی نکتۂ نظر سے تجزیہ کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہودی گھرانے سے تعلق ہے۔ والدین ہٹلر کی حکومت سے خوفزدہ ہو کر دورانِ جنگِ عظیم دوم امریکا بھاگ آئے تھے۔ رچرڈ وہیں 1956ء میں پیدا ہوئے۔ پرنسٹن اور ہارورڈ جیسی ممتاز یونیورسٹیوں سے تعلیم پائی۔ اب تک پانچ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ اِن کتابوں میں پروفیسر صاحب نے یہ انوکھا نظریہ پیش کیا:

''ہر ملک یا قوم میں آبادی کا ایک فی صد حکمران یا ایلیٹ طبقہ بیشتر وسائل پر قابض رہتا ہے۔ یہ حکومت میں رہ کر ایسی پالیسیاں بناتا ہے جو اُسے زیادہ سے زیادہ طاقتور اور اَمیر بنا دیں۔ یہ اکثر اوقات اخلاقیات و قانون کو پیروں تلے روند ڈالتا ہے۔ جب تک اِس حکمران طبقے کے ارکان میں ہم آہنگی رہے، ملک ترقی کرتا ہے۔ جب اِن میں خانہ جنگی ہونے لگے، تو ملک زوال پزیر ہو جاتا ہے۔''

بہت سے عوامل

گویا پروفیسر رچرڈ نے ہر قوم کے عروج یا زوال کا ذمے دار حکمران طبقے کو قرار دے ڈالا۔ اِس نظریے میں دم خم تو ہے، مگر یہ سو فی صد درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایک قوم کی ترقی یا پستی جنم لینے میں کئی واقعات، حالات، شخصیات، نظریات کارفرما ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ قدرتِ الٰہی بھی اِس ضمن میں اپنا کردار اَدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر کبھی آپ نے سوچا کہ عام سے مسالے بھی دو سپر پاورز کے زوال کی وجہ بن سکتے ہیں؟ شاید نہیں، مگر تاریخ میں بعینہٖ ایسا ہی ہو چکا جب مسالوں کی وجہ سے اپنے وقت کی دو سب سے بڑی معاشی

طاقتوں، ہندوستان اور چین کو سرنگوں ہونا پڑا۔

یہ نومبر 1577ء کی بات ہے، لندن سے تین بحری جہازوں پر مشتمل قافلہ جنوبی امریکا کی سمت روانہ ہوا۔ اِس سفر کے لیے سرمایہ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ اوّل نے فراہم کیا تھا۔ جہازوں پر توپیں لدی تھیں اور اُن پر پونے دوسو فوجی سوار تھے جن کی قیادت پینتیس سالہ فرانس ڈریک کر رہا تھا۔ یہ ایک جنگی مہم تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہسپانوی حکومت نے جنوبی امریکا کے ساحلوں پر جو نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں، اُن پر حملہ کر کے وہاں لُوٹ مار کی جا سکے۔ اُس زمانے میں برطانیہ اور اسپین کے مابین جنگ جاری تھی۔

دلچسپ بات یہ کہ فرانس ڈریک بحری قزاق تھا۔ ملکہ الزبتھ نے ڈریک کی خدمات اِس لیے حاصل کیں تا کہ اپنے ہسپانوی دشمن کو جانی و مالی نقصان پہنچا سکے اور ساتھ ساتھ برطانوی حکومت پر بھی حرف نہ آئے۔ گویا فرانس ڈریک ایک خفیہ ''اسٹیٹ ایکٹر'' تھا۔ ایسے کردار دَورِ جدید میں ہر ملک میں ملتے ہیں۔ حکومتیں اِن چھپے رستموں سے ہر قسم کے قانونی اور غیر قانونی کام کراتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایک رئیل اسٹیٹ ٹائیکون کا ذکر اسی معنی میں ہوتا ہے۔ حکومتیں تب اُنھیں تحفظ دینے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اِس لیے بعض اوقات کوئی خفیہ اسٹیٹ ایکٹر حکومت سے بھی زیادہ طاقتور ہستی بن جاتا ہے۔

بہرحال فرانس ڈریک جنوبی امریکا پہنچا اور وَہاں ہسپانوی نوآبادیوں میں لُوٹ مار کرتا رہا۔ سمندروں میں سفر کرتے ہوئے اُسے ہسپانوی اور پُرتگالی بحری تجارتی جہاز ملے، تو اُن پر بھی چڑھ دوڑا۔ اُسے اُن سے طلائی و نقرئی سکّے ملے، ہیرے جواہرات اور تجارتی سامان بھی۔ جب وہ واپس وطن آنے لگا، تو سمندری طوفان نے قافلے کو جزائر ملایا (موجودہ انڈونیشیا اور ملائیشیا) پہنچا دیا۔ وہاں فرانس ڈریک مقامی مسلمان حکمرانوں کو دوست بنانے میں کامیاب رہا۔ اُس نے ہسپانیوں سے چھینے ہوئے سکّے اُنھیں دے کر مسالہ جات مثلاً کالی مرچ، لونگ، جائفل، دارچینی، الائچی وغیرہ خرید لیے۔ لندن میں اِن مسالوں کی بہت مانگ تھی۔

1580ء میں فرانس ڈریک تھکا ہارا واپس لندن پہنچا۔ ملکہ الزبتھ کو خبر مل چکی تھی کہ اِس کا کارندہ بڑا خزانہ لیے آ رہا ہے، لہٰذا ملکہ نے بنفسِ نفیس ڈریک کا استقبال کیا۔ برطانوی ملکہ کو مایوسی نہیں ہوئی ..... ڈریک نے لُوٹے گئے مال و دولت سے

لاشوں پر پھڑپھڑاتا امریکی پرچم

حسبِ روایت آدھا حصہ الزبتھ اوّل کی نذر کیا۔ یہ برطانوی حکومت کی سال بھر کی آمدن سے بھی زیادہ تھا۔ ملکہ برطانیہ تو خوشی سے نہال ہو گئی۔ اُس نے بحری قزاق کو ''سر'' کا خطاب دے کر اپنا شاہی درباری بنا دیا۔

فرانس ڈریک نے مسالہ جات برطانوی تاجروں کو فروخت کر دیے۔ اہلِ لندن نے ذوق وشوق سے یہ مسالے

خریدے۔ کیونکہ ان کی قیمت منڈی میں دستیاب مسالوں سے کم تھی۔ لندن کے تاجروں نے جب مسالے ہاتھوں ہاتھ بکتے دیکھے، تو اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اب وہ اپنے بحری جہاز جزائر ملایا بھجوانے کے منصوبے بنانے لگے۔ اِس تمنا نے آخر بیس سال بعد عملی جامہ پہن لیا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا..... تاریخِ انسان کی طاقتور ترین ملٹی نیشنل کارپوریشن جس نے ہندوستان اور چین کو اپنی چالوں اور سازشوں سے اپنے زیرِ نگیں لے لیا۔ دونوں سپر پاورز پھر کئی عشروں تک ذلت و خواری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئیں۔

الغرض فرانس ڈریک کا جزائر ملایا پہنچنا ایک انقلابی واقعہ بن گیا...... مگر یہ ارادتاً ظہور پزیر نہیں ہوا، بلکہ قدرتِ الٰہی اُسے وہاں لے گئی۔ وہ بیچارا تو جنوبی امریکا سے واپس برطانیہ جارہا تھا کہ بحرالکاہل کی تیز ہواؤں نے اُسے انڈونیشیا پہنچا دیا۔ وہ پھر بحرِ ہند کے راستے، جنوبی افریقا کے نیچے سے ہوتا ہوا برطانیہ پہنچا۔ تب اِس بحری راستے سے صرف پرتگیزی اور ہسپانوی جہاز راں ہی واقف تھے۔ اب اِس راز میں برطانوی بھی حصّے دار بن گئے۔ یہ تینوں یورپی طاقتیں مسالوں کی تجارت کے باعث ہی اس بحری راستے میں دلچسپی رکھتی تھیں۔

نظریے کی خامیاں

پروفیسر رچرڈ لیمن کے نظریے کی ایک اور بڑی خامی یہ ہے کہ اِس کی رُو سے کوئی فلاحی مملکت وجود میں نہیں آنی چاہیے۔ ظاہر ہے، وسائل پر قابض ایک فیصد طبقہ اپنی دولت عوام سے کیوں شیئر کرے گا؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سبھی ترقی یافتہ ممالک میں عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے جاری ہیں۔ کہیں کم ہیں اور

کہیں زیادہ، مگر ان کی موجودگی مسلّم ہے۔

مثال کے طور پر امریکا اور تمام یورپی ممالک کے سرکاری اسپتالوں میں علاج مفت ہے۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں طالب علم مفت پڑھتے ہیں۔ بے روزگار کو گزارہ الاؤنس ملتا ہے۔ حکومت سر چھپانے کو ٹھکانے بھی دیتی ہیں۔ عوام کو نجی و سرکاری ملازمتوں میں سہولیات و مراعات حاصل ہیں۔ پھر اِن ملکوں میں اچھے انتظام (گڈ گورننس) کا چلن بھی موجود ہے۔ گویا اِن ملکوں کا حکمران طبقہ عوام الناس کی خدمت کرتے ہوئے اپنا فرض بخوبی ادا کر رہا ہے۔

اِس سلسلے میں پروفیسر رچرڈ اور اُن کے ہم خیال دانش وروں کا دعویٰ ہے کہ دنیا بھر میں حکمران طبقات نے اپنا اقتدار بحال رکھنے کی خاطر فلاحی پروگرام شروع کیے۔ گویا یہ عمل اُن کی چال ہے۔ اُنھوں نے اپنی آمدن سے کچھ حصہ عوام کو دے دیا تاکہ وہ مطمئن رہے اور بغاوت نہ کرے۔

یہ نظریہ بھی مگر خصوصاً اسکینڈے نیوین ممالک کے معاملے میں ٹھس ہو جاتا ہے۔ سویڈن، ڈنمارک، ناروے اور فن لینڈ میں پچھلے کئی عشروں سے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے مرد و زن حکومت کر رہے ہیں۔ بعض وزرائے اعظم اور وزیر تو مزدوروں اور کسانوں کی اولاد

مدینہ، دنیا کی پہلی فلاحی ریاست

تھے۔ اسکینڈے یونین ہی نہیں دنیا کے دیگر ممالک میں بھی نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے حکمران بن چکے۔

فرش سے عرش پر

ان تمام نقائص کے باوجود پروفیسر رچرڈ لیکمن کا نظریہ کچھ نکات بھی رکھتا ہے۔ وطنِ عزیز ہی کی مثال لیجیے۔ قائداعظم کے بعد ہمیں بدقسمتی سے باصلاحیت، دوراندیش اور دیانتی حکمران میسر نہ آسکے۔ جو حکمران آئے، اُن کے ادوار میں پاکستان نے ترقی تو کی، مگر اتنی نہیں جتنی ہونی چاہیے تھی۔ چین، جنوبی کوریا، ملائیشیا، سنگاپور، تائیوان بھی پاکستان کے آگے پیچھے آزاد ہوئے۔ ان ملکوں کے حکمران طبقوں نے عمدہ سیاسی و معاشی پالیسیاں تشکیل دیں اور ملک و قوم کو ترقی یافتہ و خوش حال بنادیا۔

ہم ان کی اچھی نقل بھی نہ کرسکے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ 1950ء کے عشرے میں جنوبی کوریا اور ملائیشیا سے ماہرین پاکستان آئے تھے تاکہ یہاں کے عمدہ حکومتی ماڈل کا مطالعہ کرسکیں۔ وہ ہمارا ماڈل اپنا کر عرش پر پہنچ گئے۔ ذاتی مفادات، لالچ و ہوس اور انا کی جنگوں نے ہمیں نیچے گرادیا۔

پروفیسر رچرڈ نے اپنی کتاب میں ان یورپی قوتوں کا عروج و زوال بیان کیا ہے جو 1500ء سے 1950ء کے درمیان وجود میں آئیں۔ ان میں پرتگال، اسپین، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی، فرانس، بیلجیئم، اٹلی اور امریکا شامل ہیں۔ وہ اپنی تحقیق سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دنیا کے سبھی ممالک کا حکمران طبقہ گو بحری جہاز کے فرسٹ کلاس حصّوں میں سفر کر رہا ہے، مگر جہاز کو بالآخر ڈوب جانا ہے۔ گویا یہ کتاب دراصل اینٹی حکمران طبقے کی حیثیت رکھتی ہے جسے ''ایلیٹ'' اور ''اسٹیبلشمنٹ'' بھی کہا جاتا ہے۔

مسلمان اور قبائلی نشانے پر

تحقیق کرتے ہوئے پروفیسر رچرڈ لیکمن مگر ایک بڑی غلطی بھی کر گئے۔ اُنھوں نے یہ اہم نکتہ نمایاں نہیں کیا کہ 1500ء تا 1950ء کے دوران ہی یورپی حکومتوں کا خاص نشانہ عالمِ اسلام میں مسلمان اور شمالی امریکا، جنوبی امریکا، افریقا اور جزائر ملایا کے مقامی قبائل تھے۔ یورپی حکمرانوں نے مسلمانوں اور قبائلیوں کے ساتھ لرزہ خیز سلوک کیا اور ان کے وسائل لُوٹ کر اپنے ملکوں کو معاشی طاقت بنالیا۔

اندلس علوم و فنون کا مرکز تھا

اِسی طاقت کے سہارے پھر یورپی اپنا سیاسی و معاشی نظام دنیا کے اکثر ممالک پر ٹھونسنے میں کامیاب رہے۔

یہ نظام جمہوریت اور سرمایہ کاری کا ملغوبہ ہے۔ بعض ممالک میں سوشلزم کا بھی تڑکا لگا ہے۔ قدامت پسند مسلمانوں کے نزدیک اس سیاسی و معاشی نظام کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ اخلاقیات سے عاری ہے۔ یہ نظام صرف پیسہ کمانے پر زور دیتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ منافع پانا اس کا مطمحِ نظر ہے۔ اب تو اسی قسم کی آوازیں دورِ جدید میں اِس سیاسی و معاشی نظام کے گڑھ، امریکا سے بھی اُٹھ رہی ہیں۔

ہوتا، تو ہم اُسے سزا دیتے۔ اگر کسی کا پڑوسی بھوکا ہوتا، تو وہ اُسے کھانا کھلاتا تھا۔

کوئی کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا، تو سبھی اُس کی ہر ممکن مدد کرتے۔ تب امیر سے امیر تر بننے کی دوڑ عنقا تھی اور محبت و ہمدردی کا دور دَورہ تھا۔ آج کا امریکی معاشرہ مگر اِن اعلیٰ اقدار و روایات سے محروم ہو چکا۔''

قسطنطنیہ پر عرب حملہ

رہ جاتی ہے چنگیزی

طرزِ حکمرانی اور مذہب و اخلاقیات دراصل لازم و ملزوم ہیں۔ حکمران طبقے کو اخلاق و اصول پر چلانے کے لیے ہی انبیائے کرام علیہم السلام نازل فرمائے گئے۔ چنانچہ اُن کا آمروں اور بادشاہوں سے ٹکراؤ ہوا۔ حضرت ابراہیمؑ نے نمرود سے ٹکر لی۔ حضرت موسیٰؑ فرعون سے نبرد آزما ہوئے۔ حضرت عیسیٰؑ کا مقابلہ بنی اسرائیل کے مذہبی طبقے سے تھا جو آمر بن بیٹھا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سردارانِ قریش کی آمریت کے خلاف جہاد فرمایا۔ غرض انبیائے کرام علیہم السلام کی مساعی جمیلہ سے انسان نے شر پر قابو پا کر خیر کے راستے پر چلنا سیکھا، مگر جب بھی حکمران طبقے نے مذہب و اخلاقیات کو خیر باد کہا، تو وہ ذاتی مفادات کا اسیر بن کر عوام کی فلاح و بہبود سے بے پروا ہو گیا۔ اِسی لیے شاعرِ مشرق کہتے ہیں۔

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یعنی بادشاہ کا جاہ و جلال ہو یا جمہوریت کی گہما گہمی، اگر طرزِ حکومت میں دین اور اَخلاقیات شامل نہیں، تو پھر وہ ظلم و ستم ڈھانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

جناب طیب اعجاز قریشی نے ایک وڈیو بھجوائی جس میں امریکی عوام اور دانش ور سوال جواب کر رہے ہیں۔ ایک لڑکی نے سوال پوچھا: ''آپ کے خیال میں کیا خوبی امریکا کو عظیم بناتی ہے؟'' ایک دانش ور نے کہا کہ ہر کسی کو آگے بڑھنے کا موقع دینا۔ دوسرے نے کہا کہ یہاں ہر کسی کو آزادی میسر ہے۔ مگر تیسرے مقرر نے یہ کہہ کر سبھی کو ششدر کر دیا کہ امریکا اور عظیم؟ لڑکی کیا تم ہمیں پاگل سمجھتی ہو؟

اِس مقرر نے پھر بتایا کہ امریکا میں انفراسٹرکچر تباہ ہو چکا۔ لوگ بیروزگار ہو رہے ہیں۔ آمدن گھٹ رہی ہے۔ حکومت صرف جنگوں پر یا ایلیٹ طبقے کو سہارا دینے کے لیے ڈالر خرچ کرتی ہے۔ امریکا اسلحہ فروخت کرنے والے ممالک میں البتہ اوّل نمبر پر ہے۔ اِسی طرح اس کا جنگی بجٹ بھی سب سے زیادہ ہے۔ یہ حقائق سن کر امریکی عوام گم صم ہو جاتے ہیں۔

مقرر پھر دھیمے لہجے میں کہتا ہے: ''ہاں، کبھی ہم عظیم تھے۔ تب ہم مظلوم کی مدد کرتے تھے۔ اگر ظالم ہمارا بھائی بھی

پاکستان اور عالمِ اسلام کے بیشتر ممالک کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران طبقوں نے مغربی قوتوں کا وضع کردہ سیاسی و معاشی نظام اپناتے ہوئے اسلامی تعلیمات سے خاصی حد تک منہ موڑ لیا۔ حکمران طبقے کے بعض ارکان نام کے مسلمان رہ گئے، تو دیگر آدھا تیتر آدھا بٹیر بن بیٹھے۔ اسی دوئی کے باعث اسلامی ممالک کا حکمران طبقہ عوامی مسائل سے بے پرواہ ہو چکا اور اپنی پُرآسائش دنیا میں رہ رہا ہے۔ وہ امتِ مسلمہ کے معاملات حل کرانے نہیں، اپنے مفادات پورے کرنے کی خاطر سرگرم رہتا ہے۔

پہلی فلاحی مملکت

بدقسمتی سے یہ حکمران طبقہ اپنے عظیم الشان ماضی کو بھی فراموش کر چکا جب حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں دنیا کی پہلی فلاحی مملکت کا قیام عمل میں لائے تھے۔ قبل ازیں بھی عوام دوست حکمران مثلاً اشوک اعظم اور نوشیرواں عادل (خسرو اوّل) آ چکے تھے، مگر وہ بنیادی طور پر آمر تھے۔ اسی لیے فلاحی مملکت کی بنیاد نہیں ڈال سکے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے یہ اعزاز رحمت للعالمین ﷺ ہی کو عطا فرمایا تھا۔

مدینہ منورہ میں حکومت قائم کر کے حضور اکرم ﷺ نے امرا پر ایک خصوصی ٹیکس، زکوٰۃ لاگو کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ٹیکس سے حاصل شدہ رقم غریبوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو سکے۔ انسانی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ غریبوں کی بہتری کے لیے حکومت نے باقاعدہ ٹیکس متعارف کرایا۔ بدقسمتی سے خلفائے راشدین اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے بعد بیشتر مسلم حکمران مدینہ منورہ کی فلاحی ریاست کا نمونہ نہیں اپنا سکے۔ ان کے طرزِ حکمرانی میں دنیاوی نظریے بھی شامل ہو گئے۔ انھی کے باعث آخرکار امت مسلمہ زوال پزیر ہو گئی۔ اسلامی تعلیمات سے منہ موڑ کر وہ سپر پاور رہنے کا حق کھو بیٹھی۔

بیشتر مسلم حکمرانوں کے طرزِ حکمرانی میں مگر اسلامی تعلیمات کے اثرات دکھائی ضرور دیتے ہیں۔ انھی نے انھیں ماضی کے حکمرانوں سے ممتاز اور منفرد بنا دیا۔ مثال کے طور پر نبی کریم ﷺ نے جنگی اصول امت کو عطا فرمائے۔ ان کی رو سے نہتے، بوڑھے، عورتیں و بچے اور عبادت گاہوں میں

صلیبی فوج نے قسطنطنیہ جلا ڈالا

موجود مرد و زن قتل سے مبرا قرار پائے۔ اسی طرح بستیوں کو تباہ و برباد کرنا بھی ممنوع قرار دیا گیا۔

اسلامی فوج نے خلافت راشدہ میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو ایک مفتوح گاؤں بھی صفحہ ہستی سے نہیں مٹایا۔ جس بستی کے مکین ہتھیار ڈال دیتے، انھیں امان مل جاتی۔ تب ان کی حفاظت کا ذمہ اسلامی فوج اپنے سر لے لیتی۔ چشم فلک نے ماضی میں کیا ایسا انوکھا منظر دیکھا تھا؟ مسلمان سپہ سالار ہر بستی فتح کر کے کسی مقامی سردار ہی کو نیا حکمران بنا دیتے۔ وہ پھر

اسلامی ریاست کے باج گزار کی حیثیت سے وہاں کا انتظام سنبھال لیتا۔

استعمار سے دوری

اسلامی تعلیمات کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے ہی مسلم حکمران ''استعماریت'' یا ''نوآبادیت'' (Colonism) سے بھی دور رہے۔ یہ وہ طرز حکومت ہے جب فاتح مفتوح علاقے پر نہ صرف قبضہ کر لے بلکہ وہاں کے وسائل منظم طریقے سے لوٹ کر اپنے دیس لے جائے۔ درحقیقت ماضی میں استعماریت کی مثالیں کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔ تقریباً سبھی حملہ آور ایک علاقے میں لوٹ مار کر کے واپس اپنے وطن لوٹ جاتے تھے۔

مسلمانوں نے نہ صرف استعماریت سے اجتناب برتا

مسالے سونے سے بھی زیادہ قیمتی بن گئے

بلکہ حکومت کرنے کا ایک نیا طریق بنی نوع انسان کو دے ڈالا۔ یہ کہ جب اسلامی لشکر کوئی نیا علاقہ فتح کرتا تو بہت سے مسلمان پھر وہیں بس جاتے۔ وہ پھر اس علاقے کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کرتے اور اکثر علاقے کو معاشی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے دنیا کا ایک اہم مرکز بنا دیتے۔ اسی عمل سے کئی عظیم الشان شہر اور ریاستیں وجود میں آئیں۔ سمرقند و بخارا اور دہلی سے لے کر قرطبہ، غرناطہ اور ٹمبکٹو تک ان کی طویل فہرست ہے۔

جب مسلمانوں نے اسپین یا اندلس میں قدم دھرے تو وہاں اجڈ اور وحشی بستے تھے۔ مسلمانوں نے اپنے فکر و عمل سے اس علاقے کو سائنس و ٹیکنالوجی، فلسفہ، فنون لطیفہ اور تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز بنا دیا۔ جب قرون وسطیٰ میں یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا تو بغداد، دمشق اور اندلسی شہر علوم و فنون کی روشنی سے منور تھے۔

وائے افسوس، جب آپس میں عدم اتفاق، مادہ پرستی اور عیش پسندی کے سبب امت مسلمہ زوال پذیر ہونے لگی۔ حکمرانوں نے اسلامی تعلیمات سے منہ موڑ لیا اور دنیاوی خواہشات اختیار کرنے لگے تو تبھی ان پر چنگیز خان عذاب الٰہی کا کوڑا بن کر نمودار ہوا۔ مسلمان حکمران تب بھی خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے۔ ان کی بے عملی، خانہ جنگیوں اور انتشار نے آخر کئی علاقوں میں مسلم اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ ان میں اندلس بھی شامل تھا۔ مسلم اندلس کا زوال اس لحاظ سے تاریخ انسانی میں اہم حیثیت رکھتا ہے کہ اسی کے بطن سے دور استعماریت نے جنم لیا۔

استعمار کا طریق واردات

ماہِ رواں میں اہلِ وطن آزادی کی 73 ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے تہتر برس قبل پاکستان کو ترقی یافتہ اور خوش حال ملک بنانے کا خواب دیکھا تھا، مگر وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ راہِ حق پر چلنے میں ناکام رہا اور اس ناکامی کی اہم وجہ یہ کہ اُس

نے آزادی کے بعد انگریز آقاؤں ہی کے وضع کردہ سیاسی و معاشی نظام کو اپنا لیا جس میں اخلاقیات بہت کم ہے، چنگیزیت زیادہ۔

سوال یہ ہے کہ یورپی طاقتیں اپنے سیاسی و معاشی نظام کو مسلم حکمران طبقات پر ٹھونسنے میں کیونکر کامیاب ہوئیں؟ اُن کا طریقِ واردات کس قسم کا تھا؟ اِس سوال کا جواب ایک طویل داستان میں پوشیدہ ہے۔ یہ داستان ایک طرف تو الف لیلیٰ کے مانند دلچسپ وطلسماتی ہے اور دوسری طرف اپنے اندر سبق آموز باتیں بھی سموئے ہوئے ہے۔ پاکستانی نوجوان نسل کو خصوصاً معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان کا سیاسی، معاشی و معاشرتی نظام جن تضادات اور تناقصوں کا شکار ہے، اُنھوں نے کیوں جنم لیا۔

آگے بڑھنے سے پیشتر یورپ کی مختصر تاریخ بیان ہو جائے۔ سلطنتِ روما یورپ کی پہلی بڑی ایمپائر تھی جس کا قیام 27 قبل مسیح میں آیا۔ یہ یورپ، افریقا اور مغربی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کے دو بڑے حصّے تھے: مغربی اور مشرقی۔ 480ء میں جرمنوں نے مغربی سلطنت روما کا خاتمہ کر دیا۔ مشرقی سلطنت روما 1453ء تک برقرار رہی۔ ترک سلطان، محمد فاتح نے اس کا خاتمہ کیا۔ اس کو بازنطینی سلطنت بھی کہتے ہیں۔

315ء کے لگ بھگ رومی شہنشاہ، قسطنطینِ اعظم نے عیسائیت کو بطورِ مذہب تسلیم کر لیا۔ یہ بت پرست تھا۔ اُس نے نیا مذہب عوام میں مقبول بنانے کی خاطر عیسائیت میں بت پرستی کے عقائد بھی داخل کر دیے۔ مثلاً معبدوں کی طرح عبادت گاہیں بنائیں جنھیں چرچ کا نام دیا۔ ان چرچوں میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے مجسمے رکھ دیے۔ عیسائی بزرگوں (Saints) کے مجسمے اور تصاویر بھی رکھی گئیں۔ قسطنطین سورج دیوتا (اپالو) کا پرستار تھا۔ لہٰذا اُس نے عیسائی بزرگوں کی ایسی تصاویر بنوائیں جن کے پیچھے سے سورج کی کرنیں نکلتی دکھائی دیتی ہیں۔

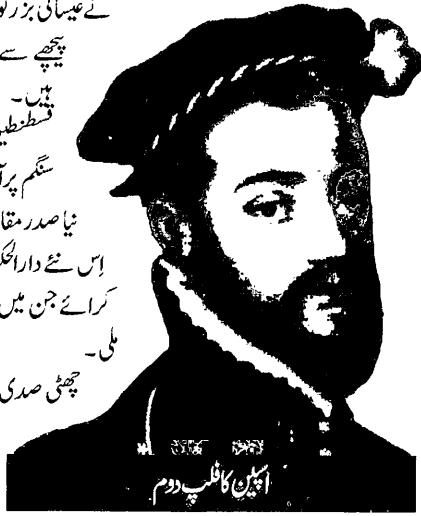

اسپین کا فلپ دوم

قسطنطینِ اعظم ہی نے ایشیا اور یورپ کے سنگم پر آباد ایک چھوٹی سی بستی، بازنطیم کو اپنا نیا صدر مقام بنایا اور اُسے قسطنطنیہ کا نام دیا۔ اِس نئے دارالحکومت میں بادشاہ نے کئی چرچ تعمیر کرائے جن میں آیا صوفیہ کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔

چھٹی صدی عیسوی میں اسلام کا نور جگمگایا۔ عرب مجاہدین نے بازنطینی سلطنت کے علاقے عراق، شام اور مصر فتح کر لیے۔ رفتہ رفتہ افریقا کے سبھی علاقے اسلامی سلطنت کا حصّہ بن گئے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا، مگر اس کا دفاع بہت مضبوط تھا۔ مسلمان کامیاب نہ ہو سکے۔

جنگ ملازکرد

بازنطینی سلطنت اور مسلمانوں کے مابین جب امن رہتا، تو ان کے مابین تجارت جاری ہو جاتی۔ اب شاہراہِ ریشم کا آخری پڑاؤ قسطنطنیہ بن گیا۔ جزائر ملایا، چین اور ہندوستان سے جو ایشیائی تاجر لاتے، وہ قسطنطنیہ میں یورپی تاجروں کو

فروخت کر دیتے۔ اِس طرح قدیم تجارت کسی نہ کسی صورت جاری رہی۔

مسلمانوں نے 711ء میں اسپین اور پُرتگال فتح کر لیے۔ وہ پھر فرانس کی سمت بڑھے، مگر دشوار گزار پہاڑی راستوں نے راہ روک لی۔ 1071ء میں جنگِ ملازکرد کے ذریعے ترکی کا ایشیائی حصّہ (اناطولیہ) بھی اسلامی علاقوں میں شامل ہو گیا۔ یہ جنگ انقلابی سمجھی جاتی ہے، کیونکہ اس نے دنیائے عیسائیت میں ہلچل مچادی۔

دراصل بازنطینی سلطنت میں عیسائیت کی ایک مختلف قسم

برطانیہ کی ملکہ الزبتھ اوّل

''مشرقی عیسائیت'' نے نشوونما پائی جسے ایسٹرن آرتھوڈوکس چرچ بھی کہتے ہیں۔ یہ مشرقی عیسائیت مغربی سلطنت روما میں پروان چڑھنے والی رومن کیتھولک عیسائیت سے مذہبی و سیاسی اختلاف رکھتی تھی۔ اِس کا مذہبی مرکز قسطنطنیہ میں آیا صوفیہ چرچ تھا۔

مشرقی اور رومن کیتھولک عیسائیت کے درمیان سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ اوّل الذکر کے بطریقوں یا پادریوں نے

یورپ کی حاکمیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ رفتہ رفتہ متفرق مذہبی مسائل نے بھی جنم لیا۔ یوں دونوں علاقوں کے عیسائی ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ مشرقی سلطنت روما کے عیسائی مغربی یورپ میں آباد عیسائیوں کو اُجڈ، وحشی اور بدتہذیب سمجھتے تھے۔ اِس طرزِ فکر نے بھی دونوں حصّوں میں بسنے والے عیسائیوں کے مابین کچھ حد تک دشمنی و نفرت پیدا کر دی۔

اناطولیہ پر مسلمانوں کے قبضے نے مگر کم از کم بازنطینی حکمران طبقے اور مغربی یورپ کے حکمرانوں کو یکجا کر دیا۔ تب تک مغربی یورپ میں جرمن، فرانسیسی اور برطانوی اپنی آزاد ریاستیں قائم کر چکے تھے۔ اِن ریاستوں کے مذہبی و سیاسی معاملات میں پوپ کا بھی کافی اثر و رسوخ تھا۔ تب سبھی عیسائیوں کو احساس ہوا کہ اگر اسلامی لشکر نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا، تو اِس کے لیے یورپ میں داخلے کی راہ نکل آئے گی۔ یوں مغربی یورپ کے حکمران طبقے کو اقتدار اپنے ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہوا۔ پوپ بھی خوف محسوس کرنے لگا۔ اِسی خوف نے مذہبی و سیاسی اختلافات پسِ پشت ڈال کر سبھی عیسائی حکمرانوں کو مسلم خطرے کے خلاف متحد کر دیا اور اِسی اتحاد کے بطن سے صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا جو 1096ء سے 1271ء تک جاری رہیں۔ اِن جنگوں کا بظاہر مقصد یروشلم کو اسلامی قبضے سے آزاد کرانا تھا۔

صلیبی فوج کا حملہ

اُس زمانے میں بازنطینی سلطنت یونان، بلغاریہ اور ترکی کے یورپی حصّے تک محدود ہو گئی تھی۔ اس سلطنت میں یونانی تہذیب و تمدن اور زبان کا غلبہ تھا۔ پہلی صلیبی جنگ ہی ساکنانِ سلطنت کے لیے تلخ تجربہ بن گیا۔ ہوا یہ کہ صلیبی فوج

میں بھانت بھانت کے فوجی شامل تھے جن میں تنظیم کی کمی تھی۔ ہجوم کی شکل پا کر وہ خودسر بن گئے۔ چنانچہ جہاں سے گزرتے، لُوٹ مار شروع کر دیتے۔ اناطولیہ جاتے ہوئے صلیبی فوج بازنطینی علاقوں سے گزری، تو وہاں بھی کسانوں اور تاجروں کو لُوٹ لیا۔ اس رویّے نے بازنطینی عوام میں صلیبی فوجیوں کے لیے نفرت پیدا کر دی۔

یہی وجہ ہے، آنے والی صلیبی جنگوں میں بازنطینی فوج نے بہت تھوڑا کردار ادا کیا، بلکہ بعض بازنطینی جنگی سرداروں نے صلاح الدین ایوبیؒ سے خفیہ طور پر معاہدۂ دوستی کر لیا۔ جب مغربی یورپی حکمرانوں کو یہ بات معلوم ہوئی، تو اُنھیں بہت غصّہ آیا۔ وہ پھر بازنطینی حکمرانوں کو مذہب عیسائیت کا غدار کہنے لگے۔

صلیبی جنگیں مغربی یورپی جنگی سرداروں اور نوابوں کے لیے کمائی کا ذریعہ بن گئیں۔ دراصل ان جنگوں سے صلیبی فوج کو مسلمان علاقے لُوٹ کر کثیر سونا، چاندی اور دیگر سامان ملتا تھا۔ لہٰذا فرانس، جرمنی، برطانیہ اور دیگر علاقوں کے جنگی سردار اور نواب ہر صلیبی فوج میں اپنا لشکر داخل کر دیتے تاکہ وہ مسلم آبادیاں تخت و تاراج کر کے قیمتی سامان لا سکے۔

جب چوتھی صلیبی جنگ کا موقع آیا، تو لشکر جمع کرتے ہوئے سرمائے کی کمی آڑے آ گئی۔ تبھی طے پایا کہ دنیائے عیسائیت کے امیر ترین شہر، قسطنطنیہ پر حملہ کر دیا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ بازنطینی حکمرانوں نے شہر کے چرچوں میں ہیرے جواہرات اور سونا چاندی دیواروں، دروازوں اور تصاویر پر جڑاؤ کر رکھا تھا۔ شہر پر حملے سے ''غدار'' بازنطینی حکمرانوں اور شہریوں کو سبق سکھانا بھی مقصود تھا۔

چنانچہ 8/اپریل 1204ء کو یروشلم جاتے ہوئے چوتھے صلیبی لشکر نے قسطنطنیہ پر دھاوا بول دیا۔ اہلِ شہر اِس حملے کے لیے تیار نہیں تھے، صلیبیوں نے باآسانی قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں پھر تین دن تک قتل و غارت اور لُوٹ مار کا ماحول رہا۔ عیسائی مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایسی تباہی و بربادی شہر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ صلیبیوں نے آیا صوفیہ کو بھی نہ بخشا۔ اس کے چپے چپے سے قیمتی پتھر اور سونا چاندی اتار لیا۔ پھر شراب کے نشے میں مخمور صلیبیوں نے وہاں طوائفوں کا ناچ دیکھا۔

اپنے وقت کا امیر ترین تاجر تھامس اسمتھ

اندلس میں پسپائی

صلیبی جنگوں کے بطن سے ایک اور انقلابی تبدیلی نے جنم لیا۔ ہوا یہ کہ یورپ نے اسپین (اندلس) میں جاری ہسپانوی مسلم جنگ کو مذہبی قرار دے ڈالا۔ اس نے پھر تمام مغربی یورپیوں پر زور دیا کہ وہ اسپین جا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑیں۔ پوپ کی کوششوں سے اسپین میں متحارب عیسائی ریاستوں نے بھی اتحاد کر لیا۔ پوپ کی کوششیں رنگ

لائیں اور اسپین میں مسلمان پسپا ہونے لگے۔ اس کا آغاز 16 جولائی 1212ء کو لڑے گئے ''معرکۃ العقاب'' سے ہوا۔ اس دن عیسائیوں کی متحدہ فوج نے اسلامی لشکر کو شکست دی۔ یوں اندلس میں مسلمانوں کے زوال کا آغاز ہو گیا۔

1300ء کے بعد اسپین اور پرتگال کے عیسائی حکمرانوں کی افواج اندلسی شہر مسلمانوں سے چھیننے کے لیے حملے کرنے

جوہان وان اولڈن

لگیں۔ 1340ء میں انھوں نے معرکہ طریف میں مسلمانوں کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ اسی سے عیسائی حکمرانوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ وہ پھر پرتگال و اسپین سے نکل کر اسلامی علاقوں پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔

استعمار کی ابتدا

بحر اوقیانوس میں ساحل مراکش کے نزدیک جزائر کناری واقع ہیں۔ 1341ء میں پرتگالی بادشاہ، الفانسو پنجم نے ان جزائر کا جائزہ لینے کے لیے تین بحری جنگی جہازوں پر مشتمل ایک مہم بھجوائی۔ عمرانیات و تاریخ کے ماہرین اس مہم کو ''استعماریت کی ابتدا'' قرار دیتے ہیں۔ گویا پرتگالی قوم نے

استعمار کی بنیاد رکھی..... ایک مغربی عفریت جو بعد ازاں پل بڑھ کر دنیا کے کئی علاقوں کو نگل گیا۔

لیکن کم ہی ہم وطن جانتے ہیں کہ استعماریت کو پھلنے پھولنے میں کیتھولک کلیسا نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ہوا یہ کہ 1344ء میں ایک ہسپانوی شہزادے، لوئیس ڈی لاسرڈا نے پوپ کلیمنٹ پنجم کو یہ عرضی بھجوائی کہ اُسے جزائر کناری فتح کرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ جزائر میں اپنی حکومت قائم کر کے مقامی آبادی کو عیسائی بنانا چاہتا تھا۔ پوپ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے شہزادہ لوئیس کو حملہ کرنے کی اجازت دے دی۔ تاہم پرتگالی بادشاہ، الفانسو پنجم نے حملے پر اعتراض کیا۔ وہ جزائر کناری کو اپنی سلطنت میں شامل سمجھتا تھا۔ شہزادہ لوئیس جنگ کی تیاری کر رہا تھا کہ اوپر سے اس کا بلاوا چلا آیا۔ چنانچہ حملہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

اس کے بعد پرتگال اور اسپین کے مقامی سردار وقتاً فوقتاً جزائر کناری پر حملے کرتے رہے۔ یہ مگر خالصتاً معاشی رہے کیونکہ انھیں معلوم ہو گیا کہ جزائر میں مسلمان نہیں غیر مسلم بستے ہیں۔ عیسائی فوج مقامی آبادی کو شکست دے کر تندرست مرد و زن غلام بنا ساتھ لے جاتی۔ یہ بے چارے غلام پھر پرتگالی اور ہسپانوی امرا کے محلات میں چاکری کرتے۔ ان پر ظلم و ستم بھی ڈھایا جاتا۔ گویا پرتگالی اور ہسپانوی اقوام نے غلامی کے مکروہ دھندے کو بھی بڑھاوا دیا اور اُسے منظم تجارت بننے میں مدد دی۔

جزائر کناری کی معاشی اہمیت دیکھ کر پرتگالی اور ہسپانوی حکمران، دونوں اس پر اپنا حق جتانے لگے۔ یوں یہ جزائر متنازع حیثیت اختیار کر گئے۔ اس زمانے میں پوپ دنیائے عیسائیت میں سیاسی طاقت رکھتا تھا۔ اسی لیے دونوں قوتوں نے پوپ سے رجوع کیا۔ مختلف پوپ متحارب یورپی طاقتوں

کے مابین تصفیہ کرانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے پرتگال اور اسپین کے مابین علاقے تقسیم کر دیے۔ تاہم جزائر کناری کا تنازع حل نہیں ہو سکا۔

پاپائیت کے انوکھے حکم

قابل ذکر بات یہ کہ 1400ء سے 1500ء کے دوران پاپائیت نے پرتگالی اور ہسپانوی حکمرانوں کو دو عمل اپنانے کی اجازت دے دی۔ اول یہ کہ وہ دنیا کے کسی بھی علاقے پر حملہ کر کے وہاں کی آبادی کو زبردستی عیسائی بنا لیں۔ دوم یہ کہ جو مقامی باشندہ بزور عیسائیت قبول نہ کرے، اسے غلام بنا لیا جائے۔ یقیناً انسانی تاریخ میں کسی اور مذہب کے پیشواؤں نے اتنے غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر انسانی احکامات جاری نہیں کیے ہوں گے۔ یہ احکامات اسی لیے دیے گئے تاکہ یورپی حکمران دنیا پر قبضہ کر کے معاشی، مذہبی اور سیاسی مفادات پورے کر سکیں۔

نومبر 1491ء میں ہسپانوی فوج نے اندلس میں مسلمانوں کے آخری مرکز، غرناطہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ یوں سارا اسپین عیسائی حکمرانوں کے قبضے میں آ گیا۔ ہسپانوی حکمران، فرڈیننڈ کے حکم پر تمام مساجد گرجا گھر بنا لی گئیں۔ تب لاکھوں مسلمان اسپین میں مقیم تھے۔ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ عیسائی ہو جائیں۔ کئی مسلمان راتوں رات افریقا چلے گئے۔ جو کسی مجبوری کے باعث نہ جا سکے تو انھیں عیسائی بننا پڑا۔ ہسپانوی حکومت نے انھیں ''مورسیکو'' کا نام دیا۔

مسالے کیوں مہنگے ہوئے؟

قبل ازیں مسالوں کی تجارت کا ذکر ہو چکا۔ اب یہ جانیے کہ لندن اور دیگر یورپی شہروں میں مسالے کیوں مہنگے ہوئے۔

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز

ماضی میں شاہراہ ریشم کے راستے ''انڈیز'' (انڈونیشیا، ملایا، چین، ہندوستان، ایران وغیرہ) سے مسالے، کپڑے، اجناس، برتن وغیرہ یورپ پہنچتے تھے۔ بیشتر بحری تجارت عرب تاجروں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ انڈیز سے مال قسطنطنیہ (استنبول) تک لاتے اور پھر وہاں یورپی تاجروں کو فروخت کر دیتے۔

عرب تاجروں نے سختی سے یہ خیال رکھا تھا کہ کسی یورپی کو انڈونیشیا اور ملایا پہنچنے کا بحری راستہ معلوم نہ ہو سکے۔ ظاہر ہے، اِس صورت میں یورپی تاجر بھی وہاں پہنچنے لگتے اور ان کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔ یہ تھے حالات جب 1453ء میں ترک عثمانی سلطان، محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر لیا۔ اب ایشیا اور یورپ کے سنگم پر آباد جغرافیائی لحاظ سے یہ اہم شہر سلطنتِ

عثمانیہ میں شامل ہو گیا۔ عثمانی ترکوں نے جلد ہی اُسے اپنا دارالحکومت بنالیا۔

ماضی میں قسطنطنیہ کے بازنطینی حکمران یورپی ممالک کے باج گزار بن چکے تھے۔ اس لیے وہ یورپ سے آنے جانے والے قافلوں پر ٹیکسوں کی بہت کم شرح عائد کرتے، مگر جب عثمانی ترکوں نے حکومت سنبھالی، تو انھوں نے قدرتاً شرح بڑھادی۔ ٹیکس بڑھنے سے یورپی تاجروں کو بھی مال کی قیمت بڑھانا پڑی۔ خاص طور پر بعض مسالے مثلاً کالی مرچ، جائفل، لونگ اور دارچینی وغیرہ اتنے مہنگے ہو گئے کہ یورپی ممالک میں صرف امرا ہی اُنھیں خرید پاتے۔

رفتہ رفتہ یورپی منڈیوں میں مسالوں کی مانگ بڑھ گئی اور وہ قیمتی سامان شمار ہونے لگے۔ تبھی یورپی ممالک میں اس خیال نے جنم لیا کہ ایشیائی ممالک جانے کا کوئی اور ارضی یا بحری راستہ تلاش کیا جائے تاکہ مسالے وہاں سے لائے جائیں، چنانچہ یورپی ممالک سے نجی و سرکاری سطح پر مہم جو یانہ ٹیمیں نئے تجارتی راستوں کی کھوج میں نکل پڑیں مگر یہ کھوج معاشی پہلو کے ساتھ ساتھ مذہبی پہلو بھی رکھتی تھی جس کا تعلق اسلام اور عیسائیت کی کشمکش سے تھا۔

بحری راستوں کی کھوج

اندلس کی مسلم ریاستیں کثیر مال و دولت رکھتی تھیں۔ انھیں پاکر اسپین اور پرتگال کے عیسائی حکمران بھی امیر کبیر ہو گئے۔ مال پاکر اب وہ اپنے مذہبی و معاشی مفادات پورے کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے افریقی ساحلوں کی سمت چھوٹے بحری بیڑے بھجوائے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ مسلم ساحلی علاقوں میں لوٹ مار کر سکیں۔ ساتھ ساتھ ''انڈیز'' (ہندوستان، چین اور جزائر ملایا) کا نیا بحری راستہ تلاش کرنے کے لیے مہمات روانہ ہوئیں۔

1492ء میں اطالوی مہم جو کرسٹوفر کولمبس ہسپانوی حکومت کے خرچ پر بحری بیڑا لیے نکلا تاکہ ہندوستان کی سمندری راہ ڈھونڈ سکے۔ وہ شمالی امریکا جا پہنچا۔ یوں دو نئے براعظم، شمالی اور جنوبی امریکا دریافت

ایسٹ انڈیا کمپنی کا نشان

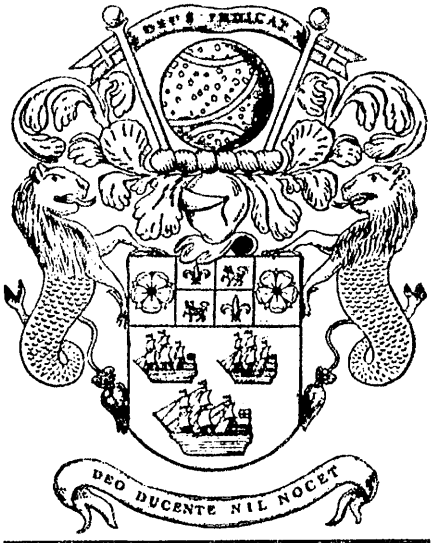

ہوئے۔ 1498ء میں آخر پرتگالی واسکوڈی گاما جنوبی افریقا کے نیچے سے گزر کر کالی کٹ، ہندوستان پہنچنے میں کامیاب رہا۔ 1513ء میں ایک اور پرتگالی، جارج الوازچین جا پہنچا۔ یوں محض بیس بائیس برس میں یورپی طاقتوں نے نت نئے بحری راستے تلاش کر لیے اور وہ تین براعظموں تک پہنچنے میں کامیاب رہیں۔

پرتگالی اور ہسپانوی بحری جہاز توپوں سے لیس تھے۔ پھر ان پر سوار فوجی بندوقیں رکھتے تھے۔ اس لیے جنوبی امریکا، افریقا اور جزائر ملایا کے ساحلی باشندے اُن کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ جلد ہی دونوں قوتوں نے اِن علاقوں میں اپنی

مستقل بستیاں قائم کر لیں جنہیں ''نوآبادی'' یا ''کالونی'' کہا گیا۔ انھی بستیوں کے ذریعے استعماریت کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔

استعماری قوتوں نے اپنی نوآبادیوں میں وسیع وعریض فارم قائم کیے جہاں مسالوں اور اجناس کی پیداوار ہونے لگی۔ ان میں کام کرنے کی خاطر غلاموں کی خرید وفروخت شروع ہوئی۔ اس طرح پُرتگالی اور ہسپانوی نوآبادیوں سے قدرتی وسائل لُوٹ کر اپنے ملک لے جانے لگے۔ اُنھوں نے مقامی آبادی سے بالعموم ظالمانہ سلوک کیا۔ عورتیں اور بچے تک غلام بنا لیے جاتے۔ کوئی بغاوت کرتا، تو اُسے اذیت ناک سزا دی جاتی۔

جنوبی امریکا میں مقامی قبائل زبردستی عیسائی بنا لیے گئے۔ شمالی امریکا میں ریڈ انڈینز کی بستیاں اُنھوں نے جلا کر راکھ کر دیں۔ غرض لالچ وہوس میں پُرتگالی وہسپانوی اقوام نے ایک عفریت کا روپ اختیار کرلیا۔

دلچسپ بات یہ کہ بعض یورپی طاقتوں مثلاً برطانیہ اور فرانس نے پاپائیت کے وہ فرمان ماننے سے انکار کر دیا جن کے ذریعے دنیا دو

استعماری قوتوں، اسپین اور پرتگال کے مابین تقسیم کر دی گئی تھی۔ دراصل یہ قوتیں بھی بحری افواج رکھتی تھیں اور تجارت کا طویل تجربہ بھی۔ اسی لیے وہ بھی معاشی فوائد پانے کے لیے بحری اسفار اختیار کرنے لگیں۔ اس پر ہسپانوی اور پرتگالی حکمرانوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور مخالف یورپی قوتوں پر مختلف پابندیاں عائد کر دیں۔ یوں دونوں دھڑوں کے

واسکوڈی گاما

درمیان ٹکراؤ کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ اس تصادم کو مذہبی اختلافات نے مزید بڑھاوا دیا۔

جنوری 1556ء میں ہسپانوی بادشاہ، فلپ دوم تخت نشین ہوا۔ یہ اگلے بیالیس سال تک حکومت کرتا رہا۔ اس کا دور سیاسی و مذہبی لحاظ سے انتہائی ہنگامہ خیز رہا۔ یہ دراصل اپنے آپ کو کیتھولک عیسائیت کا چیمپئن سمجھتا تھا۔ اس لیے وہ جرمنی میں ابھرنے والی پروٹسٹنٹ تحریک کا سخت مخالف بن گیا جس کا نشانہ کلیسا اور پاپائیت تھی۔ اس مخالفت کے باعث

اگلی ایک صدی تک یورپ مذہبی جنگوں کا نشانہ بنا رہا۔

جب فلپ دوم بادشاہ بنا تو اس کی سلطنت اسپین، برطانیہ، اٹلی، ہالینڈ، بیلجیم اور فلپائن تک پھیلی ہوئی تھی۔ باہمی شادیوں نے کئی یورپی ریاستوں کو اس سلطنت میں شامل کر ڈالا تھا۔ مثلاً فلپ دوم نے برطانیہ کی ملکہ میری سے 1554ء میں شادی کر لی۔ چنانچہ برطانیہ بھی اس کی ریاست کا حصّہ بن گیا۔

1555ء میں پوپ پال چہارم کا دور شروع ہوا۔ یہ پوپ ہسپانوی سلطنت کا مخالف تھا۔ اس کا اقتدار ختم کرنے کی خاطر فلپ دوم نے 1556ء میں اٹلی پر حملہ کر دیا۔ پوپ پال چہارم نے معافی مانگ کر اپنی پاپائیت بچائی۔ 1562ء سے فرانس میں کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ فلپ دوم نے کیتھولک فوج کی مدد کے لیے کمک بھجوائی۔

جنگوں نے ہسپانوی حکومت کو بنیوں کا مقروض بنا دیا۔ آمدن بڑھانے کے لیے حکومت نے ٹیکسوں کی شرح بڑھا دی۔ اس بڑھوتری نے ہالینڈ میں بے چینی کو جنم دیا۔ ولندیزی ہسپانوی حکمرانوں سے ناخوش تھے۔ چنانچہ 1568ء میں انھوں نے اسپین کے خلاف بغاوت کر دی۔ فلپ دوم نے ہسپانوی فوج بھجوا کر سختی سے بغاوت کو کچل دیا۔ کئی ولندیزی باغی مارے گئے۔ مگر ولندیزی اسے بغاوت نہیں تحریک آزادی کہتے ہیں جو طویل عرصہ جاری رہی۔

ہسپانوی فوج اور ولندیزی باغیوں کے مابین جنگ میں اول الذکر نے علاقے کے کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ان میں آنترپ بھی شامل تھا۔ یہ تب یورپ میں مالیات کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ فلپ دوم نے شہر میں مقیم سبھی کیتھولکوں اور یہود کو

حکم دیا کہ وہ دو سال کے اندر اندر ہجرت کر جائیں۔ آنترپ کے اکثر یہود بینے، ساہوکار یا تاجر تھے۔ وہ سبھی ایمسٹرڈیم چلے گئے۔ یوں رفتہ رفتہ ہالینڈ کا یہ گمنام سا شہر یورپ کا نیا مالیاتی مرکز بن گیا۔

برطانیہ میں نئی ملکہ

1558ء میں ملکہ میری چل بسی۔ اب فلپ دوم برطانیہ آئیرلینڈ اور فرانس کا بادشاہ نہیں رہا۔ ملکہ میری کی جگہ الزبتھ اول تخت نشین ہوئی۔ اس نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس لیے فلپ دوم نئی ملکہ کے خلاف ہو گیا۔ وہ اُسے ہٹانے کے لیے تدابیر اختیار کرنے لگا۔ اُدھر ملکہ الزبتھ ہالینڈ اور فرانس میں پروٹسٹنٹوں کو سرمایہ و ہتھیار فراہم کرنے لگی تاکہ وہ ہسپانوی حکومت کو شکست دے سکیں۔ 1580ء میں فلپ دوم پرتگال کا بادشاہ بھی بن گیا۔ اس کی طاقت مزید بڑھ گئی۔

1588ء میں فلپ دوم نے برطانیہ پر حملہ کر دیا۔ اس نے ایک سو تیس بحری جہازوں پر مشتمل ایک زبردست بحری بیڑا بھجوایا تاکہ وہ برطانوی بحریہ کو تہس نہس کر دے مگر سمندری طوفانوں نے اس بحری بیڑے کو بہت نقصان پہنچایا اور کئی جہاز تباہ کر دیے۔ تاریخ میں یہ بیڑا ''ہسپانوی آرمیدا'' کہلاتا ہے۔ بچے کھچے جہاز برطانوی بیڑے کا مقابلہ نہیں کر پائے اور انھیں پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ یوں برطانیہ پر اسپین کا حملہ ناکام ہو گیا۔

اسپین اور برطانیہ کی اس بحری جنگ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اگر ہسپانوی فوج برطانوی ساحل پر لنگر انداز ہو جاتی تو برطانیہ پر اس کا قبضہ یقینی تھا۔ یوں تاریخ کا دھارا ہی

بدل جاتا۔ برطانوی حکمران آگے چل کر اپنی استعماری سلطنت تشکیل نہیں دے پاتے جو سنگاپور سے لے کر افریقا اور امریکا تک پھیلی ہوئی تھی۔ طاقتور ہسپانوی فوج کو شکست دے کر برطانوی افواج کے حوصلے بلند ہو گئے۔ وہاں کے پروٹسٹنٹ حکمرانوں کو یقین ہو گیا کہ خدا ان کے ساتھ ہے۔ وہ کیتھولک عیسائیوں کو شکست دے گا۔ بحیرہ روم میں بھی ہسپانوی بحری فوج کو عثمانی ترکوں نے پے در پے شکستیں دیں۔ دراصل اس زمانے میں سلیمان اعظم کا طوطی بول رہا تھا۔ انھوں نے بحیرہ روم میں عثمانی ترک بحری فوج کے باصلاحیت اور جری کمانڈر مقرر کیے۔ ان میں خیر الدین بار بروسہ اور پیالہ پاشا افسانوی شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کئی بحری لڑائیوں میں ہسپانوی فوج کو عبرت ناک شکست دی۔ ان شکستوں کے باعث ہسپانوی بحری فوج کو بہت ضعف پہنچا اور وہ سمندروں میں اپنی بالادستی کھو بیٹھی۔

حاجیوں کا جلتا جہاز

مغربی یورپ کا امیر تاجر

سمندروں میں جنگوں کا زور کم ہوا، تو برطانیہ کے تاجروں میں مسالوں کی تجارت کرنے کی تمنا نے سر اُٹھایا۔ وہ تب بہ لحاظ آبادی سب سے بڑا یورپی ملک تھا۔ فرانس ڈریک نے ان کے لیے تجارتی راہ کھول دی تھی۔ مسئلہ مگر یہ تھا کہ کوئی بھی تاجر تن تنہا تجارت کرنے کو تیار نہ تھا، کیونکہ اس میں خطرات بہت تھے۔ کبھی جہاز طوفان میں آ کر ڈوب جاتا، کبھی دشمن ہسپانوی یا پُرتگالی فوج حملہ آور ہو کر سامانِ تجارت پر قبضہ کر لیتی۔ کبھی بحری جہاز کی حفاظت پر مامور کرائے کے فوجی ہی مال لُوٹ لیتے۔ غرض مسالوں کی تجارت میں منافع زیادہ تھا، تو کافی خطرات بھی پوشیدہ تھے۔

اُس زمانے میں تھامس اسمتھ برطانیہ میں ہی نہیں، مغربی

یورپ کا امیر ترین تاجر تھا۔ اس کی داستان بھی عجیب و غریب ہے۔ تھامس کا دادا معمولی جولاہا تھا۔ پھر پیسے جمع کر کے کپڑا فروش ہو گیا۔ اس کا بیٹا، تھامس اسمتھ سینئر سولہ سال کی عمر میں لندن چلا آیا۔ وہاں شومئی قسمت سے میئر لندن اس کا واقف کار بن گیا۔ تھامس سینئر کو اس نے کسٹم آفیسر بنا دیا۔ یوں اس کی امارت کا آغاز ہوا۔ کسٹم آفیسر کی حیثیت سے اس نے کثیر رقم جمع کر لی۔

اس کا بیٹا، تھامس اسمتھ بھی کئی سال کسٹم افسر رہا۔ اس نے جو رقم کمائی، وہ تجارت میں لگا دی۔ خوش قسمتی سے اسے بھرپور منافع ہوا اور وہ لاکھوں میں کھیلنے لگا۔ جب ملکہ الزبتھ اوّل جنگوں میں مصروف تھی، تو تھامس نے اُسے کئی بار بھاری قرضہ دیا۔ یوں وہ الزبتھ حکومت کا اہم پشت پناہ بن گیا۔ اس عمل سے نہ صرف اس کی دولت بلکہ اثر و رسوخ میں بھی اضافہ ہوا۔ اس نے جاگیریں خرید لیں اور ان کے ذریعے بھی دولت کمانے لگا۔

دنیا کے اوّلیں سرمایہ کار

تھامس بھی مسالوں کی تجارت کرنے کا خواہش مند تھا۔ ساتھی تاجروں سے گفت و شنید کے بعد آخر طے پایا کہ تمام ہم خیال تاجر اپنا سرمایہ ملا کر ایک نجی کمپنی تشکیل دیتے ہیں۔ تجارت میں منافع ہو یا نقصان، وہ رقم کے حصّے (حصص) کی مناسبت سے تاجروں میں تقسیم ہو جائے گا۔ چنانچہ کمپنی کے قیام پر اتفاق ہو گیا۔

تاجروں کے اشتراکِ باہمی سے بنی کمپنی اُس زمانے میں ''چارٹرڈ کمپنی'' کہلاتی تھی۔ حکومتِ وقت سے اس کے قیام کا اجازت نامہ لینا ضروری تھا۔ دنیا کی پہلی ایسی کمپنی سٹورا (Stora) تھی جو 1347ء میں وجود میں آئی۔ یہ تانبے کی ایک کان کی مالک تھی۔ انیسویں صدی میں یہ کاغذ کا کاروبار بھی کرنے لگی۔ 1996ء میں اس کا کاغذ بنانے والی ایک بڑی کمپنی، انسو (ENSO) سے ادغام ہو گیا۔ یوں ایک نئی کمپنی، سٹورا انسو کا قیام عمل میں آیا۔ آج اس کا شمار پیلچنگ کی سات بڑی بین الاقوامی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔

ملکہ الزبتھ اوّل جنگوں اور کاروبارِ مملکت میں حد درجہ مصروف تھی۔ اس نے ابتداً اجازت دینے سے انکار کر دیا، تاہم تھامس اسمتھ نے اپنے رسوخ کے ذریعے اس سے چارٹر کمپنی قائم کرنے کا شاہی فرمان حاصل کر لیا۔ یوں ''گورنر اینڈ کمپنی آف مرچنٹس آف لندن ٹریڈنگ ان ٹو دی ایسٹ انڈیز'' کی بنیاد پڑی۔ یہ مگر تاریخِ عالم میں اپنے مختصر نام ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' سے مشہور ہوئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سے قبل یورپی ممالک میں چودہ چارٹرڈ

کمپنیاں جنم لے چکی تھیں، مگر یہ پندرہویں کمپنی ایک منفرد خاصیت ضرور رکھتی تھی۔ پہلی تمام چارٹرڈ کمپنیوں میں رقم لگانے

عزت، شہرت اور دولت ملتی ہے۔ مگر انسان پر لالچ و ہوس غلبہ پالے، تو اس کی تجارتی سرگرمیاں شیطانی صورت اختیار

انسانوں کو بھونا جارہا ہے

والے تمام تر لوگ تاجر تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی پہلی چارٹرڈ کمپنی ہے جس میں شاہی دربار کے امرا اور جاگیرداروں نے بھی پیسہ لگایا۔ گویا یہ دنیا کے اوّلین سرمایہ کار تھے جنہوں نے منافع کمانے کی خاطر ایک نئی کمپنی میں رقم لگا دی۔

کام کا آغاز

تجارت پیشۂ پیغمبری ہے۔ اسے دیانت داری اور نیک نیتی سے انجام دیا جائے تو انسان کو

کرلیتی ہیں۔ بدقسمتی سے آگے چل کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی بدی کا چولا پہن لیا۔ اس نے پھر دنیا میں سب سے بڑی نوآبادیاتی یا استعماری سلطنت کی بنیاد رکھی..... مگر اس کے قیام میں دھوکے بازی، ظلم وستم اور فراڈ کی انتہا کر ڈالی، لیکن چار سو بیس سال قبل 31 دسمبر 1600ء کو بظاہر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام تجارت کے مفید مقاصد سامنے رکھ کر ہی عمل میں آیا۔ اس میں ''215'' تاجروں اور اُمرا نے سرمایہ کاری کی تھی۔ یہ اس زمانے میں کسی بھی کمپنی میں رقم لگانے والوں کی سب سے

بڑی تعداد تھی۔

کمپنی کے پاس -/68,373 پونڈ کا سرمایہ موجود تھا۔ اُسے چلانے کے لیے 25 ڈائریکٹروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اِن میں سے ایک کمپنی کا گورنر یعنی سی ای او بن گیا۔ چونکہ تھامس اسمتھ کا سرمایہ سب سے زیادہ تھا، اِس لیے وہ بالاتفاق پہلا سی ای او مقرر ہوا۔ وہ پھر جہاز خریدنے کا بندوبست کرنے لگا تاکہ اُسے ''انڈیز'' بھجوایا جا سکے۔ ملکہ برطانیہ نے کمپنی کو ''انڈیز'' سے تجارت کرنے کے پندرہ سالہ حقوق عطا کر دیے تھے۔

آغاز ہی میں کمپنی مگر انوکھی مصیبت میں پھنس گئی۔ ہوا یہ کہ تھامس اسمتھ کے مخالفین نے اُسے ایک سازش سے ملکہ الزبتھ کے خلاف ہونے والی مقامی بغاوت میں پھنسا دیا۔ اُسے بڑی مشکل سے رہائی ملی، تاہم دیگر ڈائریکٹروں نے تھامس کی عدم موجودگی میں کمپنی کا کام جاری رکھا۔ چنانچہ 1601ء میں کمپنی کا پہلا جہاز ''ریڈ ڈریگن'' بغرضِ تجارت انڈیز کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ جہاز مسالوں اور دیگر سامان سے لدا 1603ء میں واپس آیا۔ مال کی فروخت سے کمپنی کو مالی فائدہ ہوا۔ یوں اِس کی تجارت مستحکم بنیاد پر قائم ہو گئی۔

دوسری اہم شخصیت میدان میں

اِس مرحلے میں ایک اور اہم شخصیت مسالوں کی بین الاقوامی تجارت میں داخل ہوتی ہے۔ اُس کا نام جوہان وان اولڈن بارن ویلٹ تھا۔ یہ ہالینڈ کی تحریکِ آزادی کے نمایاں ترین رہنماؤں میں سے ایک تھا۔ جب ولندیزی، ہسپانوی اور پُرتگالی فوجوں سے لڑ رہے تھے، تو جوہان وان کو 1586ء میں ہالینڈ کا صدر (Land's Advocate) بنا دیا گیا۔ یہ

ایک جوشیلا قوم پرست لیڈر تھا۔ اُسے احساس ہوا کہ ولندیزی تاجر مسالوں کی تجارت کرنے لگیں، تو ہالینڈ معاشی ترقی کر سکتا ہے، چنانچہ اُس نے اپنے تاجروں کو مراعات دیں تاکہ وہ ''انڈیز'' سے تجارت شروع کر سکیں۔ حکومتی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے جلد تاجروں نے چھوٹی موٹی کمپنیاں بنائیں اور ''انڈیز'' تجارتی جہاز بھجوانے لگے۔

شروع میں چند تجارتی جہاز ڈوبنے یا دشمن کے قبضے میں چلے جانے سے خسارہ ہوا، مگر پھر بحری جہاز مسالوں سے لدے ہوئے واپس آئے، تو تاجروں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اِسی دوران برطانوی تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر لی۔ جوہان وان کو محسوس ہو گیا کہ اگر اِس کے مقابلے میں کوئی ولندیزی کمپنی کھڑی نہ ہوئی، تو وہ ''انڈیز'' سے تجارت میں اجارہ دار بن جائے گی۔

جوہان وان نے پھر ایمسٹرڈیم کے تاجروں پر زور دیا کہ وہ بھی مل جل کر ایک تجارتی کمپنی کھول لیں، مگر ولندیزی تاجروں کو بھی یہی خدشہ درپیش تھا کہ کاروبار میں خسارہ ہوا، تو اُن کا سرمایہ ڈوب جائے گا۔ جوہان وان نے اُن کے خطرات دور کرنے کی خاطر دو اہم قدم اُٹھائے۔ اوّل یہ کہ اعلان کیا، نئی کمپنی انڈیز سے بلاشرکتِ غیرے 21 سال تجارت کر سکے گی۔ دوم یہ کہ ایک ایسا ادارہ بنایا جائے گا جہاں تاجر کمپنی میں لگائے اپنے مالی حصّوں (حصص) کی خرید و فروخت کر سکیں گے۔

ولندیزی کمپنی اور پہلی سٹاک مارکیٹ

ولندیزی تاجروں کو جوہان وان کی مراعات پُرکشش محسوس ہوئیں، چنانچہ اُنھوں نے ایک نئی اور بڑی تجارتی کمپنی

کھولنے کی ہامی بھر لی۔ یوں 20 مارچ 1602ء کو چھے چھوٹی کمپنیوں کے ادغام سے ''یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کا قیام عمل میں آیا، تاہم عالمی تاریخ میں یہ ''ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں اس ڈچ کمپنی کو حکمران طبقے کی زیادہ حمایت و سرپرستی حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے ''انڈیز'' سے تجارت میں ابتداً ڈچ انڈیز کمپنی ہی کو زیادہ کامیابیاں نصیب ہوئیں۔

مارچ 1602ء ہی میں نئی کمپنی کے طبع شدہ حصص فروخت کرنے والا ادارہ ایمسٹرڈیم میں کام کرنے لگا۔ یہ دنیا کی پہلی باقاعدہ ''اسٹاک مارکیٹ'' تھی۔ گو اِس اسٹاک مارکیٹ میں چند برس تک صرف ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے

قیدیوں پر کتے چھوڑ دیے گئے

حصص اور بانڈز ہی کی خرید و فروخت ہوتی رہی۔ چونکہ اس کمپنی کی پشت پر حکومت تھی، اس لیے اگلے پانچ برس میں گیارہ سو سے زائد ولندیزی شہری کمپنی کے حصص خرید چکے تھے۔ ان حصص کی مالیت پونے پینتیس لاکھ فرانک تھی جو موجودہ برطانوی کرنسی میں دس کروڑ پونڈ بنتی ہے۔ 1611ء میں ایمسٹرڈیم اسٹاک مارکیٹ ایک بڑی عمارت میں کام

کرنے لگی۔ یہ معاشی ترقی جوہان وان کی دور اندیشی اور جذبہ حب الوطنی کا نتیجہ تھی۔

نیکی سے بدی تک

اب تک کے حالات سے آشکارا ہے کہ برطانوی اور ڈچ، دونوں ایسٹ انڈیا کمپنیوں کی بنیاد معاشی فوائد پانے کے لیے رکھی گئی۔ گویا ان کی نیو میں پرتگالی اور ہسپانوی کمپنیوں کے مانند مسلم دشمنی اور نفرت عنقا تھی۔ یہ کمپنیاں قائم کرنے والے دولت مند بھی نیک نام تھے۔ تھامس اسمتھ امیر ہونے کے علاوہ مخیر اور رحم دل شخص تھا۔ اُس نے لندن میں یتیموں کے لیے یتیم خانے تعمیر کرائے۔ غریبوں کو سرائے خانے بنا کر دیے۔ وہ لندن کا شیرف رہا اور شہریوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مشغول رہتا۔ غرض برطانوی معاشرے میں اُسے عزت و احترام حاصل تھا۔

اسی طرح جوہان وان ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ سیاست دان تھا۔ وہ اپنے شہریوں کی بھلائی کے لیے پیش پیش رہتا۔ اخیر عمر میں بیچارا مذہبی مسائل میں پھنس کر اپنے عہدے اور پھر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا مگر آج ولندیزی قوم اُسے اہم ترین بانیانِ وطن میں شمار کرتی اور اُسے ''غیر معمولی انسان'' کا درجہ دیتی ہے۔

برطانیہ اور ہالینڈ کی کمپنیوں کا مطمح نظر زیادہ سے زیادہ منافع کمانا تھا۔ گو اس تمنا میں لالچ و ہوس کا عمل دخل بہت کم تھا، مگر آخر کار دونوں کمپنیوں میں اسی وجہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ دراصل ہسپانوی سلطنت کی بحری طاقت کمزور ہونے سے اسپین اور پرتگال کے تاجروں نے ''انڈیز'' کے ساتھ تجارت کافی کم کر دی۔ اس سے دونوں نئی کمپنیوں نے فائدہ اُٹھایا اور

اُن کے زیادہ تجارتی جہاز انڈیز آنے جانے لگے۔ صورتِ حال نے پہلے مقابلے کی فضا کو جنم دیا اور پھر ان کے مابین تجارتی تصادم کرا دیا۔

تصادم کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ اور ہالینڈ، دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اپنی اپنی کمپنیوں کو بحری جہازوں میں توپیں نصب کرنے، کرائے کے مسلح فوجی رکھنے، نوآبادیوں میں قلعے بنانے اور مقامی حکمرانوں سے دوستانہ معاہدے کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اِس لیے دونوں کمپنیوں کے تجارتی جہازوں میں مسلح فوج بھی موجود ہوتی تا کہ پرتگالی یا ہسپانوی دشمن سے ٹاکرا ہونے پر بھرپور مقابلہ کیا جا سکے۔

ایمبون میں تصادم

1609ء میں ڈچ کمپنی کی مسلح فوج نے انڈونیشی شہر، ایمبون میں پرتگالی تجارتی مرکز پر قبضہ کر لیا۔ یوں اس علاقے میں مسالوں کی تجارت ولندیزیوں کے ہاتھ آ گئی۔ جلد ہی وہ وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں کی آمد پر ناک بھوں چڑھانے لگے۔ ولندیزی علاقے کی زیادہ سے زیادہ تجارت اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے تا کہ اُنھیں مالی فائدہ بھی ہو سکے۔ یہ چلن برطانوی تاجروں کو ناگوار گزرا اور وہ مقامی حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں کرنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے ساتھ دوستانہ معاہدے کر کے مراعات حاصل کی جا سکیں۔

ایمبون کے علاقے میں برطانوی اور ڈچ کمپنیوں کی جس کشیدگی نے جنم لیا، وہ رفتہ رفتہ ''انڈیز'' کے دیگر علاقوں میں بھی پھیلنے لگی۔ یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ دونوں کمپنیوں کے مابین

جنگ چھڑ سکتی ہے۔ برطانیہ اور ہالینڈ، دونوں ہسپانوی و پُرتگالی اتحاد سے نبرد آزما تھے۔ اس لیے اُنھوں نے مناسب نہیں جانا کہ اُن کی کمپنیاں باہم متصادم ہو جائیں، لہٰذا 1619ء میں دونوں حکومتوں نے اپنی کمپنیوں کے مابین دفاعی معاہدہ کرا دیا۔

اِس معاہدے کے ذریعے جزائر ملایا کی تجارت ڈچ اور برطانوی کمپنیوں میں تقسیم کر دی گئی۔ نیز ایک تنظیم، کونسل آف ڈیفنس کا قیام عمل میں آیا تاکہ کوئی تنازع جنم لے، تو وہ حل کر سکے۔ معاہدے کے مطابق علاقے میں دونوں کمپنیوں نے اپنے تجارتی مراکز قائم رکھے، مگر کونسل آف ڈیفنس کا کردار سمجھنے میں وہ غلطی کھا گئیں۔ ولندیزی یہ سمجھے کہ جس علاقے میں اُن کا تجارتی مرکز ہوا، وہاں انگریز بھی اُنھی کے ماتحت ہوں گے۔ جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اُس جگہ کسی تنازع کی صورت میں صرف کونسل آف ڈیفنس ہی اُسے حل کرے گی۔ سمجھ کے اس اختلاف نے آگے چل کر ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا کر دیا۔

فروری 1623ء میں ڈچ کمپنی میں ملازم کرائے کا ایک جاپانی فوجی ایمبون میں اس کے قلعے کے دفاعی اقدامات کی جاسوسی کرتا پکڑا گیا۔ تفتیش پر اس نے افشا کیا کہ دیگر جاپانی فوجی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقامی افسر، گبرئیل ٹاورسن کے ساتھ مل کر ایمبون میں ڈچ گورنر کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ وہ اُسے مار کر تجارتی مرکز پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

ولندیزیوں نے علاقہ ایمبون میں موجود چودہ انگریز بشمول گبرئیل ٹاورسن، گیارہ جاپانی فوجی اور ایک پُرتگالی کو موت کی سزا دی اور اُنھیں پھانسی پر چڑھا دیا۔ بقیہ چار انگریز واپس لندن پہنچے، تو اُنھوں نے دعویٰ کیا کہ ولندیزیوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقتول ملازمین پر تشدد کر کے اقبالِ جرم کرایا اور اُنھیں مار ڈالا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی میدان چھوڑ گئی

اِس انکشاف نے لندن میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر برطانوی حکومت سے مطالبہ کرنے لگے کہ اس کے ملازمین کو مارنے والے ڈچ کمپنی کے ملازم عدالتی کٹہرے میں لائے جائیں۔ چنانچہ برطانیہ نے قانونی کارروائی شروع کر دی، مگر یہ بہت سست رفتار تھی۔ رفتہ رفتہ معاملہ دب گیا۔ آخر 1654ء میں ڈچ کمپنی نے قتل ہونے والے انگریزوں کے لواحقین کو معاوضہ دے کر اپنی جان چھڑائی، تاہم اُنھیں قتل کرنے والے ولندیزی سزا سے بچ گئے۔

ایمبون میں انگریزوں کے قتلِ عام نے برطانیہ اور ہالینڈ کے مابین دشمنی کی بنیاد رکھ دی۔ اس واقعے نے بعد ازاں دونوں ممالک کے مابین ''چار جنگیں'' کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اِن جنگوں کی کہانی اپنی جگہ حیرت انگیز اور ڈرامائی ہے، یہ پھر کبھی بیان کریں گے۔ سرِدست یہ پڑھیے کہ ایمبون قتلِ عام نے کیا انوکھے اثرات مرتب کیے؟

ہوا یہ کہ اِس قتلِ عام کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے رفتہ رفتہ انڈونیشیا جانا چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی بیشتر توجہ ہندوستان (اور بعد ازاں چین) پر مرکوز کر دی۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ

دونوں کمپنیوں نے دنیا میں مسلمانوں کی بہ لحاظِ آبادی سب سے بڑی مملکتوں کو خاموش معاہدے کے ذریعے بانٹ لیا۔ مسلم انڈونیشیا ڈچ کمپنی کے حصّے میں آیا، تو مسلم ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تصرف ہوگیا۔ اگلے تین سو برس تک چار جنگیں لڑنے کے باوجود برطانیہ اور ہالینڈ کی تجارتی کمپنیوں میں دائرہ کار و اثر کے لحاظ سے یہ تقسیم برقرار رہی۔

دو بڑے مسلم علاقوں کے بٹوارے ہی نے دونوں تجارتی کمپنیوں کو استعماری قوت بننے کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اب کمپنیاں اپنے اپنے زیرِ تصرف علاقوں میں دوسرے طاقتور یورپی حریف کی عدم موجودگی سے بھرپور تجارتی و معاشی فوائد حاصل کر سکتی تھیں۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے استعماری طاقت بننے کے لیے پہلا قدم اُٹھایا۔

باندا میں قتلِ عام

اس زمانے میں انڈونیشیا کے جزائر باندا دنیا میں جائفل اور پوست جائفل (Mace) کی پیداوار کے سب سے بڑے مراکز تھے۔ ان جزائر پر سب سے پہلے پُرتگالی حملہ آور، الفانسو ابوقورق نے 1511ء میں دھاوا بولا تھا۔ جزائر میں پندرہ سولہ ہزار قبائلی آباد تھے۔ اُنھوں نے بے جگری سے پُرتگالیوں کا مقابلہ کیا اور اُنھیں جزائر پر قدم جمانے نہیں دیے۔ پُرتگالیوں نے آخرکار مقامی باشندوں سے تجارتی معاہدہ کرلیا۔

پُرتگالی تاجر رخصت ہوئے، تو ولندیزی آپہنچے۔ ان کے پاس اسلحہ زیادہ تھا۔ ولندیزی بھی جزائر پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ نتیجتاً مقامی آبادی سے ٹکراؤ ہوگیا۔ ولندیزیوں نے اپنی فوج میں کرائے کے جاپانی فوجی بھرتی کیے اور ان سے مقامی آبادی کا قتلِ عام کرنے لگے۔ جاپانیوں نے مقامی آبادی کے چالیس سرکردہ لیڈر پکڑے، ان کے سر کاٹے اور بانسوں سے باندھ کر جگہ جگہ لٹکا دیے۔ یوں وہ مقامی لوگوں میں خوف و دہشت پھیلانا چاہتے تھے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ ولندیزی فوج نے 1622ء سے 1630ء کے دوران جزائر باندا کی بیشتر مقامی آبادی کا صفایا کر دیا۔ ان پر خوفناک تشدد کیا گیا۔ صرف ایک ہزار افراد بچ سکے۔ اُنھیں زبردستی غلام بنا لیا۔ وہ پھر ولندیزیوں کے فارموں میں کام کرنے لگے جہاں جائفل کاشت ہوتی تھی۔

جزائر باندا برِاعظم ایشیا میں یورپی استعمار کی پہلی کالونی سمجھی جاتی ہے، کیونکہ ولندیزیوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا، پھر وہاں سے وسائل لُوٹنے کی خاطر فارم قائم کیے اور یوں لُوٹ مار کا منظم دھندا شروع کر دیا۔ اس طرح مسلم انڈونیشیا میں استعماریت نے جڑ پکڑ لی۔ ولندیزیوں سے قبل وہاں پُرتگالی اور ہسپانوی صرف تجارتی مرکز (کوٹھی) بناتے تھے۔ وہ مقامی آبادی سے تجارت کرتے تھے، اُنھوں نے انڈونیشیا میں اپنے زرعی یا صنعتی فارم نہیں بنائے۔

بٹاویہ کا قیام

ولندیزی اگرچہ جزائر باندا سے قبل مقامی مسلم ریاست، باتم کی ایک بستی پر قبضہ کر چکے تھے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ریاست باتم میں دریائے سلونگ کے کنارے ایک بستی آباد تھی۔ وہاں سلطان باتم کی طرف سے شہزادہ جے وکارتہ حکومت کرتا تھا۔ جب 1610ء میں ولندیزی وہاں پہنچے، تو شہزادے نے انھیں تجارتی کوٹھی بنانے کی اجازت دے دی۔

چند ہی برس میں ولندیزیوں نے وہاں رہائشی مکان بھی تعمیر کر لیے۔ شہزادے کو محسوس ہوا کہ غیر ملکی اس جگہ پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور اصل معاملہ بھی یہی تھا۔ ولندیزیوں کو یہ مقام بہت پسند آیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اس علاقے میں اپنا صدر مقام بنانے کا سوچنے لگے۔ غیر ملکیوں کے مشکوک ارادے بھانپ کر 1618ء میں شہزادے نے ولندیزی عمارات ڈھا دیں اور ان کے مکینوں کو نکال باہر کیا۔

شہزادہ جے وکارتہ اب انگریزوں سے تجارتی معاہدہ کرنا چاہتا تھا، لیکن سلطان باتم برطانوی باشندوں کو ناپسند کرتا تھا۔ اس لیے اس نے شہزادے کو واپس بلا لیا۔ اس کی عدم موجودگی میں بستی کا دفاع کمزور ہو گیا۔ چنانچہ مئی 1619ء میں ولندیزی فوج نے بستی پر حملہ کیا اور اُسے جلا ڈالا۔ کئی مقامی لوگ مارے گئے۔ بقیہ کو ولندیزیوں نے زبردستی نکال دیا۔ اس جگہ پھر اُنھوں نے نئی بستی تعمیر کی جسے 'بٹاویہ' کا نام ملا۔ آنے والے برسوں میں بٹاویہ انڈونیشیا میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر مقام بن گیا۔ 1942ء میں انڈونیشی مجاہدینِ آزادی نے شہزادہ جے وکارتہ کی یاد و اعزاز میں اسے 'جکارتہ' کا نام دیا۔ آج یہ تاریخی نگر انڈونیشیا کا دارالحکومت ہے۔

پرتگالیوں کے ظلم وستم

اسلامی ممالک میں نوآبادیاں قائم کرنے کی ابتدا ولندیزی استعمار نے رکھی، تو سب سے پہلے نہتے وغیر مسلح مسلم آبادی پر ظلم وتشدد ہسپانوی اور پرتگالی ظالموں نے اپنایا۔ قبل ازیں بتایا گیا کہ 1498ء میں پرتگالی جرنیل، واسکو ڈی گاما کالی کٹ، ہندوستان پہنچ گیا تھا۔ یہ شہر آج کل کوژیکوڈ (Kozhikode) کہلاتا اور ریاست کیرالہ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اُس زمانے میں کالی کٹ ریاست کا درجہ رکھتی تھی اور علاقے میں سب سے بڑی مسالوں کی تجارت کا مرکز تھی۔

کالی کٹ میں زمانۂ قدیم سے عرب تجار مقیم تھے۔ اُنھوں نے مقامی خواتین سے شادیاں کر لی تھیں۔ ان عربوں کی اولاد 'موپلا' کہلاتی ہے۔ (انھیں انگریز استعمار نے بعد ازاں زبردستی غلام بنا لیا تھا)۔ ریاست میں مسلمان تاجروں کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ راجا سے لے کر عوام تک سبھی انھیں عزت سے دیکھتے، کیونکہ وہ دیانت دار، ہمدرد اور انسان دوست تھے اور اُنھوں نے ریاست میں اپنی بستیاں اور محلے بنا رکھے تھے۔

واسکوڈی گاما مگر مسلمانوں کی عزت افزائی دیکھ کر جل اُٹھا۔ وہ ایک کٹر عیسائی فوجی تھا۔ واپس پرتگال پہنچ کر اس نے نمک مرچ لگا کے ہم وطنوں کو بتایا کہ کالی کٹ میں مسلمانوں کو زبردست غلبہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے، پرتگالی بادشاہ نے 1500ء میں دوسرا بحری بیڑا کالی کٹ بھجوایا، تو وہ پانچ جنگی جہازوں پر مشتمل تھا۔ تاجروں کے بھیس میں کالی کٹ پہنچنے والی اس پرتگالی فوج نے وہاں مسلمانوں پر جو ظلم وستم ڈھایا، انھیں زین الدین مصری نے اپنی کتاب ''تحفۃ المجاہدین'' میں بیان کیا ہے۔ آپ اس دور کے عرب مؤرخ ہیں۔ کتاب میں لکھتے ہیں:

''پرتگالیوں نے کالی کٹ پہنچتے ہی وہاں کے راجا پر زور دیا کہ وہ عربوں کو تجارت کرنے سے روک دے۔ بحرِ ہند میں ان کی آمدورفت میں بند کرا دے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے کالی کٹ کی مسجد ناخدا کو شہید کر دیا۔ بعض دیگر مساجد بھی جلا کے خاک کر دیں۔ ان کی جگہ گرجے تعمیر کیے گئے۔

''ان کے مظالم کی فہرست طویل ہے۔ مثلاً انھوں نے

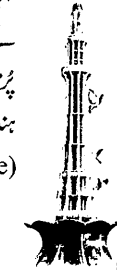

مسلمانوں کا حج بند کرا دیا۔ مال و متاع لُوٹ لیے۔ محلے اور مساجد نذرِ آتش کر دیتے۔ کشتیوں پر زبردستی قابض ہو جاتے۔ قرآن پاک اور دِیگر مذہبی کتب کو پیروں تلے روند کر آگ میں ڈالتے۔ مساجد کی بے حرمتی کرتے۔ مرتد ہونے والے صلیب کے آگے سجدہ کرتے، تو اُنھیں انعام دیتے۔ اپنی عورتوں کو سجا بنا کر نکالتے تاکہ مسلمان خواتین کو گمراہ کر سکیں۔

''(نعوذ باللہ) حضور اکرم ﷺ کو سرِ عام گالیاں دیتے۔ جو مسلمان اُن کے ہتھے چڑھ جاتے، پُرتگالی اُنھیں بھاری بیڑیاں پہناتے اور بازار لے جا کر فروخت کر دیتے۔ کئی مسلمان قید کر لیے جاتے تاکہ ان کے رشتے داروں سے بھاری تاوان وصول کیا جا سکے۔ انھیں دورانِ قید سخت اذیتیں دی جاتیں۔ اگر وہ پانی سے استنجا کرتے، تو پُرتگالی ان پر جوتیاں برساتے۔''

''اس قسم کے اور بہت سے مظالم ہیں جن کے ذکر سے زبان رُک جاتی ہے۔ جن کے اظہار سے قوتِ گویائی انکار کرتی ہے۔''

ٹکراؤ مذہبی نہیں تھا

یہ واضح رہے کہ اسلام اور عیسائیت کا تصادم مذہبی بنیاد نہیں رکھتا، بلکہ اسے عیسائی حکمران طبقے نے شروع کیا۔ جب عرب میں اسلام کا بول بالا ہوا، تو شام و اُردن میں حکومت کرنے والے غسانی بادشاہ خوف زدہ ہو گئے یہ غسانی بازنطینی سلطنت کے باج گزار تھے۔ انھیں یہ خوف چمٹ گیا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیں گے۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ ایسا کوئی عزم نہیں رکھتے تھے۔ البتہ اُنھوں نے ایلچی بھیج کر پڑوسی ریاستوں کے حکمرانوں کو دعوتِ اسلام ضرور دی۔ جس نے دعوت رد کر دی، اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔

629ء میں نبی کریم ﷺ نے حضرت حارث بن عمیرؓ کو حاکم بصری کے نام خط دے کر روانہ فرمایا۔ بصری ان دنوں بازنطینی سلطنت کا اہم شہر تھا۔ وہاں عیسائیوں نے ایک بڑا چرچ تعمیر کیا تھا۔ بصری جاتے ہوئے حضرت حارثؓ نے اُردن کی وادی البلقا میں قیام فرمایا۔ اس علاقے پر بازنطینی سلطنت کا ایک باج گزار غسانی عیسائی عرب، شرجیل بن عمرو حکومت کر رہا تھا۔

شرجیل بن عمرو جاہ طلب حکمران تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ حاکم بصری سے دوستانہ تعلقات بڑھا رہے ہیں، تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اگر حاکم بصری نے نبی کریم ﷺ سے تعلقات قائم کر لیے، تو ممکن ہے کہ اس کی حکومت جاتی رہے۔ اپنا زوال آتا دیکھ کر ہی اس نے حضرت حارث بن عمیرؓ کو شہید کر دیا۔

اُس زمانے میں سفیر کا قتل اعلانِ جنگ کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ جب شہادتِ حضرت حارثؓ کی خبر نبی کریم ﷺ کو ملی، تو آپ ﷺ بہت آزردہ ہوئے۔ اس دلدوز واقعے سے آپ ﷺ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر غسانی عربوں کو اس ظلم پر سزا نہ دی گئی، تو دیگر پڑوسی مسلمانوں کو کمزور سمجھیں گے۔ نیز نومسلموں کا حوصلہ بھی پست ہو سکتا تھا۔ یہ عوامل مدِنظر رکھ کر حضورِ اکرم ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ غسانی عربوں کو سبق دینے کے لیے ایک اسلامی لشکر اردن بھجوایا جائے۔

یہ اسلامی لشکر تین ہزار مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ غزوۂ خندق کے بعد یہ اسلامی تاریخ میں کھڑی کی جانے والی سب سے بڑی فوج تھی۔ اس حقیقت سے واقعے کی اہمیت و سنگینی معلوم ہوتی ہے۔ قائدِ لشکر حضرت زید بن حارثہؓ بنائے گئے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت

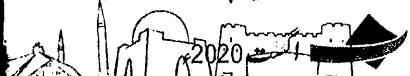

زیدؓ سے فرمایا: ''البلقا پہنچ کر پہلے وہاں کے باشندوں کو دعوتِ اسلام دینا، اگر وہ اسلام قبول کرلیں، تو پھر جنگ نہ کرنا۔ قبول نہ کریں، تو پھر اُن سے لڑائی کریں۔'' گویا جنگ کی حالت میں بھی پہلے امن کی دعوت دی گئی۔

عرب لشکر کو علم نہیں تھا کہ اردن میں بازنطینی سلطنت کا ایک جرنیل، تھیوڈور بھی اپنی سپاہ کے ساتھ مقیم ہے۔ دراصل انھی دنوں ایران کی ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت میں جنگ ختم ہوئی تھی، لہٰذا تھیوڈور اسی سلسلے میں وہاں مقیم تھا۔ جب عرب لشکر وادی البلقا کے قریب پہنچا، تو اُسے تھیوڈور کی موجودگی کا علم ہوا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے واپس جانا مناسب نہیں سمجھا اور آگے بڑھ گئے۔

غسانی عربوں کی مدد کے لیے تھیوڈور نے اپنی فوج متحرک کردی۔ اس میں کم از کم بیس ہزار فوجی شامل تھے۔ مسلمان موتہ کے مقام پر اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور دشمن سے جا ٹکرائے۔ اس معرکے میں نامی گرامی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شہید ہوئے۔ اُنھوں نے جانیں دے دیں، مگر پیٹھ پھیرنا گوارا نہیں فرمایا۔

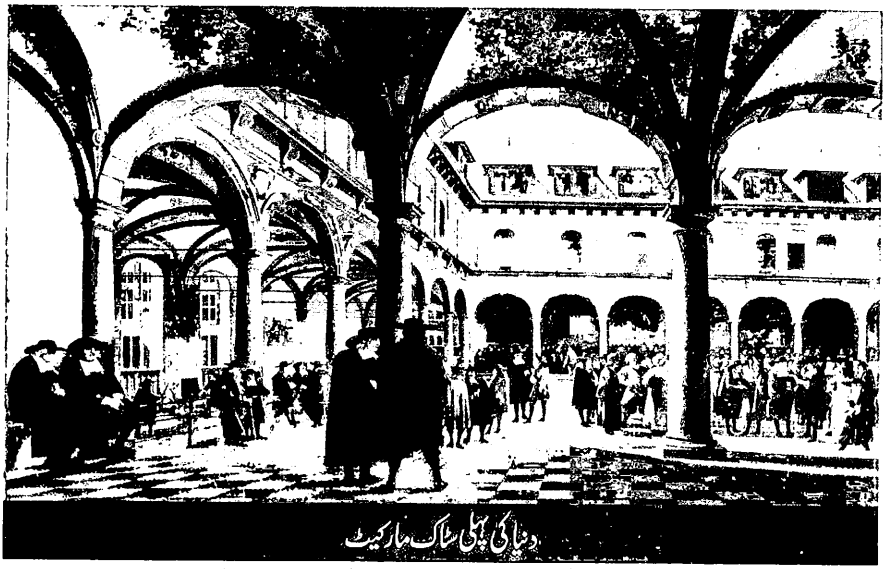

دنیا کی پہلی سٹاک مارکیٹ

اس معرکے کے بعد ہی مسلمانوں کا بازنطینی اور پھر ایران کی ساسانی سلطنتوں سے تصادم شروع ہوا۔ ان سلطنتوں کے حکمران انقلابی اسلامی تعلیمات سے خوفزدہ تھے۔ اسلام نے انسانی تاریخ میں پہلی بار پسے طبقات کو حکمرانوں کے برابر لا کھڑا کیا تھا۔ اس صورتِ حال میں غیر مسلم حکمران طبقے کو اپنی طاقت ماند پڑتی محسوس ہوئی، تو وہ اسلام کا مخالف ہو گیا۔ یہ حقیقت آشکارا کرتی ہے کہ کم از کم آغاز میں مذہبی نظریات ٹکراؤ کی وجہ نہیں تھے۔

اسلام کٹہرے میں

مشہور نومسلم، علامہ محمد اسد اپنی کتاب ''Islam at

the Crossroad'' میں رقم طراز ہیں:

''یورپ خواہ بدھ مت کے عقائد قبول نہ کرے، ہندو فلسفہ نہ اپنائے، مگر وہ ان پر غور کرتے ہوئے ایک متوازن و معقول ذہنی کیفیت برقرار رکھتا ہے، لیکن اسلام کی سمت متوجہ ہوتے ہی اس کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ چند کو چھوڑ کر نامی گرامی مستشرقین نے اسلام سے جانب داری برت کر قلم چلایا ہے۔ ان کے اندازِ تحریر سے عیاں ہے کہ اسلام گویا ایک مجرم ہے جو عدالت میں جج کے روبرو کھڑا ہے۔ مستشرقین سرکاری وکیل بن کر اُسے مجرم بنانے پر تلے ہیں۔ کچھ وکیلِ صفائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلام بے قصور ہے، مگر اس کا دفاع بڑی بے دلی سے کرتے ہیں۔''

حاجیوں پر حملہ

اب واپس پُرتگالی استعمار پسندوں کی جانب پلٹتے ہیں۔ 1503ء میں شاہ پُرتگال نے زیادہ بڑا جنگی بیڑا ہندوستان بھجوایا تاکہ وہ کالی کٹ اور ہندوستان کے دیگر ساحلی علاقوں میں مسلم بستیوں پر حملہ کر سکے۔ اس چوتھے پُرتگالی بیڑے کا سردار واسکوڈی گاما تھا۔

اگست 1502ء میں بیڑا ہندوستانی ساحل کے قریب تھا کہ اُسے ایک جہاز دکھائی دیا۔ یہ کالی کٹ میں مقیم مسلمانوں کا جہاز تھا۔ اس میں ان کے بیوی، بچے اور ملازمین حج کر کے واپس آ رہے تھے۔ واسکوڈی گاما نے تمام مروجہ قوانین اور اَخلاقیات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس جہاز پر قبضہ کر لیا، حالانکہ وہ جنگی تھا اور نہ ہی تجارتی۔ وہ محض مسافر بردار جہاز تھا جس میں زیادہ خواتین اور بچے سوار تھے۔ مؤرخین نے ان کی تعداد ساڑھے تین سے چار سو کے مابین لکھی ہے۔

واسکوڈی گاما نے پہلے تو جہاز پر لدا ساز سامان اپنے جہازوں پر بند کیا۔ پھر تمام مردوں، خواتین اور بچوں کو رسیوں سے جہاز پر باندھا اور اُسے آگ لگا دی۔ لوگ رحم کی دہائی دیتے رہے، مگر ظالم گاما کا دل نہیں پسیجا۔ بعض مسلمان مردوں نے نتیجے ہی پُرتگیزی فوجیوں پر حملہ کر دیا۔ وہ شہید کر دیے گئے۔

گاما کے جہاز پر اس کا ایک نائب، تھامی لوپس (Thome Lopes) بھی موجود تھا۔ اس نے پُرتگال پہنچ کر ایک سفرنامہ لکھا۔ سفرنامے میں تھامی لوپس نے تفصیل سے جہاز جلانے کا واقعہ بیان کیا۔ وہ لکھتا ہے:

''جہاز کئی دن تک جلتا رہا اور پھر سمندر بُرد ہو گیا۔ کچھ مسافر زندہ بچ کر تیرنے لگے۔ ہمارے فوجیوں نے انھیں نیزوں سے مار ڈالا۔ میں ساری عمر جہاز جلنے کے مناظر بھول نہیں سکتا۔''

پُرتگالی جنگی بیڑے میں ایک اور فوجی، گیسپر کوریا بھی سوار تھا جس نے بعد ازاں اپنی یادداشتیں لکھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ بیڑے کے بیشتر افسر مسلمان مسافروں کو یرغمال بنانا چاہتے تھے تاکہ ان کے پیاروں سے بھاری تاوان وصول کیا جا سکے، مگر گاما نے ایک نہ سنی اور سبھی کو زندہ جلا ڈالا۔ گیسپر کوریا نے بڑی تفصیل سے مرنے والی خواتین اور بچوں کا حال لکھا ہے جسے پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے واسکوڈی گاما کی حقیقی شخصیت جسے مغربی ماہرین آج بھی ''عظیم'' مہم جو اور پُرتگالی جرنیل کا خطاب دیتے ہیں۔ حقیقتاً وہ ایک ظالم اور متعصب انسان تھا۔ اُسے نفرت نے اتنا اندھا کر دیا کہ معصوم بچوں کے لہو سے ہاتھ رنگ کر بھی اُسے ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوا۔

کولمبس کی حقیقت

وطنِ عزیز میں بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں کرسٹوفر کولمبس کو بھی ایک ''عظیم'' مہم جو سمجھتے ہیں جس نے امریکا

دریافت کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ یہ کولمبس کی شخصیت کا محض ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ نہایت بھیانک اور خوفناک ہے۔ یہ پہلو پُرتگال کی پڑوسی ریاست، اسپین کے باشندوں کا بھی ظلم وستم سامنے لاتا ہے۔ تیسری دنیا کی اقوام پر ظلم وتشدد کے یہی بانی ہیں۔

کرسٹوفر کولمبس اٹلی میں پیدا ہوا۔ پچیس چھبیس سال کا تھا کہ لزبن، پُرتگال چلا گیا۔ اس کی بقیہ زندگی پھر پُرتگال اور اسپین میں بسر ہوئی۔ وہ بذریعہ بحری سفر ہندوستان جانے کا متمنی تھا۔ اس نے پہلے شاہِ پُرتگال سے مدد مانگی جو رَد ہوئی۔ وہ اسپین پہنچا، تو سال سقوطِ غرناطہ کے فوراً بعد شاہ فرڈیننڈ نے اُسے مالی مدد فراہم کردی۔ چنانچہ 3/اگست 1492ء کو وہ تین بحری جہازوں پر نکل کھڑا ہوا۔

کولمبس ہندوستان پہنچنا چاہتا تھا، مگر اس کا بحری بیڑا 12/اکتوبر 1492ء کو کیریبئین پہنچ گیا جو آج وسطی امریکا کا حصّہ ہے۔ اس علاقے میں ''تائنو'' (Taino) قوم آباد تھی۔ کیوبا، ہیٹی، جمیکا، پورٹوریکو اور بہاماس میں اِسی قوم کا ڈیرہ تھا جس کی تعداد تقریباً تین لاکھ تھی۔ کولمبس جس جزیرے پر اترا، وہاں تائنو مرد وزَن ہی نے اُس کا استقبال کیا۔ کولمبس نے بعدازاں لکھا کہ تائنو لوگ امن پسند، رحم دل اور دِلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ اُنھوں نے یورپ سے آنے والے مہمانوں کو تحفے تحائف پیش کیے، لیکن آگے چل کر یورپیوں نے تائنو قوم کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ خوفناک اور لرزہ خیز ہے۔

ظالمانہ احکامات

کرک پیٹرک سیل امریکا کا ممتاز مؤرخ ہے۔ 1990ء میں اس کی کتاب ''جنت کی فتح'' (The Conquest of Paradise) شائع ہوئی۔ اس میں فاضل مؤرخ لکھتا ہے:

''کولمبس 1493ء میں واپس کیریبئین پہنچا۔ شاہ فرڈیننڈ نے اُسے نو دریافت جزائر کا گورنر بنا دیا تھا۔ کولمبس نے آتے ہی یہ حکم صادر کردیا کہ مقامی باشندوں میں سے جو چودہ سال سے بڑا ہے، وہ تین ماہ بعد مٹھی بھر سونا اُسے فراہم کرے۔ اگر وہ سونا نہیں دے گا، تو پچیس سیر سوت دے گا۔ جو مقامی باشندہ یہ خراج نہیں دے سکا، اُس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔''

دراصل پچھلے سفر کے ذریعے کولمبس کو پتا چل گیا تھا کہ کیریبئین کے مقامی باشندے امن پسند ہیں۔ ان کا واحد ہتھیار چھوٹا سا نیزہ تھا جس سے وہ جانور شکار کرتے تھے۔ لہٰذا کولمبس نے شاہِ اسپین کو بتایا تھا کہ صرف ایک سو مسلح ہسپانوی جزائر پر قبضہ کرسکتے ہیں۔

تائنو باشندوں نے مگر مطیع ہونے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ہسپانوی فوج کے ساتھ ان کی کئی لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں میں حملہ آوروں نے ڈھائی لاکھ سے زائد مقامی باشندے مار ڈالے۔ ہسپانویوں نے خصوصاً تائنو کی نسل کشی کرڈالی تاکہ اس قوم کا نام ونشان تک مٹایا جاسکے۔

تشدد کے روح فرسا طریقے

اب گھر کے بھیدی کی زبانی انکشافات پڑھیے۔ بارٹولوم دی لاس کاساس اسپین کے جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوا۔ 1502ء میں اس کے باپ نے کیریبئین میں وسیع وعریض زمینیں خرید لیں۔ وہ بھی باپ کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ 1510ء میں پادری بنا اور طویل عرصہ کیریبئین میں رہا۔ اس نے اِن جزائر میں مقامی باشندوں پر ہسپانوی آقاؤں کے ظلم وستم کا بہ چشم دید مظاہرہ دیکھا۔ عمر کے آخری برس میں اس نے ایک کتاب ''A Short Account of the

destruction of the Indies'' میں تمام واقعات لکھ ڈالے۔ وہ لکھتا ہے:

''1492ء سے 1518ء کے دوران ہسپانوی استعمار نے کیریبین سے تانیو قوم کو تقریباً مٹا ڈالا۔ اس نسل کشی کا آغاز کولمبس نے کیا جسے آنے والے ہسپانوی گورنروں نے جاری رکھا۔ ان جزائر کے ہسپانوی حکمران طبقے نے اس ارضی جنت کو تانیو باشندوں کے لیے جہنم میں بدل دیا۔ روایتی جنگیں لڑنے کے علاوہ ہسپانویوں نے انھیں سزائیں دینے کی خاطر یہ طریقے ایجاد کیے:

- وہ تانیو مرد و زن کے بازوؤں اور ٹانگوں میں لوہے کی سلاخیں پرو دیتے، پھر کوئلوں کے اوپر رکھ کر انھیں بھون دیتے۔
- قیدی کھلے میدان میں چھوڑ دیے جاتے۔ پھر اُن پر شکاری بھوکے کتوں سے حملہ کرایا جاتا۔ کتے ان کے جسم سے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا جاتے۔
- وہ ایک ساتھ تیرہ باشندوں کو رسیوں سے باندھ کر لٹکا دیتے۔ پھر انھیں زندہ جلا دیا جاتا۔ یہ عمل مسیحؑ اور اُن کے حواریوں کی یاد میں کئی بار دہرایا جاتا۔
- ہسپانوی فوجی تانیو قوم کے چھوٹے بچوں حتیٰ کہ نوزائیدہ بچوں کو بھی چٹانوں پر پھینک کر مار دیتے۔ انھیں دریاؤں میں پھینک دینا بھی معمول تھا۔
- فوج تلذذ پانے کی خاطر قیدیوں کے ہاتھ پاؤں، ناک، کان اور پوشیدہ اعضا کاٹ دیتے۔ پھر انھیں تڑپتا دیکھ کر خوش ہوتے۔
- خواتین کی بے حرمتی عام تھی۔ وہ عورتوں کو غلام بنا لیتے اور اُن پر بے پناہ تشدد کرتے۔
- ہسپانوی آقا مقامی باشندوں سے زیادہ اپنے پالتو کتوں کو زیادہ پیار کرتے تھے۔ اگر کوئی تانیو کسی ہسپانوی کو مار دیتا، تو ہسپانوی اس کے بدلے میں ایک سو مقامی باشندے مار ڈالتے۔''

تانیو قوم مٹ گئی

تانیو باشندوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جزائر کیریبین سے یہ قوم مٹ گئی۔ تب تک ہسپانوی جزائر میں فارم قائم کر چکے تھے۔ اب انھیں افرادی قوت کی ضرورت پڑ گئی، چنانچہ اُنھوں نے جنوبی امریکا اور اَفریقا سے مقامی باشندے گرفتار کیے اور اُنھیں غلام بنا کر کیریبین لے آئے۔ آج انھی غلاموں کی اولاد ویسٹ انڈیز، کیوبا، ڈومینیکا اور علاقے کے دیگر ممالک میں آباد ہے۔

بارٹوم ڈی لاس مزید لکھتا ہے کہ ہسپانویوں کے مظالم سے تنگ آ کر جزائر میں مقامی لوگ خودکشیاں کرنے لگے۔ بہت سے مرد و زن پہاڑوں کی طرف فرار ہو گئے۔ تانیو باشندوں کا ایک لیڈر، ہاتوے (Hatuey) تھا۔ اُس نے اپنے علاقے میں اعلان کرا دیا کہ عیسائی ہسپانوی سونے کی پوجا کرتے ہیں، لہٰذا جس کے پاس سونا یا قیمتی پتھر ہیں، وہ انھیں دریا میں پھینک دے۔

1512ء میں ہسپانوی فوج نے ہاتوے کو گرفتار کر لیا۔ اُسے ہسپانوی اقتدار کے خلاف بغاوت کرنے پر زندہ جلانے کی سزا ملی۔ جب موت کا وقت قریب آیا، تو ہسپانویوں نے اُسے پیشکش کی کہ اگر وہ عیسائیت قبول کر لے، تو اُس کی جان بچ سکتی ہے۔ اُس نے یہ مذہب قبول کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ اُسے جلا دیا گیا۔

ہسپانوی، پُرتگالی اور پھر ولندیزی حکمران طبقے نے اپنی امریکی، ایشیائی اور اَفریقی نوآبادیوں میں مقامی آبادی پر جو مظالم ڈھائے، اگر انھیں تفصیل سے بیان کیا جائے، تو کئی

صفحے سیاہ ہوجائیں، تب بھی خوفناک داستان ختم نہ ہو۔ درج بالا واقعات دیگ کے صرف چند ابتدائی دانے ہیں، ورنہ مغربی استعمار کی تاریخ ان جیسے روح فرسا واقعات سے بھری پڑی ہے۔

امیر ترین کمپنی

ہم واپس ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف پلٹتے ہیں جو ابتداً تجارتی کمپنی تھی، مگر رفتہ رفتہ استعماری قوت بن گئی۔ اس کی طاقت کا راز مسالوں کی تجارت تھی۔ اِسی تجارت نے صرف ایک سو برس میں اسے دنیا کی امیر ترین کمپنی بنا دیا۔

ماضی میں مسالوں کی تجارت بذریعہ شاہراہِ ریشم ہوتی تھی۔ انڈیز کے مسالے پہلے چین اور ہندوستان پہنچتے۔ وہاں سے قافلے انھیں مشرقِ وسطیٰ پہنچاتے۔ پھر نئے قافلے قسطنطنیہ کا رُخ کرتے۔ یورپی تاجر پھر وہاں سے مسالے اپنی منڈیوں تک لے جاتے۔ اِس طویل سفر کے دوران ہر تاجر مسالوں کی قیمت میں اپنا منافع بھی شامل کر دیتا۔ کینیڈا کا ممتاز مؤرخ، سٹیفن باؤن اپنی دلچسپ کتاب ''تاجر بادشاہ'' (Merchant Kings) میں رقم طراز ہے: ''جب مسالے یورپ میں پہنچتے، تو ان کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ اسی قیمت پر انڈونیشیا میں سونا خریدا جاسکتا تھا۔''

ولندیزی کمپنی کے جہاز یورپ سے براہِ راست انڈونیشیا پہنچنے لگے۔ یوں درمیان سے تمام مڈل مین یا دلال ہٹ گئے۔ اِس باعث مسالوں کی تجارت میں کمپنی کو خاطر خواہ منافع ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی پسپائی سے بھی اُسے فائدہ پہنچا۔ کمپنی نے انڈونیشیا میں مسالوں کی پیداوار کے لیے وسیع و عریض فارم بنا لیے۔ جاپان، چین اور ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں لیں اور ان ملکوں سے تجارت کرنے لگی۔

1670ء تک ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی 150 تجارتی جہازوں کی مالک بن چکی تھی۔ 40 جنگی جہاز بھی اس کی ملکیت تھے۔ کمپنی کی نجی فوج دس ہزار فوجیوں پر مشتمل تھی۔ جبکہ کمپنی کے صدر دفتر اور دُنیا بھر میں پھیلے تجارتی مراکز میں پچاس ہزار افراد کام کر رہے تھے۔ گویا وہ افرادی قوت کے لحاظ سے بھی تب دنیا کی سب سے بڑی نجی کمپنی بن چکی تھی۔

ولندیزی کمپنی 1620ء سے 1700ء تک اپنے سرمایہ کاروں کو سالانہ ''چالیس فی صد'' سالانہ منافع دیتی رہی۔ اِس لیے کمپنی کے حصص کی بہت مانگ تھی اور وہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ 1630ء کے بعد ہالینڈ میں کھلنے والے ٹیولپ پھولوں کی مانگ اچانک پورے یورپ میں بڑھ گئی۔ وجہ یہ ہے کہ ٹیولپ صورت شکل اور خوشبو میں منفرد تھے۔ ان پھولوں کو ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز ہی منزل تک پہنچاتے تھے۔

اس زمانے میں کمپنی کے حصص کی قیمت راتوں رات ''1200'' فی صد تک بڑھ گئی۔ کمپنی کی کُل ملکیت سات کروڑ اسّی لاکھ ڈچ گلڈر تک جا پہنچی۔ آج کی قیمت کے لحاظ سے یہ رقم 8.2 ٹریلین ڈالر بنتی ہے۔ اِسی لیے ماہرینِ معاشیات کے مطابق ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی انسانی تاریخ کی سب سے قیمتی اور مہنگی کمپنی تصور ہوتی ہے۔

8.2 ٹریلین ڈالر دورِ جدید میں جرمنی، برطانیہ اور فرانس کے مجموعی جی ڈی پی سے بھی زیادہ ہیں۔ جبکہ جدید دور میں سعودی عرب کی تیل و گیس کمپنی، آرامکو (4.5 ٹریلین ڈالر)، ایپل (1.4 ٹریلین ڈالر)، مائیکروسوفٹ (1.4 ٹریلین ڈالر)، پیٹرو چائنا (1.4 ٹریلین ڈالر) اور ایمیزن (1.08 ٹریلین ڈالر) بہ لحاظِ مالیت قیمتی ترین کمپنیاں سمجھی جاتی

نے معاشیات، سیاسیات، عمرانیات خصوصاً انڈونیشیا کی نوآبادیاتی تاریخ پر جو اثرات مرتب کیے، وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

ہالینڈ کا سنہرا دور

اس کمپنی نے ہالینڈ میں ترقی و خوش حالی کا ''سنہرا دور'' (Dutch Golden Age) لانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ دور جمہوریہ ہالینڈ کے قیام 1581ء سے لے کر 1672ء تک جاری رہا۔ اِس دوران ولندیزی حکومت کے خزانے بھرے رہے، کیونکہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے منافع کا کثیر حصہ گورنمنٹ کو دے ڈالتی تھی۔ تجارتی سرگرمیوں نے ولندیزی عوام و خواص کو بھی پہلے سے زیادہ امیر بنا دیا۔

خزانہ بھرا ہونے پر ولندیزی حکومت اِس قابل ہوگئی کہ سائنس و ٹیکنالوجی اور فنونِ لطیفہ کی ترقی کے لیے رقم مختص کر سکے۔ یہی وجہ ہے، ایک سو برس تک ان شعبہ جات میں خوف ترقی ہوئی اور کئی نامور شخصیات نے جنم لیا۔ ہالینڈ حال ہی میں آزاد ہوا تھا۔ اِس لیے وہاں عوام پر زیادہ پابندیاں نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے، دیگر ممالک سے کئی فلسفی اور دانش ور ہالینڈ چلے آئے جن میں رینے دیکارت اور جان لاک نمایاں ہیں۔ ولندیزی سنہری دور میں سامنے آنے والی مشہور ہستیوں میں انطون لیون ہاک (سائنس دان)، کرسچن ہائنز (سائنس دان)، سپائی نوزا (فلسفی)، اراسمس (فلسفی)، ریمبران (مصور) اور جوہانس وریمر (مصور) شامل ہیں۔

جب ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی زوال پزیر ہو رہی تھی، تو انھی دنوں ایک اور یورپی کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی عروج پانے لگی تھی۔ اِن شاء اللہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمایے کہ اس برطانوی کمپنی نے کن حیلے بہانوں سے سونے کی چڑیا، ہندوستان میں قدم جمائے اور کیونکر چین جیسی سپر پاور کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

◆◆◆

زوال کا آغاز

1636ء میں ٹیولپ پھولوں کی قیمت مگر معاشی اصطلاح میں کریش کر گئیں۔ خیال ہے کہ ہالینڈ اور یورپی ممالک کے سٹے بازوں نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیگر کمپنیوں کے حصص کی قیمتیں بڑھانے کی خاطر ٹیولپ پھولوں کی قیمتیں آسمان پر پہنچا دیں۔ یہ جدید معاشی تاریخ میں ''معاشی بلبلہ'' (Speculative bubble) جنم لینے کا پہلا واقعہ تھا۔ ''ٹیولپ بلبلے'' کی داستان بھی حیرت انگیز ہے جو پھر کبھی بیان کی جائے گی۔

1750ء کے بعد ولندیزی کمپنی کا زوال شروع ہو گیا۔ اس نے کئی عوامل کی بنا پر جنم لیا۔ چند بڑی وجوہ یہ ہیں:

- کمپنی کے ملازمین کی تنخواہیں کم تھی۔ نیز انھیں کمپنی کے حصص خریدنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اِس لیے وہ کرپشن کرنے لگے۔ بدانتظامی بھی عروج کو پہنچ گئی جو کمپنی کے لیے نقصان دہ قرار پائی۔
- اوائل میں کمپنی کے کام جلد ہوتے تھے۔ بدانتظامی کی وجہ سے سست رفتاری نے جنم لیا۔ چنانچہ بین الاقوامی تجارت میں فرانس، ڈنمارک اور دیگر یورپی ممالک کی کمپنیاں آگے آ گئیں۔ یوں کمپنی کے ہاتھوں سے اچھا خاصا کاروبار نکل گیا۔
- کمپنی نے اپنے آپ کو بہت پھیلا لیا۔ اس لیے انتظامی طور پر تمام کام بخوبی انجام دینا کٹھن مرحلہ بن گیا۔
- آخری برسوں میں کمپنی کو منافع کم ہو رہا تھا، مگر وہ حصے داروں کو چالیس فی صد منافع دیتی رہی۔ اِس عمل نے کمپنی کو کنگال کر دیا۔

غرض مختلف وجوہ کی بنا پر 1800ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا ختم ہو گئی۔ اب اس کا وجود کتبِ تاریخ ہی میں ملتا ہے مگر اس

کتابوں کی دنیا

سجاد میر

ان کا شمار ملک کے معتبر ترین اہلِ علم میں ہوتا ہے اور تعلق اُس مکتبۂ فکر سے ہے جنہیں میں محبِ وطن بایاں بازو یا پیٹریاٹک لیفٹ کہا کرتا ہوں۔ مجھے ان کی حب الوطنی پر شک ہے نہ اسلام سے وابستگی پر۔ البتہ اس کی جو تشریح وہ کیا کرتے ہیں، ان پر اختلاف کوئی ایسی غیر فطری یا گستاخانہ بات نہیں۔ جس شخص نے ''اقبال، اسلام اور رُوحانی جمہوریت'' جیسے موضوع پر کتاب لکھی ہو اور ''فتنہ انکارِ پاکستان'' کے پرخچے اُڑائے ہوں، اس کی داد نہ دینا کوتاہ نظری ہوگی، تاہم اِس وقت اُن کی جو کتاب مرے پیشِ نظر ہے وہ انگریزی میں ہے اور اُن کے لیکچرز کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے امریکا میں

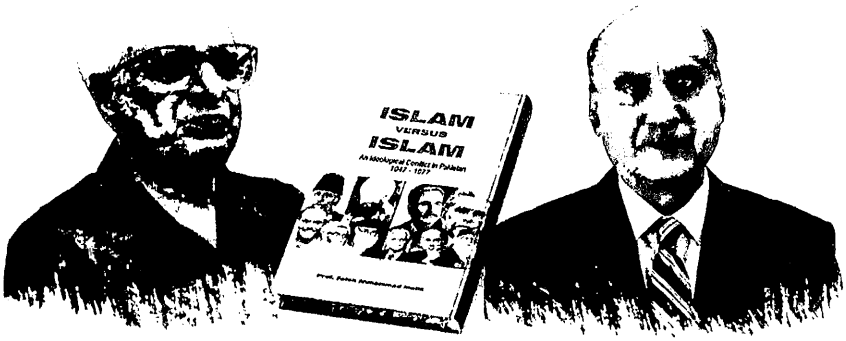

پاکستان کی تاریخ... قدم بہ قدم... نظریات کا ٹکراؤ

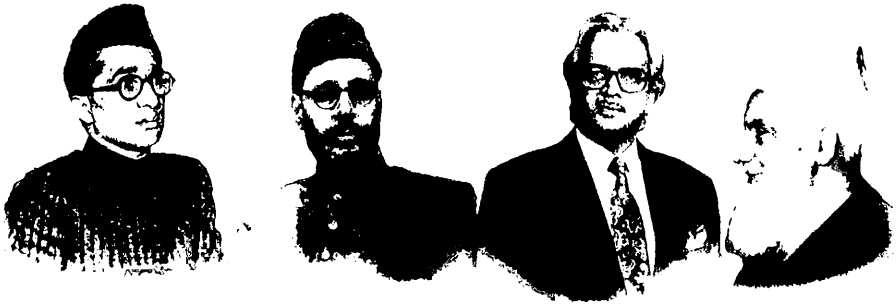

پاکستان پیٹری سے ایسا اُترا کہ سیدھا امریکہ کی جھولی میں جا گرا اور غلامانہ تابعداری کا طوق گلے میں ڈال لیا

اپنے قیام کے دوران دیے۔ نام ہے ''ISLAM VS ISLAM'' یعنی اسلام بمقابلہ اسلام۔ یہ نام ہی ایک علمی مکتبۂ فکر کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اِن خطوط پر بہت کام ہوا ہے۔ خاصے روشن خیال گنے جاتے ہیں یہ اہلِ علم جو اِس فکر کے پیروکار ہیں

گا۔ اس سے اس مقبول عام نقطۂ نظر کی نفی ہوتی ہے کہ امریکی کیمپ میں پاکستان کی شمولیت لیاقت علی خاں کی رجعت پسند سوچ کا نتیجہ تھا۔ وہ روس کی دعوت چھوڑ کر امریکا گئے۔ اِس کتاب میں درج ہے کہ لیاقت علی خاں امریکا میں اپنی تقریروں میں یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ کسی کے حاشیہ بردار نہیں

جناب سجاد میر پاکستان کے بہت معروف دانش ور، بلند پایہ نقاد، وسیع النظر تجزیہ نگار اور صاحبِ اسلوب کالم نگار ہیں۔ اُردو صحافت و اَدب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر بھی کامل دسترس رکھتے ہیں۔ ہمارے پیہم اصرار پر اُنھوں نے مضامین کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اُن کا ادارہ اُردو ڈائجسٹ کے ساتھ تعلق تاریخی اہمیت کا ہے جس پر ہمیں آج بھی فخر ہے۔ 1972ء میں اِس ادارے سے ہفت روزہ 'زندگی' شائع ہو رہا تھا جس کے مدیر جناب مجیب الرحمٰن شامی اور نائب مدیر نوجوان سجاد میر تھے۔ بھٹو صاحب نے اقتدار میں آنے کے بعد آزادیٔ صحافت پر پہلا حملہ دونوں جرائد کے ڈیکلریشن منسوخ اور ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، الطاف حسن قریشی اور مجیب الرحمٰن شامی کی گرفتاری سے کیا۔ جواں جذبوں سے سرشار جناب سجاد میر جبر کے آگے چٹان بن کر کھڑے ہو گئے اور قانون کی ناروا پابندیوں کے باوجود وہ دونوں جریدے باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ اِس ضمن میں بلند قامت مدیر 'چٹان' جناب آغا شورش کاشمیری (مرحوم) اور نائب مدیر اعلیٰ اُردو ڈائجسٹ جناب آباد شاہ پوری (مرحوم) کا تعاون حد درجہ قابلِ تحسین اور مثالی تھا۔ جناب سجاد میر نے اُردو صحافت میں ایک انوکھا تجربہ رقم کر دیا تھا اور نظریاتی صحافت کی پرورش میں ایک تاریخ ساز کردار اَدا کیا تھا۔ (ادارہ)

یا مؤبدانہ ہیں۔ فتح محمد ملک نے بڑی دلجمعی سے اس نقطۂ نظر کے تناظر میں پاکستان کی سیاسی تاریخ کو پرکھا ہے۔

اُنھوں نے گفتگو کا آغاز ہی اِس تہلکہ خیز انکشاف سے کیا ہے کہ امریکی محکمہ خارجہ نے جن خفیہ دستاویزات کو عام کیا ہے، وہ یہ اطلاع دیتی ہیں کہ لیاقت علی خاں کو امریکی سی آئی اے نے قتل کرایا تھا۔ وجہ اِس کی یہ تھی کہ امریکا چاہتا تھا کہ پاکستان، ایران پر اپنا اثر و نفوذ استعمال کر کے اسے ایرانی تیل کے چشموں تک رسائی دلائے۔ لیاقت علی خاں نے آلۂ کار بننے سے انکار کر دیا جس پر اُس وقت کے امریکی صدر ٹرومین نے لیاقت علی خاں کو دھمکی دی کہ اِس کا انجام برا ہو

بنیں گے۔ امریکا نے کرائے کے قاتل کی تلاش شروع کی جو پاکستان میں نہ مل سکا۔ اُس وقت افغانستان واحد ملک تھا جس سے پاکستان کے تعلقات خراب تھے، چنانچہ حکومتِ افغانستان کو اِس کام کے لیے استعمال کیا گیا۔ جی ہاں، حکومتِ افغانستان کو، وہاں یہی لکھا ہوا ہے۔ پھر پاکستان ایسا پٹڑی سے اُترا کہ امریکا کی جھولی میں جا گرا۔ پاکستان نے امریکی دفترِ خارجہ کی غلامانہ تابعداری کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔

امریکا نے جمہوریت کے بجائے پاکستان میں فوجی آمریت کو فروغ دینے ہی میں بہتری سمجھی۔ یہاں فتح محمد ملک بڑی وضاحت کے ساتھ الطاف گوہر کے حوالے سے بتاتے

ہیں کہ کس طرح امریکی سی آئی اے پاکستان میں فوجی آمریت کو برسرِ اقتدار لائی۔ کس طرح سکندر مرزا ایوب خاں اور اُس زمانے کے وزیرِ خزانہ نے امریکا کو قائل کیا کہ 1956ء کے آئین کے تحت پاکستان میں جو انتخابات ہونا ہیں، وہ ایسی حکومت کو برسرِ اقتدار لائیں گے جو امریکی مفادات کے خلاف ہوگی۔ ملک صاحب کے خیال میں اِس طرح پاکستان اپنے مقصد سے دور ہٹ گیا۔ یہ مقصد کیا تھا؟ ملک صاحب کے نقطۂ نظر سے یہ اصل مقصد پاکستان میں اسلامی سوشلزم کا قیام تھا۔ ان کے خیال میں یہی اقبال اور جناح چاہتے تھے۔ پاکستان میں یہ بحث سیاست کے ایوانوں میں اِتنی چلی ہے کہ کسی کو شک نہیں ہوتا کہ یہ کس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ یوں کہیے کہ مصنف نے اِس بحث کو نہایت ''دیانت داری'' سے اِس سیاسی فکر کے حوالے سے بیان کیا ہے جس کا وہ تاریخی طور پر فعال حصّہ رہے ہیں۔ خاص کر یہ ساری بحث اِس باب کا حصہ ہے جو پاکستان میں اسلام کے نام سے اس کتاب میں موجود ہے۔

مگر یہاں تک پہنچنے سے پہلے اُنھوں نے مختصر طور پر اقبال کے تصورِ پاکستان سے بحث کی ہے۔ خاص طور پر خطبۂ الٰہ آباد کی روشنی میں۔ اِس موضوع پر ملک صاحب نے بہت کچھ لکھ رکھا ہے جس طور پر وہ مسلم قومیت کو تشکیلِ پاکستان کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ وہ اِس اصطلاح ''مسلم قومیت'' پر بہت زور دَیتے ہیں۔ ایک دوسرا گروہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ پاکستان نیشنلزم کا مسئلہ نہیں، بلکہ اسلامی ریاست کے قیام کا خواب ہے۔ بہرحال اُنھوں نے یہاں وضاحت سے بیان کیا ہے کہ ایک بات علما کی قدامت پسندی تھی جو عہدِ وسطیٰ سے تعلق رکھتی ہے، تو دوسری طرف اقبال کی ''جدیدیت'' ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اقبال کا آئیڈیل اسلامی سوشلزم تھا جب کہ ملّا

عرب ملوکیت میں گھرا ہوا ہے۔ اِس عرب ملوکیت کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ اقبال نے یقیناً یہ لفظ استعمال کیا ہے، مگر ایک مخصوص تناظر میں جبکہ ملک صاحب اسے مہا بھارت اور اَکھنڈ بھارت کے ساتھ رکھ کر بتاتے ہیں کہ اقبال کا دوقومی نظریہ دراصل تھا کیا۔ وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبال اسلامی ریاست کے حامی تھے اور ان کا آئیڈیل اسلامی سوشلزم تھا۔

جن لوگوں نے ایوب خاں کے بعد ملک میں جمہوری جدوجہد کو دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اُس وقت اسلامی سوشلزم کی یہ بحث کس قدر تلخی اختیار کر گئی تھی۔ فتح محمد ملک اُس وقت دھڑلے سے ایک دھڑے کے ساتھ تھے۔ اِس لیے اُن کی بحث انھی بنیادوں کے گرد گھومتی ہے جو انھیں یقیناً بہت عزیز رہی ہوں گی۔ قیامِ پاکستان کے بعد جو جدوجہد ہوئی، اس کی ان کی اپنی تشریح ہے۔ ان کے لیے فکر کے امام بھی وہ لوگ تھے جو خاص طور پر اس تصور کے نک سک درست کر رہے تھے۔ اِس مقابلے میں وہ حنیف رامے کے بہت قائل ہیں۔ رامے صاحب کے ساتھ وہ پروفیسر محمد عثمان، غلام احمد پرویز اور صفدر میر کا ذکر کرتے ہیں۔ پروفیسر محمد عثمان ذرا کم معروف ہوئے، تاہم اُن دنوں بحث کے عروج پر اُنھوں نے اسلامی سوشلزم پر ایک عمدہ کتاب لکھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب محاذ گرم تھا۔ غلام احمد پرویز کے مذہبی نظریات ایک طرح کی عقل پرستی پر مبنی تھے۔ منکرِ حدیث اور اہلِ قرآن ہونے کی اُن پر پھبتی کسی جاتی تھی۔ اخبارات میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے جواب میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ فتنۂ انکارِ حدیث میں وہ گویا پیش پیش تھے۔ وہ بھی خود کو اقبال کے شارح سمجھتے تھے۔ کسی کو پرویزی کہنا آج بھی ایک مخصوص معنی رکھتا ہے۔ رہے صفدر میر تو وہ اَدب میں بائیں

بازو کے بڑے جی دار نمائندہ تھے۔ پاکستان ٹائمز میں ''زینو'' کے قلمی نام سے مضامین لکھا کرتے تھے جن میں حسن عسکری، انتظار حسین، سلیم احمد ادریس دین کے دوسرے ادیبوں کو نشانہ بناتے تھے، تاہم اُن کی حب الوطنی کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ 1965ء کی جنگ شروع ہوئی، تو وہ ایک جیپ میں بیٹھ کر لاہور کے مال روڈ پر نکل آئے اور لاؤڈ سپیکر پر اپنی دوشہرہ آفاق نظموں سے دلوں کو گرمانے لگے:

چلو واہگے کی سرحد پر
وطن پر وقت آیا ہے
وطن پر کٹ کے مرجانے کا یارو وقت آیا ہے

یا پھر ایک دوسری نظم تھی جس میں توپوں کے دہانے علی حیدر کے نعرے اگلتے تھے۔ اِس پورے فکری گروپ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک صاحب ان کی معیت میں کہاں کھڑے تھے۔ تاہم وہ ان میں حنیف رامے کے بہت قریب تھے، اِتنے قریب کہ جب رامے صاحب پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بنے، تو ملک صاحب نے ان کے مشیر کا عہدہ قبول کر لیا۔ رامے صاحب اِس منصب تک پہنچنے والے شہری پنجاب کے پہلے وزیرِ اعلیٰ تھے اور ذرا سوچنے سمجھنے والوں کو جاگیردار ملک غلام مصطفیٰ کھر کے مقابلے میں بہت اچھے لگتے تھے۔ رامے صاحب معاملاتِ حیات پر بہت گہری نظر رکھنے والے دانشور تھے۔ وہ پبلشر بھی تھے، آرٹسٹ بھی تھے اور بقول ملک صاحب اُنھوں نے گویا دنیا سے کٹ کر قرآن پر بہت تدبر کر رکھا تھا۔ غالباً ایک شیخ صلاح الدین تھے جو مطالعۂ قرآن میں اِس گروپ کی فکری رہنمائی کیا کرتے تھے۔ رامے نے 'نصرت' نام کا ایک جریدہ جاری کیا تھا جس میں بڑی معنی خیز بحثیں ہوتی تھیں۔ اُن دنوں اس پرچے نے اسلامی سوشلزم پر ایک خصوصی نمبر نکالا تھا جس کی ملک صاحب درست طور پر تعریف کرتے ہیں۔ دوسری جانب پروفیسر خورشید احمد کی ادارت میں ''چراغِ راہ'' نے اسلامی سوشلزم پر ایک تاریخی نمبر شائع کیا جس کے بہت چرچے ہوئے۔ اس کے بعد بقول ملک صاحب اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہفت روزہ ''زندگی'' کا اجرا کیا گیا۔ بس یوں سمجھ لیجیے، ملک صاحب سے یہی ہماری لڑائی ہے۔ نصرت (یا مساوات) بمقابلہ چراغِ راہ/ زندگی۔ ملک صاحب کا خیال ہے نصرت کی فکر جیت گئی، کیونکہ بھٹو صاحب نے انتخابات کا پالا مار لیا تھا۔ ہمارا تجزیہ دوسرا ہے۔

ملک صاحب، حنیف رامے کی اسلام فہمی کے بہت قائل ہیں جنھوں نے ایک طویل عرصہ خلوت میں بیٹھ کر قرآن کو سمجھا۔ ان کے خیال میں یہی فکر اسلام کی اصل تعبیر تھی۔ اس کے مقابلے میں مُلّا ایک دقیانوسی سوچ رکھتے تھے۔ ہر لبرل دانشور کی طرح وہ علما کے تحریکِ پاکستان میں کردار پر بھی معترض ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی کا اقبال سے ٹکراؤ تو خیر مسلّم ہے اور دیوبند کا کانگرس سے اتحاد بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، مگر باقی سب کہانیاں ہیں۔ اِس گروہ کے سوا علما اور مشائخ کی ایک بڑی تعداد نے تحریکِ پاکستان کا کھل کر ساتھ دیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا احتشام الحق تھانوی سے وہ اِس لیے ناراض ہیں کہ اُنھوں نے اشتراکی طوفان کے مقابلے میں اپنا ایک الگ تشخص قائم کیا۔ وہ پہلے ہی جمعیت علمائے اسلام قائم کر چکے تھے (ملک صاحب نے اسے جمعیت العلمائے پاکستان لکھا ہے جو بریلوی مکتبۂ فکر کے لوگوں کی تنظیم تھی اور جنھوں نے مولانا بھاشانی کی ٹوبہ ٹیک سنگھ والی کسان کانفرنس کے جواب

میں اِسی شہر میں سنی کانفرنس کا انعقاد کیا اور 1970ء کے انتخابات میں مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا عبدالستار خاں نیازی کی قیادت میں اپنے وجود کا خوب ثبوت دیا)، چونکہ دیوبندی علما کے دوسرے گروپ کے احباب مفتی محمود وغیرہ کے خیالات سوشلسٹوں کے قریب تھے، اِس لیے تھانوی مکتبِ فکر کے ان علما نے ایک فتویٰ جاری کیا جس پر 113 علما کے دستخط تھے۔ اُنھوں نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کو بھی رد کیا اور نیشنلزم کو بھی مسترد کیا۔ ان لوگوں کی پاکستان کے لیے خدمات ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ ان کا اور سنی کانفرنس والے علما اور مشائخ کا سوشلزم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے سوشلزم کے خلاف محاذ کا ذکر ہمارے دانشور حضرات کرنے کو تیار نہیں ہیں اور یہ تاویل دیتے ہیں یہ سب گویا ان سے کرایا گیا تھا۔ بہرحال ان کا یہ خیال ہے کہ جاگیرداروں اور سائنٹیفک سوشلسٹوں نے اس میں مصلحت سمجھی کہ بھٹو کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ اور یوں وہ سب اس پاکستان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جو پاکستان کا اصل نظریہ تھا یعنی اسلامی سوشلزم۔ اس نعرے کو مقبول کرنے میں دراصل بھٹو کا ہاتھ تھا۔ بھٹو صاحب نے اپنے انتخابی منشور میں اعلان کیا کہ اسلام ان کا دین، جمہوریت سیاست اور سوشلزم معیشت ہے۔ جب اس پر شور اُٹھا تو خود کو کمیونزم سے ممتاز کرنے کے لیے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی گئی جو آخر میں مساواتِ محمدی ﷺ میں تبدیل کر دی گئی۔ یہ اُس زمانے میں دانشوری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بائیں بازو کو پہلی بار اس ملک میں پذیرائی ملی۔ اسلام کی طاقت مگر اتنی مضبوط تھی کہ بالآخر بھٹو صاحب کے زمانے ہی میں ختمِ نبوت کی تحریک نے فیصلہ کُن فتح حاصل کی تو اسے بھٹو صاحب کے لیے تمغۂ افتخار سمجھا گیا۔ ملک صاحب اس کے کریڈٹ میں رامے صاحب کی وزارتِ اعلیٰ کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ جاتے جاتے بھٹو صاحب نے شراب پر پابندی لگا دی اور اتوار کی جگہ جمعہ کی چھٹی کر دی۔ مطلب یہ کہ اُنھیں اندازہ تھا کہ اُن کے خیالات اور اُن کی سیاست پر اب بھی بے دینی کے اثرات کو غالب سمجھا جاتا ہے۔ اِس پوری بحث کو اختصار سے بیان کرتے ہوئے چند نکات درج کرتے ہیں۔ وگرنہ بات بہت پھیل جائے گی۔

کلیہ سازی (Theorisation) اگرچہ چھوٹے آدمیوں کا کام نہیں ہے، تاہم اِس میں مسئلہ یہ ہے کہ آدمی اپنی تھیوری سے رفاقت نبھاتے ہوئے بعض اوقات ایسے نتائج تک پہنچ جاتا ہے جو درست نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر کارل مارکس کا تاریخ کے بارے میں اپنا مکمل اور جامع کلیہ یا نظریہ ہے جس سے ہم سب واقف ہیں۔ تاہم کئی ایسے مواقع آئے جب مارکس نے اِس کلیے کا عملی اطلاق کرنا چاہا، تو نتائج غلط نکلے۔ ملک صاحب بھی ماشاء اللہ ایک صاحبِ بصیرت کلیہ ساز ہیں۔ وہ پاکستان کی تاریخ کو اپنی مخصوص تھیوری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اِس میں بعض اوقات ایسے نتائج تک پہنچتے ہیں جو محلِ نظر ہیں۔ مثال کے طور پر اُنھوں نے یہ کلیہ طے کر رکھا ہے کہ تحریکِ پاکستان کی ملّا کی قدامت پسندی سے جنگ تھی۔ ایک طرف اقبال کی جدت پسندی تھی، دوسری طرف ملّا کی تنگ نظری۔ اس جنگ میں اقبال جیت گئے جس کا ثبوت یہ ہے کہ پاکستان بن گیا اور ملّا ہار گیا، کیونکہ اُنھیں عوام نے مسترد کر دیا۔

علمائے ہند کے بارے میں اِس عمومی رویّے نے بہت سے لوگوں کو مخصوص نتائج تک پہنچایا ہے۔ اس میں آدمی بعض اوقات غلط نتائج اخذ کر لیتا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا احتشام الحق تھانوی کی

کانگرسی علما سے واضح مخالفت کے باوجود ملک صاحب ان علما کے کردار کو بھی منفی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان علما کا تحریکِ پاکستان میں ایک عملی کردار رہا ہے۔ ان علما نے جب 1970ء کی دہائی میں پیدا ہونے والی نظریاتی بحث میں اشتراکیت کے خلاف فتویٰ جاری کیا، تو ملک صاحب ان کی تحریکِ پاکستان میں ساری خدمات کو بھول بھال کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ ملّا ہوتے ہی ایسے ہیں۔ حالانکہ اس فتوے کی ضرورت اِس لیے محسوس ہوئی کہ اُس وقت قدیم کانگرسی علما نے سیاسی طور پر اشتراکیت کا ساتھ دیا۔ اِس فتوے پر 113 علما کے دستخط تھے۔ اِس فتویٰ میں واضح طور پر اشتراکیت کو دین دشمن نظریہ قرار دِیا گیا۔ اس وقت ملک صاحب ویسے بھی پیپلز پارٹی کے ساتھ تھے اور سمجھ رہے تھے کہ وہ انقلاب آ رہا ہے جو تخلیقِ پاکستان کا مقصود تھا۔ وہ بھٹو کی فکر کے حامی تھے اور سمجھتے تھے اسلامیانِ پاکستان کی نجات اسی اسلامی سوشلزم میں ہے اور یہ کہ یہی قیامِ پاکستان کا اصل مقصد تھا اور یہی اسلام کی درست تعبیر ہے۔ چونکہ یہ لیکچر اس زمانے میں امریکا میں دیا گیا جب بھٹو راج قائم ہو چکا تھا، اِس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان اپنی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ اقبال جیت گیا اور ملّا ہار گیا۔

1970ء کے بعد کا زمانہ تو خیر آسانی سے بھٹو یا اسلامی سوشلزم کے حامی دانشوروں کے نام لکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ملک صاحب کی نظر میں مرکزی شخصیت حنیف رامے تھی، تاہم قیامِ پاکستان سے ایوب خاں کے مارشل لا تک کی تاریخ اُنھوں نے جس سیاسی گروہ کو معنون کی ہے، اِس میں مرکزی کردار میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات کی آزاد پاکستان پارٹی کا تھا۔ یوں لگتا ہے ایک طرف ملّا تھا، تو دوسری طرف ان لوگوں کی ترقی پسندانہ انقلابی سوچ۔ میاں افتخار الدین بلاشبہ پاکستان کی انقلابی تاریخ کا ایک اہم نام ہے۔ اُن دنوں لاہور کشمیری اور اَرائیں سیاست میں بٹا ہوا تھا۔ کشمیریوں کی قیادت علامہ اقبال کے سمدھی میاں امیر الدین کر رہے تھے جن کے پوتے یوسف صلاح الدین آج بھی ہمارے روایتی کلچر کی نشانی ہیں۔ ارائیں برادری کے قائد میاں افتخار الدین تھے۔ لاہور کی اُس وقت کی زرعی زمین کے ایک بڑے رقبہ کے وہ مالک تھے۔ یوں سمجھیے رئیسِ اعظم تھے۔ پاکستان بنتے ہی پروگریسو پیپرز کی بنیاد رکھی۔ پاکستان ٹائمز اور اِمروز جیسے معیاری اخبار جاری کیے۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، چراغ حسن حسرت جیسے ترقی پسندوں کو اپنی ادارتی ٹیم میں شامل کیا۔ اُن کے رُوس سے کاروباری مفادات بھی تھے۔ اِس سے ہٹ کر بھی وہ ایک وضع دار شخص تھے۔ ملک صاحب کی امیدوں کا مرکز اُس زمانے میں اُن کی ذات اور اُن کی نوتشکیل پارٹی ہے۔ یہ گویا حنیف رامے سے پہلے کی بات ہے۔ ایسے لگتا ہے ایک طرف ملّا تھا تو دوسری طرف ان لوگوں کی ترقی پسند فکر۔ ویسے اُس زمانے میں مسلم لیگ کی زرعی اصلاحات کی کوششوں میں ایک بڑا نام ممتاز دَولتانہ کا تھا۔ دولتانہ کی سیاست کو ایک طبقہ بوجوہ پسند نہیں کرتا تھا، مگر ملک صاحب نے اپنے تجزیے میں اُن کی زرعی اصلاحات کی انقلابی کوششوں کو بھی اہمیت نہیں دی تو اس کی وجہ یہ نہ تھی۔ یہاں مگر ایک سوال اہم ہے کہ ان کے مخالف ملّا تھے یا جاگیرداروں اور زمینداروں کا ایک بڑا طبقہ۔ وہ لوگ جو ملّا نہیں پنجاب کی جمہوری سیاست کے بڑے اہم ستون تھے۔ پہلا نام مستقبل کے بابائے جمہوریت نواب زادہ نصراللہ خاں، دوسرا نام نواب آف کالا باغ، تیسرا نام کرنل عابد حسین (سیدہ عابدہ حسین کے والدِ محترم) اور چوتھا نام

نوبہار شاہ (سید فخر امام کے گویا والد) کا تھا۔ اُنھوں نے مل کر ایک مزاحمتی گروپ بنایا۔ نام رکھا انجمنِ تحفظِ حقوق زمینداراں تحت الشرکیہ۔ نام ہی بتانے کے لیے کافی ہے کہ یہ لوگ کیا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کی پشت پر ملّا نہیں تھے۔ یہ ہماری جاگیردارانہ سوچ کا نتیجہ تھا۔

بلوچستان پر جو باب ہے، وہ اگرچہ اس قبائلی اور جاگیرداری نظام کے خلاف ہے مگر اس کی تشریح میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ آتی ہے کہ پیپلز پارٹی کے زمانے میں وہاں فیصلہ کن فوجی آپریشن کیا گیا جس نے بلوچستان کو ہلا کر رکھ دیا اور بلوچستان آج تک اس کے اثرات سے نکل نہ سکا۔ کلیہ سازی

جناب سجاد میر نے اپنے مضمون میں بائیں بازو کے عظیم دانش ور ڈاکٹر فتح محمد ملک کی کتاب Islam Versus Islam کے حوالے سے اُس پورے عہد کا نہایت دانش مندانہ انداز میں جائزہ لیا ہے جب ملک میں سوشلزم کے حق اور مخالفت میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور قوم بری طرح تقسیم ہوگئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہفت روزہ زندگی کے اجرا کا سب سے بڑا مقصد اپنے قارئین کی سیاسی تربیت اور اُنھیں الحاد اور سوشلزم کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنا تھا اور اس پورے عمل میں ایک تہذیبی شائستگی قائم رہی۔ یہ علمی سطح پر بھرپور مزاحمت ہی کا نتیجہ تھا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت کو سوشلزم سے پہلے 'اسلامی' کا اضافہ کرنا پڑا۔ بھٹو صاحب اسلامی سوشلزم کے نعرے پر اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد اقتدار میں تو آ گئے، مگر اُن کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ عوام اُنھیں بے دین سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے، شراب اور جوئے پر پابندی لگانے اور اتوار کے بجائے جمعہ کو چھٹی کا دن قرار دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں ہمارے ساتھ پہلا رابطہ جناب فتح محمد ملک نے قائم کیا تھا۔ وہ اُن دنوں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ جناب محمد حنیف رامے کے پریس سیکرٹری تھے۔ ہمارے بار بار کے انکار کے باوجود وہ ہمیں کار کا پرمٹ دینے میں کامیاب رہے۔ یہی کہتے تھے کہ یہ آپ پر حکومت کا کوئی احسان نہیں، بلکہ یہ ایک صحافی کا حق ہے۔ اُن کے ساتھ علمی سطح پر تعلقات خوشگوار چلے آ رہے ہیں کہ وہ مسلم قومیت کو تخلیقِ پاکستان کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور اُن اصحاب کو مسکت جواب دیتے ہیں جو علامہ اقبال کو ایک سیکولر شخصیت ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے ہیں۔

میں یہ شہادت دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب حنیف رامے قرآنی تعلیمات کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ اُن کے ساتھ 1976ء میں کئی ملاقاتیں ہوئیں جب ہم جیل میں تھے۔ ہمارے نظریات ایک دوسرے سے مختلف تھے، مگر احترام کا رشتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ وہ مجھے جب کسی تقریب میں دیکھتے، تو خود چل کر میرے پاس آتے اور بڑی تکریم کا مظاہرہ کرتے۔ وہ عمر کے آخری حصے میں بہت منہ زور اور فوج کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ اپنے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے اُنھوں نے **پائنا** کے سیمینار میں شرکت کی تھی جو 2005ء کے زلزلے کے اثرات پر قابو پانے کے سلسلے میں منعقد کیا گیا تھا۔ پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول صدارت فرما رہے تھے۔ جناب حنیف رامے نے بہت طیش کی حالت میں کہا تھا کہ فوج نے چھوڑا ہی کیا ہے جو ہم زخموں پہ مرہم رکھ سکیں۔ اُن کی آواز میں غصے سے کہیں زیادہ سیاست دانوں کا سب کچھ لُٹ جانے کا بے اندازہ کرب اور بے کراں غم تھا۔

الطاف حسن قریشی

بعض اوقات نظریاتی سے زیادہ عملی تقاضوں کے تابع ہو جاتی ہے۔ یہاں ایسا ہی ہوا ہے۔

ویسے یہ ایک مکتبِ فکر ہے جو سمجھتا ہے کہ اسلام دو طرح کا ہے۔ عام طور پر ایک طرف ملائیت ہوا کرتی ہے اور دُوسری طرف ترقی پسندی بھی ہو سکتی ہے یا خردافروزی بھی یا محض جدیدیت۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہم خوبصورت الفاظ کے سہارے جناح اور اقبال کا پاکستان کہہ دیں یا جناح اور اِقبال کا اسلام کہیں۔ دونوں باتیں چل سکتی ہیں۔ اس سے آپ کی کیا مراد ہے، کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ اِس کتاب کے تناظر میں ملا اِزم کے مقابلے میں ملک صاحب نے اسلامی سوشلزم کو رکھا ہے جو ہر رجعت پسند سوچ کا مقابلہ کرتی ہے۔ آپ چاہیں، تو یہ کہہ لیں کہ مصنف اِس مکالمے میں اپنے مؤقف پر مضبوطی سے ڈٹے ہوئے ہیں یا یہ کہہ لیں کلیہ سازی نے بعض پہلو اُن کی نظر سے اوجھل کر دیے ہیں۔

اِس حوالے سے ایک بحث ہمارے ہاں بہت رائج رہی ہے اور وہ ہے نظریہ پاکستان کی بحث۔ نظریاتی بحث کا آغاز ہمارے ہاں خلیفہ عبدالحکیم سے ہوا جو ڈاکٹر جاوید اقبال سے ہوتا ہوا کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور پاکستان کے نامور مؤرخ ڈاکٹر اشتیاق قریشی تک پہنچا۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ اصطلاح اسلام پسندوں کی وضع کردہ ہے اور ملا ازم کی ترویج کے لیے ہے۔ بعض لوگ اس کے سراغ میں پنجاب اسمبلی کی کارروائیوں تک جاتے ہیں جہاں سیکولر عناصر اسے اِس لیے استعمال کرتے تھے تاکہ اسلام کا لفظ استعمال نہ کرنا پڑے۔ ہمارے ملک صاحب کو بھی یہ اصطلاح پسند نہیں ہے اور یہ ناپسندیدگی انھیں کئی ایسے نتائج تک پہنچاتی ہے جو شاید زیادہ مناسب نہ ہو، مگر ہے یہ ایک بڑی توانا اور جاندار بحث۔ اِس طرح ملک صاحب قیامِ پاکستان کو مسلم قومیت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں ملّا اس کے مقابلے میں پورے ہندوستان کو ایک قوم سمجھتا تھا۔ مسلم قومیت کے تصور میں یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ اس ملک کا قیام ان معنوں میں کسی اسلامی ریاست کے لیے نہیں ہوا تھا جو اسلامی نظام کو نافذ کرنا چاہتی ہو۔ شاید مسلم اور اسلامی کا فرق بھی بہت سے معنی رکھتا ہے۔ اس میں دلچسپ پہلو تب نکلتا ہے جب کوئی پاکستان میں خلافت قائم کرنے کی بات کرتا تھا۔ چودھری خلیق الزماں کا اِس حوالے سے ذکر آتا ہے، تو یہ ذہن اسے اسلامی امپریلزم قرار دیتا ہے۔ دنیا میں ایک مضبوط اور جدید اسلامی سلطنت۔ اصل میں اس کی پشت پر یہ خوف بھی ہے کہ چاہے یہ خلافت ایک قومی ریاست یعنی پاکستان کے اندر ہی قائم کیوں نہ ہو اور عالمگیر نہ بھی ہو تو بھی یہ اسلامی زندگی کا تصور لیے ہوئے ہوگی۔

مجھے یہ بحث اب ختم کرنا ہے۔ وگرنہ اِس کتاب میں بے شمار نکات ایسے ہیں جن پر الگ الگ اور کھل کر گفتگو ہونا چاہیے۔ اِس سے صرف تاریخِ پاکستان کے بہت سے گوشے ہی بے نقاب نہیں ہوں گے، بلکہ فکری مغالطوں کے بہت سے پہلو بھی نمایاں ہوں گے۔

بہرحال فتح محمد ملک کو داد دینا پڑتی ہے کہ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ نوجوانوں سے زیادہ جواں مردی سے لکھنے لکھانے کے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ میں نے انھیں بائیں بازو کا محبِ وطن دانشور کہا تھا۔ دوبارہ کہتا ہوں کہ اگر کسی نے حب الوطنی میں ڈوبی ہوئی بائیں بازو کی سوچ کا مطالعہ کرنا ہے، تو وہ ان کی تحریروں کو ضرور پڑھے۔ یہ پاکستان کا ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔

◆◆◆

ضیاالاسلام زبیری

دوست کی جُدائی

انسان دوست اور معاشرے کی ہمدرد شخصیت کے بچھڑنے کا دُکھ کون بھولے؟

کرونا کا عذاب پاکستان پر پنجے گاڑ چکا اور کوئی دن ایسا نہیں کہ دوستوں، رشتہ داروں، شناساؤں اور دل کے ٹکڑے جیسی قربت رکھنے والے خاک میں گم نہ ہوں۔ صرف فیس بک پر نظر دوڑائیں تو میں غالباً روزانہ ایک درجن تعزیتی پیغامات لکھ رہا ہوں۔ کسی کا بھائی تو کسی کا بیٹا اور کسی کے ماں باپ رخصت ہو رہے۔ اسلام آباد سے بس ایک ہی آواز آ رہی ہے کہ آپ نے گھبرانا نہیں ہے۔ جس عفریت کے بارے میں وزیراعظم صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ تو بس عام سا فلو ہے، وہ موت کے پروانے لیے گھر پر گھر اُجاڑ رہا ہے۔ اور وزیراعظم کے ساتھی اپنی صفوں میں چھانٹی کرنے کے بجائے عوام کو کوسنے دے رہے اور انھیں جاہل قرار دے رہے ہیں۔ گویا اس ہولناک وبا کے آندھی کی طرح پھیلنے کی ذمہ دار بھی عوام پاکستان ہیں حکمران نہیں۔ وبا کی اس آندھی میں میرا دل بھی اُجڑ گیا۔ میرا پیارا ساتھی، پچاس سال کے شب و روز کا ہمدم، انسان دوست جس کی دوستی، شفقت، محبت اور عظمت کے لیے الفاظ نہیں، سب کا پیارا دوست محمد فیضی بھی اس وبا کا شکار ہو کر ۱۵ جون کی صبح دارفانی سے کوچ کر گیا۔

دوست محمد فیضی ایک پُر وقار، قابل اعتماد اور انسان دوست شخصیت تھے۔ سب سے بڑی بات کہ وہ عاشق رسول ﷺ تھے۔ ان کی محافل میلاد میں تقاریر سنیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ رسول ﷺ سے محبت اور عقیدت کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان سے شناسائی جو مہینوں اور برسوں کے سفر میں مضبوط اور توانا دوستی میں تبدیل ہوگئی، زمانہ طالبعلمی کے بین الکلیاتی مباحثوں سے شروع ہوئی اور پھر دوست محمد کے عملی سیاست میں قدم رکھنے تک مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ مباحثوں کے دور میں دوست محمد ایک حریف بھی تھے اور اچھے دوست بھی۔ اس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اس دور میں تعلیمی ماحول کس قدر مختلف تھا۔ مباحثوں میں ہم ایک دوسرے کے مقابل ہوتے مگر دل سے ہم ایک دوسرے کے دوست تھے۔ جیت اور ہار کسی کے لیے ذاتی انا یا دشمنی کا سبب نہ بنتی بلکہ مباحثوں کے اختتام پر ہم ایک دوسرے کے اچھے دلائل کا اعتراف بھی کرتے اور جیتنے والے کو کھلے دل سے مبارکباد بھی دیا کرتے۔

دوست محمد کا مقام ان دنوں میں بھی عام مقرر سے ذرا اُوپر ہی ہوتا۔ جس مباحثے میں وہ آ جاتے ہم سب پہلے انعام

کا تصور چھوڑ کر دوسرے یا تیسرے انعام کی کاوشوں میں لگ جاتے۔ ان کے ساتھ کچھ اور مقرر بھی تھے جن کی تقاریر کسی بھی مباحثے کو چار چاند لگا دیتیں۔ ان میں خوش بخت، ظہور الحسن بھوپالی، سید احمد، اسد اشرف ملک، ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی، جنید فاروقی وغیرہ شامل تھے۔ دوست محمد اس وقت بھی اور عملی زندگی میں اپنی تا وقت وفات، سب کے ساتھ شرافت، متانت اور محبت کے ساتھ پیش آتے رہے۔ ان کا یہی طرزِ عمل ان کے جامعہ کراچی کے سیاسی حریفوں کے ساتھ ہوتا۔ اس زمانے میں قتل و غارت گری کا وہ ماحول تعلیمی اداروں تک نہیں پہنچا تھا۔ زیادہ مخالفت کی نوبت آ بھی جاتی تو وہ جلسے جلوس کے دوران دلچسپ مگر شائستہ جملے بازی کے ذریعہ ہوتی۔ ملک کے طالبعلموں کی سیاست واضح طور پر دائیں اور بائیں بازو کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ دوست محمد کی چونکہ تربیت اور پرورش ایک مذہبی ماحول میں ہوئی تھی لہٰذا وہ جامعہ کراچی میں اسلامی جمعیت طلبا کے حامی تھے۔ جب طلبا یونین کے سالانہ انتخابات کا وقت آتا تو وہ جامعہ کراچی کے آرٹ بلاک میں اپنی پُرزور تقاریر سے طلبا کو متاثر کرتے۔ ان کا نام جامعہ کراچی کی یونین کے صدر کے طور پر بھی سامنے آیا مگر پھر یحییٰ خان کا مارشل ، لاء لگ گیا اور انتخابات ہی نہ ہو سکے۔

۱۹۷۰ کے انتخابات کے بعد جمعیت علما پاکستان سندھ اسمبلی میں دوسری بڑی جماعت کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی اور اس میں شامل ہمارے مشترکہ دوست جناب ظہور الحسن بھوپالی سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس وجہ سے ہم سب اس جماعت سے منسلک ہو گئے۔ اس میں دوست محمد فیضی بھی شامل تھے۔ ان کی اس جماعت کا ہر فرد عزت کرتا اور وہ عام طور پر مشاورت میں شامل کیے جاتے۔ بالکل نو

جوانی میں ان کی قابلیت کے جوہر سب پر عیاں ہونے لگے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی اہم مقامات پر ان کی رائے کو سنجیدگی سے لیا گیا اور اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ میں ۱۹۷۶ میں کینیڈا چلا گیا۔ یہ شاید اچھا ہی ہوا کیونکہ میرے جانے کے کچھ دن بعد ہی دوست محمد اور سندھ کے حزب اختلاف کے سارے ممبران بھٹو صاحب کے غیض و غضب کا شکار ہو کر سکھر جیل میں مقید ہو گئے۔ دوست محمد بھی اس وقت پی این اے کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے اُمیدوار تھے اور جب انھیں مرکزی قیادت کی جانب سے انتخابات کے بائیکاٹ کا حکم ملا تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انتخابات سے دستبردار ہو گئے۔ اس کی پاداش میں انھیں سکھر جیل بھیج دیا گیا۔ سنا ہے جیل میں دوست محمد اور پروفیسر غفور میں بیڈمنٹن کے کئی بہترین مقابلے ہوئے جس کی تفصیل مجھے بعد میں دوست محمد نے سنائی۔ اس وقت بھی دوست محمد جنہوں نے کبھی جیل جانے کے بارے میں سوچا بھی نہ ہوگا، پرعزم رہے اور ان کے پائے استقلال میں کوئی لرزش نہ آئی۔ بظاہر وہ ایک بہت ہی نرم دل انسان تھے مگر اصولوں کے معاملے میں وہ کسی چٹان سے کم نہیں تھے۔ سالہا سال سیاست میں رہنے اور مختلف ادوار میں آٹھ سال تک صوبائی وزیر رہنے کے باوجود وہ جس جماعت کے بھی ساتھ رہے، اپنے اصولوں کی بنیاد پر رہے اور کبھی اپنی مقبولیت یا شہرت کا سودا نہ کیا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ کس کس جماعت نے انھیں اپنی صفوں میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ کچھ جماعتیں تو ایسی بھی تھیں کہ جن کی دعوت کوئی بھی اپنی زندگی داؤ پر لگا کر ہی مسترد کر سکتا تھا مگر فیضی نے ان کی دعوت قبول نہیں کی اور گوشہ نشینی کو بہ اصول سیاست پر ترجیح دی۔

موجودہ حکومت بھی بدعنوانی کا ڈھنڈورا پیٹ کر اقتدار میں آئی تھی اور اس سے پہلے بھی اسی گھوڑے پر بیٹھ کر کئی لوگ

ایوان اقتدار تک پہنچے مگر کسی نے عملی طور پر اُصولی اور ایماندار سیاست کا عملی مظاہرہ نہیں کیا۔ جناب دوست محمد مختلف ادوار میں تقریباً ۸ سال وزیر رہے مگر ان کا ریکارڈ بالکل شفاف اور ان کے کیے اقدامات ایمانداری اور اصول پرستی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ایک واقعہ کا تو میں خود چشم دید گواہ ہوں۔ جب وہ ٹرانسپورٹ منسٹر سندھ تھے تو ایک وفد ان سے ملنے آیا۔ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ وفد نے بتایا کہ وہ کراچی حیدر آباد کی نوتعمیر یافتہ سپر ہائی وے پر عوام کے لیے ائیر کنڈیشن وین چلانا چاہتے ہیں مگر محکمہ ٹال مٹول سے کام لے رہا اور وہ کئی ہفتوں سے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ دوست محمد نے فوری طور پر سیکرٹری ٹرانسپورٹ کو طلب کیا اور اُن سے وضاحت مانگی۔ وہ انھیں وہی گھسے پٹے جواز دیتا رہا جو سرکاری محکمے دیتے ہیں۔ دوست محمد نے کہا کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ کوئی عوام کی سہولت میں اضافہ کرنا چاہتا اور آرام دہ ٹرانسپورٹ فراہم کرنا چاہتا ہے اور ہم اسے روک رہے۔ انھوں نے حکم جاری کیا کہ معقول کرایوں کی منظوری کے بعد ایک ہفتے میں ان حضرات کو پرمٹ جاری کیا جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کراچی اور حیدر آباد کے درمیان چلنے والی پہلی بلیو لائن کمپنی تھی جس نے دونوں شہروں کے درمیان سفر آرام دہ اور محفوظ بنایا۔ وفد کے ارکان بھی حیران رہ گئے۔ نہ وزیر صاحب کا کوئی خاص مطالبہ، نہ کہیں سے میز کے نیچے سے فرمائش۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ پاکستان میں ہی ہیں۔ دوست محمد کی یہی اصولی سیاست اور نیک نامی تھی جس کی وجہ سے مرتے دم تک ہر چھوٹا بڑا، امیر رئیس اور ادنیٰ کارکن بھی ان کی بے پناہ عزت کرتا۔ زیادہ تر کارکن انھیں بھیا کہتے اور وہ تھے بھی واقعی اپنے کارکنوں اور سب دوستوں کے بھیا جو ہمہ وقت کسی بھی جائز کام میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہتے۔

پاکستان میں متوسط طبقے کی سیاست کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے مگر افسوس اس کے نام پر برسرِاقتدار آنے والوں کی زندگی بھی وڈیرہ شاہی سیاست کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ دوست محمد نے متوسط طبقے کی سیاست کا عملی نمونہ پیش کیا۔ ان کی سیاست اور سوچ صحیح معنوں میں اس طبقہ کی نمائندہ تھی۔ ایک یادگار واقعہ ہمیشہ میری اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ جب وہ صوبائی وزیر تھے تو ایک دن ہم سب کی نشست ان کے گھر پر جمی تھی۔ دوست محمد نے کہا کہ گھر والے پکنک منانے گھارو گئے ہوئے ہیں کیوں نہ ہم بھی وہیں چل کر رات کا کھانا کھائیں۔ گھارو کراچی سے کوئی ۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور کراچی والوں کے لیے تفریحی مقام کا درجہ رکھتا ہے۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے دوست محمد نے کہا کہ پولیس گارڈ کو بھی جو ان کے گھر کے باہر بیٹھا تھا، ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ جب دوست محمد نے گارڈ سے کہا کہ تم بھی گاڑی میں پیچھے بیٹھ جاؤ تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا اور پھر سرگوشی میں دوست محمد سے کہا، ''کیا میں کچھ اضافی کارتوس بھی لے لوں۔'' ہمیں اندازہ ہو گیا کہ وہ بچارہ یہ سمجھ رہا کہ صاحب کسی مخالف کے ساتھ کوئی حرکت کرنے جا رہے ہے۔ اسے اس بات کا خیال نہیں کہ جو ہونے جا رہا ہے، آیا وہ قانونی ہے یا غیر قانونی مگر اس بات کی فکر ضرور ہے کہ جب مقابلہ ہو تو کارتوس کم نہ پڑیں۔ دوست محمد نے گارڈ کو ڈانٹ کر کہا ہمیں تو اس بندوق کی بھی ضرورت نہیں، اسے پیچھے ڈگی میں ڈال دو۔ میں سوچتا رہ گیا کہ دوست محمد کی سیاست ان کے علاقے کی سیاست سے کس قدر مختلف ہے۔ گارڈ نے ایک منٹ کے لیے بھی یہ تصور نہ کیا کہ کہیں ان کا صاحب کچھ غلط کرنے تو نہیں جا رہا۔ یہ ان کے کردار کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔ حالانکہ وہ وڈیرہ شاہی سیاست کا عادی تھا جہاں یہ سب عام ہے۔ دوسری طرف دوست محمد کے لیے بھی اس کا طرزِ عمل حیران کن

تھا۔ یہ تھی ان کی صاف شفاف سیاست۔

بہت سے لوگوں کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ دوست محمد مختلف ادوار میں آٹھ سال وزیر اور اس کے علاوہ سیاسی طور پر ایک مضبوط اور مقبول راہنما ہونے کے باوجود آخر وقت تک ملازمت پیشہ رہے اور تادم وفات ایک کمپنی میں ملازمت کر رہے تھے۔ پاکستان میں شاید یہ بات لوگوں کو اس لیے حیرت میں ڈالتی ہے کیونکہ ہم اپنے راہنماؤں کے بارے میں باور کر لیتے ہیں کہ جب اقتدار کے ایوانوں میں دو چار پانچ سال گزار لیے تو پھر کسی ملازمت کی کیا ضرورت؟ مغرب میں بالکل وہی ہوتا ہے جو دوست محمد نے کیا۔ امریکی صدور بھی عہدہ چھوڑنے کے بعد یا تو جامعات میں لیکچر دے کر یا کتابیں لکھ کر یا کسی اور طریقے سے حق حلال کی روزی سے اپنا گھر چلاتے ہیں اور اسی طرح مغرب میں سارے ممبر پارلیمان بھی مدت معیاد ختم ہونے پر دوبارہ منتخب نہیں ہوتے اور اپنے سابقہ پیشے میں واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شرمندگی کی بات نہیں بلکہ ان کی عظمت ہے۔

ہمارے دوست محمد کی شان تھی کہ کبھی حق حلال کے راستے سے نہ ہٹے۔ انھی خوبیوں کی وجہ سے ہر طبقہ فکر کے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ عام طور پر دعوتوں میں جاتا اور جیسے ہی وہ کسی محفل میں داخل ہوتے سب چھوٹے بڑی ان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ میزبان کی تو گویا عید ہو جاتی۔ وہ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ چھوڑتا اور جب تک وہ وہاں موجود رہتے ان کی طرح طرح سے خدمت کرتا۔ دوست محمد بھی ہر محفل کی جان تھے۔ ان کے برجستہ جملے، حس مزاح اور ان کی علمی قابلیت ہر محفل کو چار چاند لگا دیتی۔ دوست محمد نے اپنے نام کی لاج رکھی۔ وہ ہمارے ہی نہیں پورے معاشرے کے دوست اور ہمدرد بن کر جیے۔

دوست محمد کی جدائی ان کے اہل خانہ اور دوستوں کے لیے بڑی آزمائش ہے۔ ایک ایسی دنیا میں رہنا جس میں دوست محمد نہ ہو۔ نہ جانے ہم یہ کیسے کر پائیں گے؟

◆◆◆

مرتی ہوئی بیوی کا مذاق

کسی عزیز کا انتقال ہوتا ہے تو اس دکھ سے لڑنا بھی بہت مشکل ثابت ہوتا ہے لیکن ساتھ گزارے گئے وقت کی باتیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں تاہم ایک شخص کے ساتھ مرتی ہوئی بیوی کے ایک مذاق کا علم برسوں بعد ہوا۔

لندن سے تعلق رکھنے والی ٹوئٹر صارف انتونیا نکول نے ٹویٹ کرتے ہوئے بتایا کہ میری ماں نے انتقال سے قبل میرے والد کو سخت ہدایت کی تھی کہ باتھ روم میں لگے پودوں کو پانی دینا مت بھولیں۔ والد نے اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا اور پودوں کو زندہ رکھا۔ وہ پودے اتنے زبردست ہو گئے تھے کہ انھوں نے وہ نئے گھر لے جانے کا فیصلہ کیا اور پھر ان پر انکشاف ہوا کہ وہ تو پلاسٹک کا ہے۔

انتونیا نے بتایا جب میرے والد کو علم ہوا کہ وہ برسوں سے پلاسٹک کے پودوں کو پانی دے رہے ہیں، تو یہ سب ہمارے لیے اتنا پُرمزاح تھا کہ ہمیں لگا وہ ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے محسوس ہوا کہ گویا میری والدہ اس بات کا پتہ چلنے پر قہقہے لگا رہی ہیں۔

☆☆☆

افسانہ

نورانی نور

راؤ محمد شاہد اقبال

نورانی نور ہے، ہر بلا دُور ہے۔

جیسے ہی کرنل سہیل نے سرِ راہ بیٹھے فقیر کے کاسۂ گدائی میں خیرات کی رقم ڈالی، فقیر نے باآوازِ بلند صدا لگائی۔

کرنل سہیل کو فقیر کے دعائیہ کلمات سن کر کیسا لگا؟ یہ نہیں بتایا جا سکتا، لیکن بہرحال مجھے اچھا نہیں لگا۔ یہ میرے گھر اور میرے یونٹ کے درمیان ایک شاہراہِ عام ہے۔ میں روز اسی راستے سے گزرتا ہوں۔ ہمیشہ یہ فقیر اسی راستے پر بیٹھا ہوتا ہے۔ میرا روز کا معمول ہے کہ میں لازمی اس فقیر کے کاسۂ گدائی میں حسبِ توفیق خیرات ضرور ڈالتا ہوں لیکن اس نے آج تک کبھی میرے لیے تو یہ صدا نہیں لگائی کہ

''نورانی نور ہے، ہر بلا دُور ہے''۔

میں ابھی ان خیالوں میں ہی گم تھا کہ اچانک میرے کانوں سے کرنل سہیل کی آواز ٹکرائی:

''کہاں غائب ہو؟ کہیں عجلت میں گھر پر کوئی شے تو نہیں بھول آئے۔''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن سہیل! ایک بات تو مجھے بتاؤ۔ ہر کوئی تمہارے ساتھ امتیازی سلوک کیوں کرتا ہے؟ اب اس فقیر کو ہی دیکھ لو۔ روز میں اسے خیرات دیتا ہوں لیکن مجھے تو کبھی اُس نے ایسے دعائیہ الفاظ میں دُعا نہیں دی جیسی آج تمہیں دی۔'' میں نے کہا۔

''حیرت کی بات ہے۔ ان الفاظ میں ایسا کیا ہے جو تم نے اتنا برا سا منہ بنا لیا؟ جیسے اُس نے مجھے روحانیت کی کوئی اقلیم دے دی ہو۔ مجھے تو ان الفاظ میں کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آتی، سوائے ایک دیوانے کا نعرۂ مستانہ۔'' کرنل سہیل نے حیرانگی سے کہا۔

''ہو سکتا ہے تمہیں معلوم نہ ہو لیکن ان لفظوں میں ضرور ایک خاص بات ہے۔ ویسے تو عوام الناس میں یہ ہی مشہور ہے کہ بلوچستان کے ضلع خضدا

ایسے فوجی کی کہانی جس کے اندر شہادت پانے کی خواہش تیز تر ہو رہی تھی

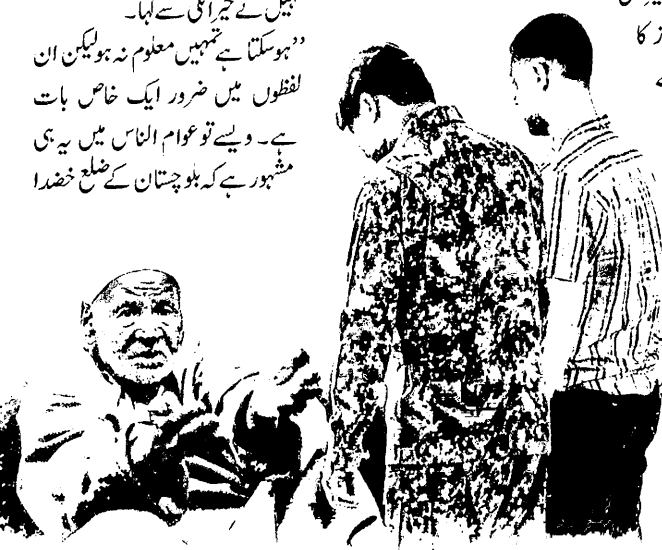

میں دشوار گزار پہاڑی راستوں میں گھری ایک جگہ ہے جہاں ایک صوفی بزرگ شاہ نورانیؒ کا مزار ہے۔ لوگ جب وہاں جاتے ہیں تو دورانِ سفر یہ صدا اکثر بلند کرتے ہیں کہ ''نورانی نور ہے، ہر بلا دور ہے'' لیکن میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ اگر شاہ نورانیؒ کا کوئی فقیر کسی شخص کو یہ صدا دُعا میں دے دے تو پھر سمجھ لو کہ اُسے دنیا میں خیر و شر کی جنگ کے لیے چن لیا گیا ہے اور پھر وہ انتہائی اہم ہو جاتا ہے'' میں نے کرنل سہیل کو وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا اگر تمہاری اس عجیب و غریب روایت کو درست بھی مان لیا جائے تو پھر بھی اس فقیر کی طرف سے مجھے دیکھ کر صرف صدا لگانے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے اپنا نعرۂ مستانہ مجھے دُعا میں دے دیا ہے۔ بھئی اُس نے اب بھی صرف ایک صدا ہی لگائی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم رائی کا پہاڑ نہ بناؤ، لیکن تمہاری ایک بات سے مجھے اس حد تک ضرور اتفاق ہے کہ شاہ نورانیؒ نے صرف مجھے ہی نہیں بلکہ پاکستانی فوج کے ہر سپاہی کو بشر کے خلاف ہونے والی فیصلہ کُن جنگ کے لیے واقعی چُن لیا ہے، کیونکہ خود مجھے بھی کئی روز سے ایسے خیالات آ رہے ہیں کہ جیسے میں شر انگیز قوتوں کے خلاف کسی فیصلہ کُن معرکہ میں برسرِ پیکار ہونے والا ہوں۔ ان ہی جذبات سے مغلوب ہو کر رات کو میں نے ایک نظم بھی لکھ ڈالی۔''

''بہت خوب بھئی!، وہ نظم کیا ہے؟ ذرا ہمیں بھی سناؤ۔''

میں نے اصرار کیا تو کرنل سہیل عابد یوں گویا ہوئے۔

میری وفا کا تقاضا کہ جاں نثار کروں
اے وطن تیری مٹی سے ایسا پیار کروں
میرے لہو سے جو تیری بہار باقی ہو
میرا نصیب کہ میں ایسا بار بار کروں
خونِ دل سے جو چمن کو بہار سونپ گیا
اے کاش ان میں خود کو شمار کروں
مری دعا ہے سہیل میں بھی شہید کہلاؤں
میں کوئی کام کبھی ایسا یادگار کروں

''یار تم نے تو کمال کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے اندر اتنا اچھا شاعر چھپا ہوا ہے''۔ میں نظم سننے کے بعد داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی نظم کی مجھ سے تعریف سننے کے بعد کرنل سہیل نے مسکراتے ہوئے کہا:

''دیکھو بھئی! نہ تو میں شاعر ہوں اور نہ ہی شاعر بننا چاہتا ہوں۔ میں ایک پاکستانی فوجی ہوں اور پاکستانی سپاہی کی ہی طرح پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ہی اس جہانِ فانی سے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔ شہادت کی آرزو مجھے بچپن سے ہے۔ اسی لیے میں پاک فوج میں بھرتی ہوا، مگر چند دنوں سے میرے اندر شہادت پانے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے میں کچھ نہیں جانتا''۔ اس سے پہلے کہ میں کرنل سہیل کو جواباً کچھ عرض کرتا میری یونٹ آ گئی اور وہ مجھے الوداع کہہ کر اپنی یونٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں بھی اپنے یونٹ میں آ کر روزمرہ دفتری ذمہ داریوں میں مصروف ہو گیا اور کیسے پورا دن گزر گیا مجھے خبر ہی نہ ہو سکی۔

رات کے کسی پہر اچانک مجھے خبر ملی کہ کرنل سہیل عابد نے ایک انٹیلیجنس آپریشن میں دہشت گردوں کے سرغنہ سمیت کئی دہشت گردوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد خود بھی جامِ شہادت نوش کر لیا ہے۔ یہ خبر سُن کر میں خدا کا شکر ادا کیے بغیر نہ رہ سکا کہ جس نے کرنل سہیل کی شہادت کی عظیم خواہش کو اپنی بارگاہ میں اِذنِ باریابی بخشا۔

بلاشبہ پاکستان میں جاری دہشت گردی کے خلاف کامیابیوں میں یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس آپریشن میں کرنل سہیل اور ان کی ٹیم نے جس دہشت گرد کو ہلاک کیا، وہ دہشت گردی کا سرغنہ تھا۔ یہ وہ گروہ تھا جو وطنِ

عزیز میں سیکورٹی اہلکاروں سمیت ہزاروں افراد کو دہشت گردی کا نشانہ بنا رہا تھا اور اس کی کارروائیاں روز بہ روز شدت اختیار کرتی جارہی تھیں۔ اب تک یہ دہشت گرد گروہ دہشت گردی کی مختلف کارروائیوں میں 100 سے زائد معصوموں کی جان لے چکا تھا۔

لیکن کرنل سہیل عابد نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک شاندار آپریشن میں دہشت گردوں کے سربراہ کو اس کے ساتھیوں سمیت جہنم واصل کرکے اپنا فرض ادا کردیا تھا۔

آج جبکہ شمالی وزیرستان کی تحصیل دتہ خیل کے علاقے خرقمر میں بارودی سرنگ کے دھماکے میں لیفٹیننٹ کرنل رشید کریم، میجر معیز، کیپٹن عارف اللہ اور لانس حوالدار ظہیر دفاع وطن میں شہید ہوجانے کی خبریں میڈیا پر چل رہی ہیں اور ان کی شہادت پر پورے ملک میں ہر طرف سے لوگ دہشت گردی کی مذمت کررہے ہیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اور سنتے ہوئے چپ چاپ سوچ رہا ہوں کہ کیا صرف لفظ ''مذمت'' کے بے دریغ استعمال سے دہشت گردی کی یہ جنگ جیتی جاسکتی ہے؟ میرے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے کہ کسی صورت بھی نہیں کیونکہ میرے نزدیک یہ جنگ اب ہمیں صرف کرنل سہیل عابد، لیفٹیننٹ کرنل رشید کریم، میجر معیز، کیپٹن عارف اللہ اور لانس حوالدار ظہیر جیسے جذبہ شہادت رکھنے والے نڈر سپاہی ہی جیت کردے سکتے ہیں۔

جیسے آج سے سینکڑوں سال پہلے بلوچستان کے ایک علاقے میں جسے ''گوکل'' نامی دیو نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور وہاں رہنے والے لوگوں کی زندگی اپنے ظلم سے اجیرن کردی تھی کہ پھر اچانک وہاں خدا کے برگزیدہ بندے شاہ نورانیؒ کی آمد ہوئی اور انھوں نے اُس بستی کے مکینوں کو ''گوکل دیو'' کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے ''گوکل دیو'' سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

یوں شاہ نورانیؒ اور ''گوکل دیو'' کے درمیان انتہائی خطرناک جنگ کا آغاز ہوا۔ بالآخر شاہ نورانیؒ نے ''گوکل دیو'' کو شکستِ فاش دے کر مظلوم لوگوں کی دلجوئی کی۔ یہ تاریخی روایت کتنی ہی ضعیف یا ''سینہ گزٹ'' سہی لیکن مجھے یقین ہے کہ شاہ نورانیؒ کی سرزمین پاکستان پر دہشت گردی کے خلاف لڑنے والے ہر پاک فوج کے سپاہی پر شاہ نورانیؒ کا خاص دستِ کرم سایہ فگن ہوگیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب امن دشمن ''گوکل دیو'' کو پاک فوج کے جری و بہادر سپاہیوں کے ہاتھوں ضرور شکستِ فاش ملے گی۔

اللہ تعالیٰ پاک فوج کے ہر سپاہی کی ہمیشہ حفاظت کرے۔ اس دعائے مستانہ کے ساتھ کہ:۔

''نورانی نور ہے، ہر بلا دُور ہے''۔

سنہرے اوراق

''تھوڑا علم زیادہ عبادت سے بہتر ہے اور انسان کے فقیہ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہی کافی ہے اور انسان کے جاہل ہونے کے لیے اپنی رائے کو پسند کرنا ہی کافی ہے۔''

(طبرانی اوسط، باب المیم، رقم ۸۶۹۸، ج ۶، ص ۲۵۷)

☆☆☆

''علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے بڑھ کر ہے اور تمہارے دین کا بہترین عمل تقویٰ یعنی پرہیزگاری ہے۔'' (طبرانی اوسط، رقم ۳۹۶۰، ج ۳، ص ۹۲)

☆☆☆

دیارغیر سے

شاہین باغ اور بیگم

دہلی میں مسلم خواتین کے تاریخ ساز احتجاج پر ایک سکھ صحافی کا چشم کشا تبصرہ

جسپال سنگھ

ایک زمانہ گزرا ہمارے ایک خیر خواہ نے ہمیں اطلاع دی کہ ہم جب دفتر میں ہوتے ہیں، ہماری بیگم صاحبہ رکشا پکڑ جامع مسجد سے اُردو بازار کی طرف جاتی ہیں۔ خبر پاتے ہی ہم چونکے۔ چونکنے کی وجہ بھی تھی۔

ہماری شادی کو ابھی ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہم نے ان کے سرہانے کے اندر چُھپے دیوان غالب کو دیکھا اور وہ بھی اُردو میں۔ اُردو ہوگی کسی زمانے میں گنگا جمنی تہذیب کی گہوارہ مگر اب اس کے لاڈ صرف مسلمان ہی اُٹھاتے ہیں۔ ہم نے لاکھ دل کو سمجھایا لیکن دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔

سوچتے رہ گئے، یا خدا یہ جامع مسجد اور پھر وہاں سے اُردو بازار اور وہ بھی ہمیں اطلاع دیے بغیر۔ یہ کہیں لو جہاد والا معاملہ تو نہیں؟ پہرہ بٹھایا گیا۔ معلوم ہوا بیگم صاحبہ نہ صرف اُردو کی کتابیں وہاں سے خریدتی ہیں بلکہ اسی علاقے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک سینٹر سے انھوں نے ادیب فاضل اور ادیب کامل کے امتحانات بھی پاس کیے ہیں۔

شکر ہے، ہم نے بجرنگ دل کو اس بات کی اطلاع نہیں دی۔ ایسا ہوتا تو ہماری بیگم اُردو بازار میں دھر لی جاتیں اور وہ جو خاص قسم کے لباس میں گھومتے ہیں، دلی کے بانکے بن کر، ان میں سے ایک دو

پہلے تو پٹتے اور پھر گرفتار ہوتے۔ ضمانت تک نہ ہوتی۔ مانا سکھ مرد ہندو لڑکی سے شادی کرسکتا ہے لیکن مسلمان مرد کسی ہندو لڑکی سے..... توبہ توبہ، لاحول پڑھیے جناب۔

اب آپ لازماً یہ سوال کریں گے کہ یہ گھر کی بات تھی، بازارِ عام میں کیوں لا رہے ہو؟ دراصل ہم اپنی بیگم سے بے حد نالاں ہیں۔ اس ماحول میں جبکہ ہر شخص اپنے لباس سے یا تو کوئی بوگی یا یوگنی ہے یا دہشت گرد، ہماری بیگم ہمیشہ اپنے سر کو ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔ اب آپ ہی سوچیے کہ ایک خاتون جو اُردو کی دیوانی ہو، غالب پر جان چھڑکتی ہو، وہ اگر سر ہی ڈھانپ کر رکھے تو کیا یہ ''آ بیل مجھے مار'' والی صورت نہ ہوگی؟ ہم نے لاکھ سمجھایا مگر وہ ہیں کہ کان پر جُوں تک نہیں رینگتی۔ کچھ کہو تو تڑ سا جواب سن لو کہ سردار نیاں سر ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔

ہم نے کہا، ''اس لباس میں تم ایک خاص مذہب سے منسوب ہو جاؤ گی اور کہیں نہ کہیں دھر لی جاؤ گی لیکن صاحب، آج کل کی عورت کو پردہ رکھنا ہے تو رکھنا ہے۔ نہیں رکھنا تو نہیں رکھنا۔ کوئی سردارنی کو مسلمان سمجھ لے تو سمجھ لے لیکن یہ جو ہر روز لباس اور مذہب کی بنا پر کوئی نہ کوئی اپنی جان گنوا رہا ہے، اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کہیں کسی روز راستے میں..... خیر چھوڑیے اور سنیے۔

آپ نے شاہین باغ کا نام سنا ہے؟ نہیں، اس کا اقبال کے شاہین سے کوئی تعلق نہیں۔ ویسے بھی علامہ کب کے دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ہمیں دراصل اُڑتی اُڑتی خبر ملی کہ بیگم بھی وہاں کے دھرنے میں جاتی ہیں۔ یہ سن کر سر پیٹ لیا کہ ایک اور نیا سیاپا آ پہنچا۔ کہا ''بیگم یہ کیا ہو رہا ہے؟''

بولیں، ''کیا ہوا؟''

پوچھا: ''آپ شاہین باغ جاتی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''وہاں تو ساری مسلمان عورتیں ہوتی ہیں۔''

تڑ سے بولیں، ''مسلمان ہیں تو کیا ہوا؟ سرداروں نے تو وہاں لنگر بھی لگا دیا ہے۔''

ہم نے کہا، ''علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ یونیورسٹی کے

کامل مومن کی پہچان

بدنگاہی کرنے والے کو اکر پتا چل جائے کہ کوئی غیر مرد اس کی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کو بری نظر سے دیکھ رہا ہے تو اس کی غیرت کو جوش آجائے اور وہ آگ بگولا ہو جائے، لہٰذا اسے غور کرنا چاہئے کہ جسے وہ دیکھ رہا ہے وہ بھی تو کسی کی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی ہے۔ یہ کیسی منطق ہے کہ جو بات اپنے لیے ناپسند ہے اسے دوسروں کے حق میں برا نہیں سمجھا جاتا؟ حالانکہ مسلمان کی شان اور کامل مومن کی پہچان تو یہ ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی پسند کرے۔

حضرت سیّدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیہ.....الخ، ۱/۱۶، حدیث: ۱۳)

اللہ عزّوجلّ ہمیں اپنی نظروں کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

طالب علموں کا حال معلوم ہے؟ دونوں کا اسلام سے تعلق ہے۔''

بولیں، ''وہاں تمام مذاہب کے بچے پڑھتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے، علیگڑھ یونیورسٹی سے سب سے پہلا گریجوایٹ کون تھا؟ وہ ہندو تھا۔''

ہم نے کہا، ''کسی کٹر سنگھی نے سن لیا تو نہ تم گھر کی رہو گی نہ ہم گھاٹ کے۔''

بولیں، ''وہ جو عورتیں کئی دن سے ٹھٹھرتی سردی میں سڑک پر بیٹھی ہیں بچوں کے ساتھ، وہ کیا بھارت کی دشمن ہیں؟ کیا حق کی آواز بلند کرنا کوئی گناہ ہے؟''

''مگر لوگ کہتے ہیں، وہ بیٹھنے کے پانچ پانچ سو روپے لیتی ہیں۔''

بولیں، ''ان کی عورتیں لیتی ہوں گی جو یہ کہتے ہیں۔''

ہم نے کہا، ''عورت کی جگہ گھر کی چار دیواری میں ہے۔''

بولیں، ''تم اکبر الہ بادی ہو کیا؟ زمانہ کروٹ بدل چکا۔ ایک نئی آواز بلند ہو رہی ہے۔ اس کی چنگھاڑ دنیا سن رہی ہے۔ تمہیں معلوم ہے، داووس (Davos) میں جارج ساروز نے کیا کہا؟ عورت اب بچوں کی ماں ہی نہیں رہی، وہ اب انقلاب بھی پیدا کرتی ہے۔''

ہم نے کہا، ''شاہین باغ جاتی ہو، جاؤ لیکن خدا کے واسطے وہاں ''آزادی'' کا نعرہ نہ لگانا نہیں تو غداری کے جرم میں دھر لی جاؤ گی۔ ہمارے محترم یوپی کے چیف منسٹر صاحب نے تو اس کا اعلان بھی کر دیا کہ ''آزادی'' کا نعرہ لگا تو حوالات کی سیر کرنا پڑے گی۔''

بولیں: ''آزادی کا مطلب سمجھتے ہو؟ انگریزی میں اسے فریڈم کہتے ہیں اور ہمارا آئین یہ کہتا ہے کہ ہر شخص کو آزادی ہے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی۔ تم تو قانون داں ہو۔ ایمرجنسی (emergency) کے دنوں میں جب اندرا گاندھی کی حکومت تھی، کچھ لوگ چنڈی گڑھ میں سڑک پر کھڑے ''اندرا گاندھی مردہ باد'' کے نعرے لگاتے پکڑے گئے۔ ان پہ غداری کا مقدمہ بن گیا۔ سپریم کورٹ نے کہا، چونکہ ان نعروں سے امن و امان میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ لہٰذا یہ غداری کا کیس نہیں بنتا۔ اب بتاؤ صرف ''آزادی'' کا نعرہ لگانا کیا ہمارے آئین اور قوانین کے خلاف ہے؟ کون سا قانون توڑ رہی ہیں وہ عورتیں؟''

ہم نے کہا ''بیگم ہم پر کیوں برس رہی ہو؟ یوگی جی سے کہو نہ جا کر کہ آئین کا صرف ابتدائیہ (Preamble) ہی پڑھ لیں۔''

بولیں: ''کیا یہاں آئین ہے؟ قوانین ہیں؟ عدالتیں ہیں؟''

ہم ہار مانتے ہوئے بولے: ''بیگم ماحول ٹھیک نہیں۔ تمہیں معلوم ہے وہ فیض احمد فیض کی نظم ''ہم دیکھیں گے''، وہ جس میں ''بت توڑے جائیں گے'' آتا ہے۔ معلوم ہے اس پر ایک کمیشن بیٹھ گیا ہے کہ آیا یہ ہندو دھرم کے خلاف ہے۔''

ہماری بیگم پہلی بار مسکرائیں۔ بولیں ''فیض کا وہ شعر یاد ہے:

بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں''

ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''بیگم یہ شعر پھر نہ پڑھنا۔ بس دعا کرو کہ حکومت وقت اور عدالتیں قانون کے دائرے میں رہیں، اپنے ذاتی مفاد سے اُوپر اُٹھ کر۔''

ہماری بیگم اور سینکڑوں خواتین گود میں بچے لیے ہوئے اس وقت بھی شاہین باغ میں ایک انصاف پسند ماحول پانے کی خاطر نعرے لگا رہی ہوں گی..... اس وشواس میں کہ حق کی آواز بلند کرنا کوئی گناہ نہیں اور یہ کہ اختلاف جمہوریت کا حُسن ہے۔''

◆◆◆

آغا گل

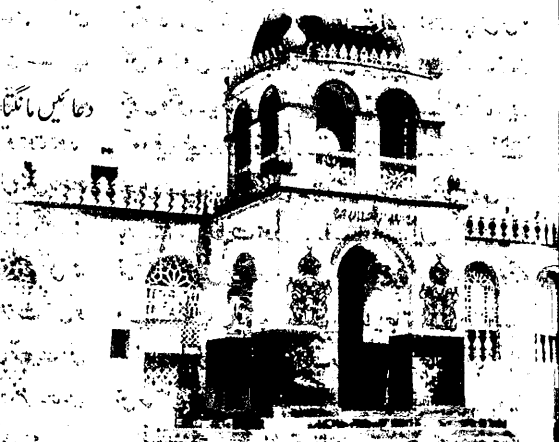

عربدہ میدان

مسجد کی ہمارے معاشرے میں وہی اہمیت ہے جو جسم میں دل کی ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا خود بخود دھڑکے جاتا ہے، مسجد میں بھی اذانیں، نمازیں ہوتیں رہیں، سب کچھ دریا کی روانی سا خود ہی جیسے ہوتا چلا جاتا ہو۔ میرے والد میرا ہاتھ تھام لیتے یا میں ان کی انگلی پکڑ کر مسجد میں جایا کرتا۔ کیونکہ نماز مغرب کے بعد مجھے ایک لڈو ملا کرتا۔ مجھے لڈو سے بہت دلچسپی تھی۔ وضو بنا ٹوپی سر پہ رکھ کر میں نماز باجماعت کا مشتاق رہتا۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ میرے والد ایک ڈبہ خود ہی بھجوا دیا کرتے کہ طالب مجھے ایک لڈو دے دیا کرے۔ امتحانات کے دنوں میں یہ نماز زیادہ پابندی سے ادا کرتا۔ کامیابی کے لیے دعائیں مانگتا۔ ایک ساتھی نے وظیفہ بھی حفظ کرا دیا تھا۔ یا فتح یا فتح کیو جی۔ بچوں کا امتحان نرم لیو جی۔ امتحان کی سختی گزر جاتی، کامیابی ہوتی تو سماجی دستور کے مطابق مٹھائی کے ڈبے لیے طلبا مسجد میں جاتے پیش امام کو مٹھائی پیش کرتے جو طالبان اور نمازیوں میں بٹ جاتی۔ طالبان، کا تعلق غریب گھرانوں سے ہوا کرتا، والدین، گھر، عزیز و اقارب سے کہیں دور دہ

دن کے اُجالے میں وہ بات نہ کر پایا تو رات کے اندھیرے کا انتخاب کر بیٹھا

دُور وہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مسجدوں میں رہا کرتے، صفائی ستھرائی صفیں درست کرنا اور ختم قرآن کے لیے گھروں میں جا کر ہلتے ہلتے سپارے پڑھنا۔ وہ گھروں سے دُور رہتے، احساس تنہائی تو ہوتا ہوگا، مگر کبھی بھی ذکر نہ کرتے اسی دُوری نے ان کے دل میں بہت سی محبت بھر دی تھی۔ سبھی سے ملتے، کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرتے، بڑی ٹیلو، پتنگ بازی سے دُور رہتے کینچے بھی نہ کھیلتے۔ انیس نے عالم دین بننا تھا۔ لہٰذا ان کی عزت نفس کو اُبھار کر رول ماڈل بنانے کے لیے لڑکپن سے ہی تربیت دی جاتی۔ ان کے گھر بہت دُور ہوا کرتے گواش، کولواہ، مزار حاجی پیر، ژڑخو، ژڑری، ڈمیارہ، قمر دین کاریز غرضیکہ دور کے علاقوں سے چلے آتے، سبھی ان کو عزت و تکریم دیا کرتے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نیلا گنبد جیسے بڑے مدرسوں میں چلے جایا کرتے۔ صحاسنہ، علم صرف نحو بلکہ پورا درس نظامی انھیں پڑھایا جاتا۔ ان کی شخصیت کی نشوونما اور عادات پہ گہری نظر رکھی جاتی شخصیت سازی اہم ہوا کرتی بہت سے موسم بدلے بہت سے مولوی آئے گئے، طالبان آتے جاتے رہے مدرسوں سے دستار فضیلت سجا کر نکلے اور علماء کہلاتے۔

جوان ہوا تو پیش امام سے سلام دعا علیک سلیک کے علاوہ کتابیں بھی مستعار لینے لگا۔ شرح ملا جامی، تفسیر جلالین۔ نورالانوار بلکہ ان کی مدد سے عربی شاعری بھی پڑھنے کی کوشش کی۔ شعراء کے اپنے اپنے انداز تھے۔ گھوڑوں کا بیان ابو داؤد کا شراب کا اوس حجر شتر مرغ علقمہ بن عربہ معذرت خواہی کا بیان نابغہ پر ختم تھا۔ علقمہ اصیل بدوی شاعر تھا۔ عنترہ اور پھر امراء القیس کی مجمل توڑ محبت والی شاعری۔ حجرے میں عموماً ''نماز عصر کے بعد ہی محفل جمتی جس میں میری حیثیت سامع کی ہوتی ہے۔ بچے بھی سپارے لیے چلے آتے۔

سینئر طالبان انھیں سپارے پڑھاتے اعادہ ہوتا۔ بچوں کی ملی جلی آوازوں سے عجیب سا مسحور کن ترنم پیدا ہوتا۔ نماز میں بچوں کو بھی لایا جاتا۔ وہ آخری صف میں کھڑے ہو کر نمازیوں کو دیکھ دیکھ کر رکوع و سجود کرتے۔ نماز مغرب کے بعد نکلتے تو بچیاں اپنے بیمار بھائیوں پہ پھونکیں مارتیں۔ جن بچوں کے بارے میں شکایت ہوتی کہ روتے بہت ہیں۔ انھیں بھی نمازی دعائیں پڑھ کر سروں پہ ہاتھ پھیر پھیر کر گھروں کو بھجوا دیتے۔ کچھ بچوں کو مسجد کے صحن میں لایا جاتا کہ مٹی کھاتا ہے۔ غرضیکہ ہماری مسجد چشموی ایک روحانی مرکز تھا، یہ امتیاز ہمیں ہی حاصل نہ تھا بلکہ ہر مسجد کی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ پردیسی مسافر نماز مغرب کے بعد ہی بتلا دیتے کہ مسجد میں قیام ہوگا۔ طالبان ان کی تعداد گن کر علاقے کے مخیر حضرات سے اضافی کھانا طلب کرنے چپکے سے نکل جاتے۔

سریلی آوازوں میں ژیرہ طلب کرتے ''مسجد کا روٹی لاؤ جی''۔

مولوی صاحب علم، پیکر انکسار، بامروت، مہمان نواز اور انسان دوست ہوا کرتے۔ خاکروب کے بچے کو بھی سر پہ ہاتھ جما کر ویسی ہی محبت سے پھونکیں ماری جاتیں۔ دم کے لیے جاتے، محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ سبھی وہاں برابر تھے اور یوں ہوا کہ وزیر اعظم کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اسے تارا مسیح کے حوالے کر دیا گیا۔ ایک نیا مارشل لاء ٹوٹ پڑا۔ امریکی ڈالر سعودی ریال ہم پہ برسنے لگے۔ ہمارے لوگ بندوقیں اٹھائے سنگینیں تانے افغانستان پہ ٹوٹ پڑے۔

بیسویں صدی میں برطانیہ کو افغانستان میں سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی بزرگان دین بھی وہیں سے آتے رہے۔ مگر ہم انھیں اسلام سکھانے امریکی اسلحہ لیے ان پر نازل ہو گئے۔ شہر بستیاں اجاڑ دیے، عورتوں بچوں کو بیچ ڈالا، اینٹ سے

اینٹ بجادی۔ میں نے ڈاڑھی دار بٹ، شیخ، چوہدری افغان مجاہدین بھی دیکھے۔ ان سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ وہ حاضر سروس تھے مگر حلیہ بدل کر اسٹیج مسخروں کے روپ میں کردار ادا کرنے لگے۔ مسجد کو انھوں نے جہاد کا مرکز قرار دیا۔ پیش امام غیر سیاسی ہوا کرتے تھے۔ نظام مصطفیٰ کب کا نافذ تھا اسے کوڑوں گولیوں سے دوبارہ نافذ کرنے کی باتیں ہوئیں۔ پڑوس کی بلال مسجد میں جب ایک نمازی نے اٹھ کر اعتراض کیا کہ مسجد عبادت کی جگہ ہے سیاست کی نہیں تو اسی رات کچھ لوگوں نے اسے عارف روڈ کے گھر سے نکال کر ڈنڈے مار مار کے مار ڈالا۔ ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ لوگوں نے اپنے بچوں کو مسجد لے جانا چھوڑ دیا۔ سپارہ پڑھنے والوں کی تعداد بھی کم ہونے لگی۔

سلیم میرے بچپن کا دوست تھا، اس کا بھائی پرویز میرے ساتھ ایک ہی استاد سے کشتی سیکھتا تھا۔ چند بار لڑکپن میں سلیم سے مُکا بازی بھی ہوئی، صلح بھی ہوئی۔ وہ ٹیچر تھا۔

اچانک ہی اس کی کایا پلٹ آئی ڈپٹی نذیر احمد کے نصوح کی مانند اس نے ڈاڑھی بڑھائی، ہمہ وقت مسجد میں ہی رہنے لگا۔ جسے محاورتاً مسجد کا لوٹا کہا جاتا ہے۔ یہی نہیں نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کرنے لگا بلکہ سیڑھیوں پہ بیٹھ کر سامنے بھی رکھنے لگا۔ جب اس نے میرے جوتے میرے سامنے رکھے تو میں لرز کے رہ گیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ دیے کہ گنہگار نہ کرو۔ مگر وہ تو آج مار چکا تھا۔ مایا جال سے نکل چکا تھا۔ سارے علاقے میں دھوم مچل گئی۔ اسے مسجد کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ کیونکہ وہ مسجد کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ حق اسی کا تھا۔

میرے والد جو کبھی میرے ہاتھ تھام کر مسجد لے جایا کرتے تھے مجھے اکیلا چھوڑ کر عالم ارواح میں چلے گئے، بلا بتلائے بلا نوٹس۔ اب میں اپنے بیٹے طاہر کا ہاتھ پکڑے اسے مسجد لے جانے لگا، میں ان دنوں کنٹرولر تھا، اکثر سرکاری

دوروں پہ دور دراز علاقوں میں جانا پڑتا، دیکھا کہ ہر جانب اسلحے کی ریل پیل ہے۔ وہ اسلحہ جو ہم کیٹیلاگ میں کلاشنکوف جو انتہائی مہنگی تھی، اس کی تصویریں دیکھ دیکھ کر آہیں بھرا کرتے وہ چند ہزار پہ آ گئی، گولیاں اس کی ستر پیسے میں ملنے لگیں بچوں نے بڑی کی بجائی خالی گولیوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ گھر گھر اسلحہ کے ڈھیر لگ گئے، غلیل کی جگہ اسٹالٹ رائیفل نے لے لی۔ سرکاری مصروفیات کے باعث مسجد چشموں میں آنا جانا بھی کم ہوا۔ پیش امام عثمان سے مجھے بڑی محبت وعقیدت تھی محبت یوں کہ پرانی دوستی تھی اور عقیدت اس کی علمیت ذاتی کردار کے باعث۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ رشوت لینے اور دینے والا دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ سرکاری افسروں سے وہ کہا کرتا کہ وہ محض نگران ہیں کسٹوڈین ہیں، رشوت تو انصاف کا خون کرنے سے ہی ملی ہے۔ ایسی بھی کیا دولت جو دین و دنیا خراب کر دے۔

حاجی دولت جن کا بہت کاروبار تھا جناح روڈ پہ اس فیملی کا امداد سینما امداد ہوٹل بھی تھا وہ بھی اکثر حجرے میں آیا کرتے۔ خوب علمی و روحانی گفتگو ہوا کرتی۔ عثمان نے مدرس کی نوکری اختیار کر رکھی تھی، مسجد کا انتظام مخیر حضرات کے چندے سے چلتا یا اس مکان سے جس میں سلیم کا گھرانا قیام پاکستان سے رہائش پزیر تھا۔ عثمان فجر کی نماز کے بعد درس دیتا، پھر تیار ہو کر سائیکل پہ اسکول چلا جاتا۔ نماز ظہر سے قبل لوٹ آتا اور دینی فرائض انجام دیتا۔ رفتہ رفتہ مسجدوں کا قبضہ ہونے لگا۔ جن کے پاس دست غیب والی بے پناہ دولت ہوا کرتی۔ دولت اور اقتدار کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ مشین گنیں لیے چلے آتے، اسلحہ پہلو میں رکھ کر نمازیں ادا کرتے۔ پردیسیوں، مسافروں کا داخلہ مساجد میں بند کر دیا گیا۔ رات میں مساجد کو تالے لگا دیے جاتے۔ پردیسیوں کا سہارا بھی جاتا رہا۔

سلیم کچھ نئے طالب لے آیا، عثمان نے روکنے کی

کوششیں کی تو سلیم نے احتجاج کیا کہ مسجد خدا کا گھر ہے کسی ایک انسان کا نہیں اور وہ، مسجد کمیٹی کا صدر ہے، گویا پورے علاقے کا، نمائندہ، جو وہ بچیاں آیا کرتیں بھائیوں کو دم کرانے وہ بھی جانے کہاں چلی گئیں۔ ہماری مسجد میں تو یوں لگتا کہ جنگ یرموک کی تیاری ہو رہی ہے۔

سلیم کہیں سے بہت سی دولت لے آیا کہ دو منزلہ عمارت کی ضرورت ہے، آبادی بڑھ چکی ہے، مسجد کا مکان بھی فروخت کرنے کا عندیہ دیا کہ اتنے معمولی کرائے کا بھلا کیا فائدہ۔ بہتر ہو کہ مکان بیچ کے رقم مسجد کی تعمیر میں لگا دی جائے۔ مکان اس نے خود ہی خرید کر رقم تعمیر میں لگا دی۔ مسجد جلد ہی مکمل ہوگئی۔ عالیشان عمارت بن گئی۔

سلیم کے طالب خود سر ہوئے جاتے تھے۔ عثمان کی بات ہی نہ مانتے۔ ان کے پاس جانے کہاں سے دست غیب آیا کہ ژیرہ کی قدیم رسم چھوڑ دی، گھروں سے روٹی مانگنے کا رواج ختم ہوا۔ چڑیوں پرندوں کی مانند مسجد کا روٹی لاؤ جی، والا ترنم بھی ختم ہو گیا۔ بہت سی آوازیں دم توڑ گئی تھیں، رات میں جب شہر کے قرب و جوار میں پہاڑوں کے بھیڑیے اتر آتے، برفوں پہ پنجے مارتے کوئی مرغی بکری اچک لیتے یا مردار کی بلندیوں پہ رہنے والے تاریک غاروں کے شاہین بڑے پروں والے جنگلی کوّے بہت کچھ ختم ہو چکا تھا، ہوتے جاتا تھا۔ بہت سی آوازیں دم توڑ گئی تھیں۔ مر گئی تھیں۔

پھر ایک روز بہت سے لوگ عثمان سے الجھ پڑے۔ وہ انتظامیہ خود سنبھالنا چاہتے تھے۔ علاقے میں یہ خبر پھیل گئی۔

عثمان کے دوست احباب قدر دان سبھی دوڑے چلے آئے۔ مجھے بھی سخت طیش آیا۔ عثمان کا چہرہ تمتما رہا تھا مگر زبان خاموش تھی۔ حسب سابقہ سبز چائے سے تواضع کی۔ سبھی کو سمجھایا کہ وہ انتشار نہیں چاہتا۔ نماز کا مطلب یہ بھی ہے کہ سبھی ایک ہی صف میں کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہوں۔ محمود و ایاز کی تفریق کہاں۔ ہم سبھی با اثر تھے، ہم نے اصرار کیا وہ ہرگز نہ جائے۔ ہم خود ہی نپٹ لیں گے مگر اس نے ارادہ نہ بدلا۔ اگلی صبح اطلاع ملی کہ وہ جا چکا ہے۔ حجرہ خالی تھا۔ عثمان کے ساتھ ہی میری زندگی کا ایک دور بھی ختم ہو گیا۔ وہ ایک کلچر کا نمائندہ تھا جسے آمریت کھا گئی۔ میری چشموں مسجد عالیشان عمارت میں مدغم ہو چکی تھی۔

سرکاری قوانین بھی بدل گئے۔ صلواۃ کمیٹیاں قائم ہوئیں جن میں سفارش کرا کے ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جو کبھی مسجد کے پاس سے بھی نہ گزرتے۔ بعض ایک نے بتلایا کہ الیکشن کے وقت ان سے تحریری رپورٹ لی جائے گی کہ نمائندہ کیسا تھا۔ ایسے میں وہ اپنی لگائی گئی رقم کئی گنا زیادہ وصول کر لیں گے۔ گویا یہ ان کا بلائینڈ تھا۔

میں بھی سرکاری رہائش گاہ میں منتقل ہو گیا تھا، عثمان کی جستجو تو رہتی، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ برسوں بعد اتفاقاً ہی پودگلی میں ملاقات ہوگئی، وہ ایک چھوٹی سی مسجد میں اٹھ آیا تھا، جو پرانی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی، یہی کوئی دو کمروں کے برابر تھی، فرش کچا تھا، صحن میں ایک نلکا تھا پہلو میں اس کا حجرہ کسی قید خانے کے سیل سے بڑا نہ تھا۔ عثمان صبر و سکون سے وہاں بھی بچوں کو دینی تعلیم دے رہا تھا۔ مگر ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی کہ سبھی گیر چوں میں کام کرتے! کچرہ چننے نکل جاتے۔ جنّن کی بجائے انھیں روٹی کی فکر رہتی۔ ان کا مطمع نظر پیٹ بھر کھانا تھا۔ عثمان رنجیدہ یا کبیدہ خاطر نہ تھا۔ آبائی قصبے میں اس کا بیٹا تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ یہاں کرائے کا مکان لینے، مہنگے اسکولوں میں پڑھانے کی سکت نہ تھی۔

عثمان نے سبز چائے سے تواضع کی۔ نماز مغرب میں اس کی قرأت سے دل جھوم اٹھا۔ کرداد آواز میں اتر آتا ہے، تبھی تو روحانی شخصیات کی تلاوت سے دریا کی روانی رک سی جاتی

ہے۔ وقت سانسیں روک لیتا ہے، عثمان بڑی بے تکلفی سے بولتا چلا گیا کہ روحانیت کی بات کرتے ہیں تو ہمیں مردہ پرست کہا جاتا ہے۔ دینی علوم تو روحانیت کی سربلندی کے لیے ہی ہیں۔ بلالؓ حبشی، صہیبؓ رومی اور سلمانؓ فارسی کو حسب نسب نے نہیں روحانیت نے سرفراز کیا۔ پھر اس نے دبے لفظوں میں کہا کہ اس کے بیٹے کو ڈاک خانے میں کلرک لگا دوں۔ کیونکہ ملازمتوں کا جمعہ بازار لگتا ہے۔ عثمان میں سکت نہیں کہ بولی لگا پائے۔ مجھے سخت ندامت ہوئی۔ میں نے سچائی سے کہا کہ پہلے تو پرنس محی الدین جیسے وزیر آیا کرتے تھے جو ہمیں کھانے کھلاتے۔ پرنس نے ایک سیل بتا کر اڑھائی سو نوجوانوں کو اعلیٰ ملازمتیں دلوائیں۔ اب وزیر نوکریاں فروخت کرتے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ پہلے وہ رقم پوری کے بجائے جو وزیر لگنے کے لیے بلائینڈ کی۔ پھر وہ اپنا منافع حاصل کریں گے۔

عثمان نے سوال کیا ''اور جوان کی بات نہ مانے؟''

میں نے اپنا سمجھ کر اقرار کیا ''اس کے خلاف پری پلیج موشن لگا دیتے ہیں جبری چھٹی پر بھیج دیتے ہیں یا پھر گھر ہی بھجوا دیتے ہیں۔ میرے اصولوں کی نسبت میری کامیاب زندگی ضروری ہے۔ اٹلس کی مانند میں نے پورا گھرانا کندھے پہ اٹھا رکھا ہے۔'' عثمان بہت دیر استعجاب کا شکار رہا۔ پہلے بلبلوں کی ملگجی روشنی میں سب کچھ دھندلا دھندلا سا لگ رہا تھا۔ عثمان کی آوازیوں چھنتی جیسے قاسم میں سے دوزان کی صدائیں پکارتی ہیں۔ ''انسانیت فطرت میں بستی ہے، تربیت کے باعث روح میں دوڑتی ہے۔ کیا نظام یہاں تک پہنچ چکا ہے۔''

میں جواب دینے میں شامل نہ تھا ''دارالسلام کی بجائے ہم دارالحرب میں آچکے ہیں۔ میں اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہوں کمزور ہو گیا ہوں۔'' عثمان نے مجھے ترقی کی مبارک دی۔ گھر کا پتہ پوچھا۔ کھانے کے لیے مُصر تھا مگر میں کسی اور شام پہ ٹال کر لوٹ آیا۔ مجھے یوں لگا کہ میں ڈاکٹر فوسٹس کی مانند کب کا اپنی روح پیچ آیا ہوں ہیلن آف ٹرائے کے بوسوں کی خاطر، اپنی افسری کی خاطر! میری تربیت بھی ہوا ہوئی۔

ایک رات چوکیدار نے عثمان کی آمد کی خبر دی، میں ملازم پہ بھی خفا ہوا کہ جلدی سے اندر لاؤ عزت سے بٹھاؤ۔ ملازم نے بتلایا کہ اس نے اصرار کیا تھا مگر مہمان نے انکار کیا وہ یہیں درختوں کے نیچے اندھیرے میں انتظار کر لے گا۔

ریڈ لائٹ ایریا ختم کر کے حاکموں نے ریڈ زون تیار کر رکھا تھا، اسی کے ساتھ میرا سرکاری مکان تھا۔ یہاں بڑے بڑے بنگلوں میں بڑے بڑے خون آشام وی وی آئی پیز رہتے تھے۔ جو این آر او کے تالاب میں نہا کر دوبارہ پاکیزہ ہو جایا کرتے۔ بڑے بڑے چھتنار درختوں کے سبب یہاں سایہ اور اندھیرا بھی کچھ زیادہ ہی رہتا۔

میں گڑبڑا کر باہر کی جانب لپکا۔ گیٹ کے ساتھ ہی وہ اپنے پرانے سائیکل کو سنبھالے کھڑا تھا۔ مصافحہ معانقہ ہوا۔ اس نے خود ہی وضاحت کر دی کہ جو بات وہ مجھ سے کہنے آیا ہے، وہ اجالے میں کہنا دشوار تھا۔ لہٰذا اس نے رات اور اندھیرے کا ہی انتخاب کیا۔ عثمان نے ایک بوجھل سا لفافہ مجھے تھما دیا: ''اس لفافے میں میری کل کائنات ہے اور بیٹے کی ملازمت کی درخواست بھی۔ اوور ایج ہوئے جاتا ہے، اسے ڈاک خانے میں کلرک یا پھر نائب قاصد ہی لگا دیں۔'' وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ جواب کا انتظار کیے بنا ہی اس نے اجازت چاہی اور کھٹارا سائیکل پر اندھیرے میں مدغم ہو گیا۔

یہ سب کچھ حیران کر دینے والا تھا، میں گھر میں لوٹ آیا اور صوفے پہ آن گرا۔ کچھ دیر بعد ہمت کر کے لفافہ چاک کیا تو دیکھا کہ ملازمت کی درخواست ہمراہ ہزار ہزار کے نیلے نوٹ بھی تھے۔

یاس و امید نے ایک عربدہ میداں مانگا غالب

شوکت تھانوی

بے روزگار آدمی

ہم بے کار تو یقیناً نہیں ہیں اس لیے کہ اس مختصر زندگی میں جو کارنمایاں ہم نے انجام دیے وہ بجائے خود اس کی تردید میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ ایک بے کار آدمی اس قدر کارآمد ہرگز نہیں ہوسکتا۔ مثلاً یہ کہ ہم نے متعدد چھوٹے چھوٹے امتحانات پاس کیے۔ یا یہ کہ صرف ایک بی۔اے کے امتحان میں مسلسل اور متواتر تین سال تک فیل ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے ایک شادی کی پھر دو مستقل بچے پیدا کیے۔ یہ تمام باتیں آپ کو اس بات کا یقین دلا دینے کے لیے کافی ہیں کہ ہم بے کار نہیں ہیں۔ البتہ اس بات کا نہایت صفائی کے ساتھ ہم کو اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہم بے روزگار ضرور ہیں مگر اس میں دراصل ہماری کوئی خطا نہیں۔ بلکہ اگر سچ پوچھیے تو غلطی ہے ہر اس روزگار کی جس کو حاصل کرنے کی ہم کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ خود ہم سے گریزاں نظر آتا ہے۔

ہم آپ کو باور کرانا چاہتے اور شرافت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ آپ ان تمام واقعات کو صحیح سمجھیے گا کہ ہم چار سال سے مسلسل روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم نے پولیس سب انسپکٹری کے لیے زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیے اور ممبران کونسل سے لے کر وزرا تک کی سفارشیں اپنی تائید میں لا کر کھڑی کر دیں مگر یہ مقدر ہی تو ہے کہ جب یہ تمام کوششیں کامیاب ہوئیں اور پولیس ٹریننگ اسکول میں داخلہ کا امتحان پیدا ہوا تو خدا جانے کیونکر سینہ پورے چار انچ چھوٹا نکل گیا۔ اس سلسلہ میں روایات ذرا مختلف ہیں۔ ہمارے بعض احباب کا خیال یہ ہے کہ دراصل ہمارا سینہ چھوٹا نہ

ایسے آدمی کی کہانی جو بار بار ملازمت پکی ہونے کے باوجود اُسے کر نہ پاتا

تھا۔ بلکہ سینہ ناپنے کا فیتہ ہی چار انچ بڑا تھا اور خود ہمارا خیال یہ ہے کہ فیتہ بھی ٹھیک تھا اور سینہ بھی کافی چوڑا مگر اس قسم کے امتحانی مواقع پر ہماری ہمیشہ کی عادت ہے کہ کچھ سکڑ جاتے ہیں اور یقیناً یہی واقعہ اس پیمائش کے وقت بھی پیش آیا ہوگا۔ بہرحال تمام سفارشیں دھری رہ گئیں اور تمام کوششوں پر پانی پھر گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ یقین جانیے کہ اگر سینہ کی طرف سے یہ گمان بھی ہوتا کہ عین وقت پر یہ دھوکا دے گا تو ہم سب سے پہلے اس کی خبر لیتے اور ورزش وغیرہ کر کے اس خامی کو ہرگز باقی نہ رہنے دیتے، بہرصورت اب تو پولیس کے خیال ہی کو دل سے نکال دینا پڑا اور سب انسپکٹری کے بعد نظر انتخاب سب رجسٹراری پر پڑی۔

سب رجسٹرار ایک معمولی سی تنخواہ کی چھوٹی سی ملازمت ہے مگر ہم نے تو ہر سب رجسٹرار کو اس قدر مطمئن اور خوش پایا کہ گویا سب رجسٹرار ہونے کے بعد یہ حضرات وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم بری طرح سب رجسٹراری پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے لیے کوئی ایسی کوشش نہ تھی جو اُٹھا نہ رکھی ہو۔ پہلے سال تو درخواست ذرا دیر میں گزری تھی۔ لہٰذا معاملہ دوسرے سال پر ٹل گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گویا ہمیں ایک سال کا اور موقع ملا کہ ہم اپنی امیدواری کے استحقاق کو مستحکم بنائیں، چنانچہ یقین جانیے کہ ہم نے اس جگہ کے لیے وہ کوشش کیں کہ ہماری درخواست آخر کار قابل غور درخواستوں میں شامل کر لی گئی۔ اب نہ صرف ہمیں بلکہ ہر ایک کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہمارا انتخاب ضرور عمل میں آئے گا اور وہی ہوا۔ ہمیں آخر انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا اور ہم اپنے گھر سے سب رجسٹرار کی حیثیت سے روانہ ہوئے مگر اب ذرا نحوست مآبی ملاحظہ ہو کہ عین

انٹرویو کے وقت معلوم ہوا کہ ہماری عمر زیادہ ہے اور زیادہ بھی کتنی صرف ایک دن ہم نے لاکھ لاکھ چاہا کہ اس ایک دن کو نظر انداز کر دیا جائے مگر معلوم ہوا کہ اس ایک دن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ ہم خود ہی نظر انداز کر دیے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ایک دن کی بزرگی نے ہم کو یہاں بھی مارا اور اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے۔

نا اُمیدی اور دل شکستگی کا جو عالم ہم پر طاری تھا اس کی تفصیل کچھ نہ پوچھیے مگر اس کے باوجود آپ انصاف سے کام لے کر بتائیں کہ اس میں آخر ہماری کیا خطا تھی؟ اگر ہمارے امکان میں ہوتا تو ایک دن کیا ایک ہفتے بعد پیدا ہوتے، مگر قسمت میں تو یہ گردش لکھی تھی۔ ایک ہفتے بعد کیونکر پیدا ہو سکتے تھے یا کچھ روز قبل یہ انتخاب کیونکر ہو سکتا تھا؟

سب انسپکٹری کے بعد سب رجسٹراری کی کوشش میں اس غیر متوقع ناکامی نے ہمارے تمام حوصلے پست کر دیے۔ اس لیے کہ اوّل تو کس قدر لغو اور مہمل طریقہ پر ناکام ہوئے تھے دوسرے عمر متجاوز ہو چکی تھی، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اب سرکاری ملازمت کا دروازہ ہم پر بند ہو چکا۔ ادھر گھر میں یہ حال کہ اس خاکسار مربی کو مربہ سمجھ کر اہل و عیال کھائے جاتے تھے، ماشاء اللہ بھرا ہوا گھر اور کمانے والے صرف ہم اور وہ بھی بے روزگار اس میں شک نہیں کہ ہم آخر کیا کرتے اور ہمارے بس میں کیا تھا؟ مگر بیگم بھی ٹھیک کہتی تھیں کہ آخر وہ کیا کریں اور گھر کا خرچ کیونکر چلائیں؟ ہمارا یہ حال کہ صبح سے روزگار کی تلاش میں نکلتے ہیں تو شام کو واپس آتے ہیں۔ ادھر گھر والوں کا یہ خیال کہ ہر ایک کی ضرورت ہم سے وابستہ ہے اور ہر ایک کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں مگر وقت تو ایسا پڑا ہے کہ ہر دعا بد دعا ہو کر لگتی ہے اور ہر کوشش مایوسی اور ناکامی پر ختم ہوتی ہے۔

سرکاری ملازمت کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد

پرائیویٹ ملازمت کی فکر پیدا ہوئی اور اس سلسلے میں خدا کا شکر ہے کہ ہمیں زیادہ دوڑ دھوپ نہ کرنا پڑی بلکہ فوراً ہی ایک تعلقہ دار صاحب کی ریاست میں منیجری کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک چھوٹا سا تعلقہ تھا مگر نام تو تھا ریاست کی منیجری کا۔ لہٰذا ہم خوش تھے کہ اس ملازمت پر قدم جما کر ترقی کی منزلیں طے کریں گے اور تعلقہ دار صاحب کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ قابل منیجر بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ ان کی ریاست بہت زیادہ مقروض تھی۔ اس حد تک مقروض کہ ہم کو اندیشہ تھا کہ شاید تنخواہ ماری جائے۔

مگر اس ملازمت کو غنیمت اس لیے سمجھ رہے تھے کہ بے روزگاری کے طعنوں سے نجات مل جائے گی اور اگر تنخواہ نہ بھی ملی تو واجب الادا کہلائے گی اس کے علاوہ کچھ نہ کچھ تو ملتا ہی رہے گا۔ جو اس موجود 'کچھ بھی نہیں ہے' سے بہر حال بہتر ہو گا۔ یقین جانیے کہ جس وقت ہم نے اپنی ملازمت کا مژدہ گھر والوں کو سنایا ہے سب کی باچھیں کھل گئیں، کسی نے نماز شکرانہ ادا کی تو کسی نے ہماری بلائیں لینا اور ہم کو دعائیں دینا شروع کر دیں۔ گویا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا اور واقعی خوشی کا مقام بھی تھا کہ تین سال کی اُمید واری اور ہر امید واری میں ناکامی کے بعد یہ صورت نظر آئی تھی۔ چنانچہ دوسرے دن جب ہم اپنے عہدے کا چارج لینے کے لیے چلے تو پانوں کی ڈبیا بھی تیار تھی اور نیا بٹوہ بھی بھر دیا گیا تھا۔ بالکل ایسے انتظامات تھے کہ گویا ہم لام پر جا رہے ہیں۔ امام ضامن کی ضامنی مبارک سلامت کے نعروں اور دہی مچھلی کے شگون کے ساتھ ہم گھر سے روانہ ہوئے، راجا صاحب کی کوٹھی کی طرف۔

اب ذرا ملاحظہ ہو ہماری سبز قدمی کہ راجا صاحب کی کوٹھی میں جب پہنچے تو معلوم ہوا کہ کسی ماتم کدے میں داخل ہو گئے۔ ہر طرف غمناک سناٹا اور در و دیوار سے یاس برس رہی تھی۔ ہر کوئی گردن لٹکائے تصویر حسرت نظر آ رہا تھا۔ ہم نے اپنے دل میں کہا الٰہی خیر معلوم نہیں یہاں کیا سانحہ ہوا ہے۔ اب پوچھنے کی بھی کسی سے ہمت نہ ہوتی تھی کہ خدا جانے کیا خبر وحشت اثر سننے میں آئے۔ آخر کار پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے راجا صاحب کی پیشی میں جب پہنچے تو وہ بھی داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع کی طرح بیٹھے تھے۔

خیر اس طرف سے تو اطمینان ہو گیا کہ خواجہ صاحب بفضل خدا اچھے ہیں مگر سانحہ یقیناً ایسا سخت تھا کہ خود راجا صاحب پر بھی اس کا بے حد اثر معلوم ہوتا تھا۔ وہ شدت غم سے گم سم نظر آ رہے تھے۔ آخر ہم نے خود ہی اپنے ایک ہم نشین سے چپکے سے پوچھا: ''آخر واقعہ کیا ہے؟''

ہم نشین نے چپکے سے جواب دیا، علاقہ کورٹ ہو گیا!

ہم نے بے ساختگی کے ساتھ کہا: ''کورٹ!''

ہم نشین نے کہا: ''ہاں ابھی تار آیا ہے۔''

یقین جانیے کہ دل کی حرکت نے بند ہونے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ فوراً یہ ضرب المثل ذہن میں آ گئی کہ ''جہاں جائے بھوکا وہاں پڑے سوکھا'' راجا صاحب کو یقیناً اپنا علاقہ کورٹ ہونے کا بس اسی قدر صدمہ ہو گا کہ جس قدر ہم کو اپنی ملی ملائی ملازمت کے اس طرح جانے کا صدمہ تھا۔ دل بیٹھا جاتا تھا اور آنکھیں رونے کے لیے بے قرار تھیں۔ پھر بھی ایک آدھ سرد آہ اگر سرزد ہو گئی ہو تو کوئی تعجب نہیں اور اس کو بھی راجا صاحب کی ہمدردی میں شامل کر لیا گیا ہو گا۔ ہم تھوڑی دیر راجا صاحب کے پاس بیٹھے رہے۔ اس کے بعد جب راجا صاحب تخلیہ میں تشریف لے گئے تو ہم نے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کر دیا کہ آخر اب ہم کہاں جائیں؟ زمین سخت تھی اور آسمان دور۔ گھر میں منہ دکھانے کے قابل نہ تھے اور باہر آوارہ گردی میں چالان کا اندیشہ تھا۔ راجا صاحب کی میز پر

رکھا ہوا اخبار یوں ہی اُٹھالیا۔ مگر یہ بھی عجیب اتفاق کہ اس میں سب سے پہلے ''ضرورت ہے'' کے عنوان پر نظر پڑی۔ حالانکہ وہ اشتہار ہمارے متعلق نہ تھا۔ بلکہ مشتہر کو ضرورت تھی ایک ایسی لڑکی کی جو حسین و جمیل، سگھڑ اور شریف خاندان ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اشتہار ہمارے کام کا نہ تھا مگر اس کے نیچے ہی دوسرا اشتہار تھا۔ جس میں ضرورت تھی ایک ایسے تجربہ کار اسسٹنٹ ایڈیٹر کی جو ترجمہ میں مہارت رکھتا ہو اور جس کو قلم برداشتہ سیاسی مسائل پر شذرات لکھنے کی مشق ہو۔ یہ اشتہار ہمارے شہر ہی کے ایک روزنامہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ لہٰذا ہم اخبار لیے ہوئے راجا صاحب کی کوٹھی سے سیدھے اس اخبار کے دفتر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس لیے کہ اس وقت گھر جانا ہمارے لیے دشوار بھی تھا اور گھر والوں کے لیے خطرناک بھی کہ جس وقت ہم اپنی ناکامی کا روح فرسا واقعہ سنائیں گے تو اس وقت خدا جانے کس کس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے اور شدت غم سے کس کا کیا حال ہو؟ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم گھر پر جا کر یہ کہہ دیں کہ راجا صاحب کی ریاست کے منیجر نہیں بلکہ ایک اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے ہیں مگر ایک سرے سے کچھ بھی نہیں کی خبر سننے کا کوئی بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

بہر صورت ہم جس وقت اخبار کے دفتر میں پہنچے وہاں نہایت انہماک کے ساتھ اخبار کی ترتیب کا کام جاری تھا۔ ہم نے چیف ایڈیٹر صاحب کو اطلاع کرائی اور فوراً ہم کو باریابی کی اجازت مل گئی۔ یہ حضرت عمر خیام کے قریبی بزرگوں میں سے معلوم ہوتے تھے۔ بالکل سفید ڈاڑھی، موٹے موٹے تالوں کی عینک لگائے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ گویا آپ فادر کرسمس کے بڑے بھائی ہیں اور حضرت نوح کی کشتی میں سوار ہونا بھول گئے تھے۔ لہٰذا اس کمرے

میں بیٹھے رہ گئے ہیں۔ ہم کو دیکھتے ہی آپ نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر فرمایا: ''کیسے زحمت فرمائی۔''

ہم دراصل اس وقت بے حد مرعوب ہو رہے تھے۔ لہٰذا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ البتہ اخبار اُٹھا کے ان کو دکھایا اور صرف یہ کہہ سکے کہ ''یہ آپ کا اخبار ہے۔ آج ہی کی تاریخ کا۔''

ایڈیٹر صاحب نے کہا: ''جی ہاں اس سے آپ کا مقصد؟''

اب ہم خود سمجھ گئے کہ ہم نے کس قدر نامعقول بات کہی تھی۔ لہٰذا ذرا معقولیت کے ساتھ کہا: ''اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت کا ایک اشتہار چھپا ہے۔''

ایڈیٹر صاحب نے عینک سے اپنی نگاہیں پھندا کر کہا: ''آپ اس جگہ کے امیدوار ہیں؟''

ہم نے کہا کہ ''جی ہاں۔''

ایڈیٹر صاحب نے گھورتے ہوئے کہا: ''آپ ترجمہ کر سکتے ہیں؟''

ہم نے کہا: ''جی ہاں۔''

ایڈیٹر صاحب نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کا ایک تار دیتے ہوئے کہا: ''اس کا ترجمہ فوراً کر دیجیے۔''

ہم نے اس تار کو لے کر دیکھا اور پھر غور سے دیکھا مگر صرف اسی قدر سمجھ سکے کہ انگریزی رسم الخط میں خدا جانے کونسی زبان لکھی ہوئی ہے، تاہم قلم لے کر ترجمہ کی کوشش شروع کر دی اور ایڈیٹر صاحب کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے شاید ایک ہی سطر پڑھی ہوگی کہ بڑی زور سے ڈونک کر پوچھا: ''یہ آپ نے ٹھہر و ٹھہر و بار بار کیا لکھا ہے؟'' ایڈیٹر صاحب نے مسکرا کر ترجمہ رکھتے ہوئے کہا: ''آپ نے کہیں کسی اخبار میں کام نہیں کیا ہے؟''

ہم نے کہا: ''جی نہیں!''

ایڈیٹر صاحب نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ تو پھر آپ کے لیے صرف ایک صورت یہ ہے کہ آپ امیدوار کی حیثیت سے بلاتنخواہ کام سیکھیں اگر کارآمد ہو سکے اور جگہ خالی رہی تو آپ کو مل جائے گی۔

ایڈیٹر صاحب کے اس جواب پر غور کرنے کی ضرورت تھی، بشرطیکہ غور کرنے کی مہلت بھی دی جاتی بہرصورت ہم نے اس وقت یہی مناسب سمجھا کہ رضامند ہو جائیں۔ چنانچہ ہم کو اُمیدوار مترجم کی حیثیت سے رکھ لیا گیا مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر ہم گھر پر جا کر کیا کہیں؟ اخبار کے دفتر میں ملازمت تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا مگر یہ سمجھانا کوئی آسان بات نہ تھی کہ فی الحال تنخواہ کچھ نہ ملے گی۔ اس لیے کہ گھر والوں کو تو ضرورت تنخواہ کی تھی، ملازمت کی نہیں۔ وہ یہ تو گوارا کر سکتے تھے کہ فی الحال تنخواہ ملے خواہ ملازمت بعد میں ملتی رہے مگر یہ صورت ان کو منظور نہیں ہو سکتی تھی کہ کہ ملازمت مل گئی ہے مگر فی الحال تنخواہ نہ ملے گی۔ بہرصورت گھر جانے کا ایک بہانہ مل گیا۔ لہٰذا ہم گھر پہنچے اور قبل اس کے راجا صاحب کے یہاں کی ناکامی کا افسانہ سنائیں اخبار کی ملازمت کا حال سب سے پہلے سنایا۔ اس کے بعد راجا صاحب کے یہاں کی ناکامی کا قصہ گوش گزار کیا اور سب کے آخر میں یہ بھی دبی زبان سے کہہ دیا کہ ابھی تنخواہ طے نہیں ہوئی، کام دیکھنے کے بعد طے ہوگی۔

بس یہ سمجھ لیجیے کہ یہ سنتے ہی سب کو گویا سانپ سونگھ گیا اور سب کے چہروں پر مردنی چھا گئی مگر مردنی چھائے یا کچھ ہو سوال تو یہ ہے کہ آخر ہم کیا کریں؟ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ روزانہ اخبار کے دفتر میں ترجمہ کرنے جاتے ہیں اور وہاں وقت نکال کر تمام اخبارات میں ''ضرورت ہے'' کے اشتہارات بلا ناغہ پڑھتے ہیں اور ہر جگہ کے لیے ایک درخواست روانہ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر نوکری نہ ملے تو یہ ہمارا مقدر ہے۔

مون سون کیا ہے؟

انگریزی زبان کے لفظ مون سون کی جڑیں پرتگیزی زبان کے لفظ مون کاؤ اور عربی و ہندی زبان کے لفظ موسم میں ہیں۔ عام طور پر اس کا مطلب زمین اور سمندر پر حدت کے ساتھ فضا میں ہونے والی تبدیلی ہے۔ انگریزی زبان میں یہ لفظ سب سے پہلے برصغیر میں استعمال کیا گیا۔ اس اصطلاح کا مفہوم خلیج بنگال اور بحیرہ عرب اسے اُٹھنے والی ہوائیں جو خطے میں بارش کا باعث بنتی ہیں۔ مجموعی طور پر مون سون ہواؤں، بادلوں اور بارشوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہ موسم گرما میں جنوبی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقی ایشیا میں بارشوں کا سبب بنتا ہے۔ اپریل اور مئی میں افریقا کے مشرقی ساحلوں کے قریب خط استوا کے آس پاس بحر ہند کے اوپر گرمی کی وجہ سے بخارات بنتے ہیں۔ یہ بخارات بادلوں کی شکل میں مشرق کا رخ کرتے اور جون کے پہلے ہفتے میں یہ سری لنکا اور جنوبی بھارت پہنچتے ہیں اور پھر مشرق کی طرف نکل جاتے ہیں۔ ان کا کچھ حصہ بھارت پر برستا ہوا کوہ ہمالیہ سے ٹکراتا ہے، جبکہ بادلوں کا کچھ حصہ شمال مغرب کی طرف پاکستان کا رخ کرتا ہے۔ ۱۵ جولائی کے قریب مون سون کے بادل پاکستان پہنچتے ہیں۔ جسے ساون کی جھڑی کہتے ہیں، کیونکہ ۱۵ جولائی کو ساون کی پہلی تاریخ ہوتی ہے۔

ایڈووکیٹ زاہد عرفان

گڈ پائے شوگر

یہ سن 2016ء کی ایک حبس زدہ دوپہر تھی۔ میں دفتری کام کے سلسلے میں شیخوپورہ کچہری میں تھا کہ دفعتاً مجھے اپنے سر میں شدید درد کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی حلق میں پیاس کی وجہ سے کانٹے چبھتے محسوس ہوئے۔ میں روزے سے تھا لہٰذا پانی پینے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے اس تکلیف کو جسم میں پانی کی کمی کی وجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا مگر درد کی شدت بڑھتی چلی گئی۔

آخر کار میں نے گاڑی کا اے سی چلایا اور کچھ لمحوں کے لیے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہی گمان ہوا کہ شدید تکان اور دماغی کام کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد طبیعت میں کچھ افاقہ محسوس ہوا تو میں نے لاہور واپسی کا قصد کیا۔ راستہ بھر ہلکا سر درد اور کنپٹیوں میں ہلکی ٹیسیں اُٹھتی رہیں مگر میں نے رُکنے کے بجائے آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے گھر پہنچ جانے کو ہی ترجیح دی۔

یکا یک میں نے پاؤں کے تلوؤں میں سوئیاں چبھتی

محسوس کیں۔ پاؤں میں کھچاؤ بھی واضح پیدا ہونے لگا تھا۔ مجھے لگا طویل ڈرائیونگ یا شاید جوتے میں کوئی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے ایسا ہو رہا، میں نے جوتا اُتار دیا اور کچھ دیر ننگے پاؤں گاڑی چلاتا رہا۔ ایسا کرنے سے کچھ وقتی افاقہ ہوا اور میرا سفر جاری رہا۔

لاہور پہنچنے کے بعد میں فوراً خود کو آرام دہ حالت میں لایا۔ اس دن بڑی مشکل سے بقیہ روزہ مکمل ہوا۔ رات کو پاؤں کی زیتون کے تیل سے مالش کی، سر درد کے لیے پینا ڈول کی دو گولیاں کھائیں اور سو گیا۔ اگلے دن حسب معمول روزہ رکھا اور کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ لاہوری انداز کی سحری اور افطاری جس میں پراٹھے، دہی کی میٹھی لسی، کھجوریں، فروٹ چاٹ اور شربت پورے رمضان جاری رہی۔ اب اکثر مجھے ایسی علامات سے سابقہ پڑتا رہتا لیکن میں نے اسے گرمی کے روزوں کے کھاتے میں ڈال دیا۔

رمضان شریف کے بعد معمولات زندگی واپس اپنی پرانی ڈگر پر آ گئے۔ اکثر بغیر ناشتے کے دفتر جانا، دوپہر کا کھانا جہاں ملا کھا لیا اور رات کو گھر آ کر ڈٹ کر کھانا اور پھر فوراً سو جانا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اکثر ہی صبح جاگنے کے بعد میرے جسم میں چستی اور تازگی کے بجائے پژمردگی غالب رہنے لگی ہے۔ بستر چھوڑنے کو دل نہ کرتا۔ سیڑھیاں چڑھنے پر ٹانگوں درد، خاص طور پر پنڈلیوں میں، سانس بہت جلد پھولنا اور منہ سے عجیب سی میٹھی خوشبو کا آنا۔ جسم کو طاقت پہنچانے والی مختلف ادویہ اور ملٹی وٹامن کھانے کے باوجود ہر وقت تھکن کا احساس رہتا۔ پیاس بڑی شدت کے ساتھ لگنا شروع ہو گئی اور ایک گلاس پانی اسے بجھانے میں ناکام رہتا۔ میں نے گھر میں پیتل کے بڑے گلاس منگوا لیے جن میں آدھا لیٹر پانی آ جاتا

اور جو عموماً آپ کو دودھ دہی کی دکانوں میں ملتے ہیں جن میں لبالب لسی بھری ہوتی ہے۔ میں پانی سے بھرا یہ گلاس ایک ہی بار میں غٹا غٹ پی لیتا لیکن حلق پھر بھی خشک رہتا۔

ان تمام علامات کے باوجود میں نے کبھی ذیابیطس کا ٹیسٹ نہ کروایا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اس جواں عمری میں مجھے ایسا مرض لاحق نہیں ہو سکتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کبھی بیٹھے بیٹھے جی متلانا شروع ہو جاتا اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔

انھی دنوں دیارِ غیر میں مقیم میرا ایک عزیز دوست پاکستان آیا تو میری اُس سے ملاقات ہوئی۔ ہم تقریباً ایک سال بعد ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی تشویش سے پوچھا کہ خیریت ہے؟

میں نے جواباً پوچھا: ''کیا ہوا؟''

کہنے لگا کہ تم مجھے بیمار لگ رہے ہو۔ تمہارے چہرے پر بیماری اور کمزوری کی علامات ہیں۔ میں نے اس بات کو اس کا وہم قرار دیا اور کہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کچھ دن بعد ایک اور پرانے دفتری ساتھی کہیں ملے تو انھوں نے بھی ایسے ہی تشویشناک خیالات کا اظہار کیا۔ اب میرے دل میں کچھ شک پیدا ہونا شروع ہوا کہ ہو سکتا ہے کہ مجھے کوئی بیماری ہو؟ اور بہر حال کچھ تو ہے جو روزمرّہ ملنے والوں کو نہیں بلکہ انھیں زیادہ محسوس ہو رہی جو مجھ سے کبھی کبھار ملتے ہیں۔ کیا یہ ذیابیطس ہو سکتی ہے؟ میرا نہیں خیال کہ ایسا ہو۔

اُس ڈرائیونگ والے دن کے بعد اب تو اکثر ہی ایسا ہونے لگا کہ پاؤں سُن ہو جاتے اور ان میں کھچاؤ پیدا ہونے لگتا۔ پنڈلیوں میں درد بڑھ گیا اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں جو کچھ بھی کھاتا ہوں، وہ جزوِ بدن نہیں بن رہا۔

دن گزرتے گئے اور میں اپنے کام کاج میں مصروف

رہا۔ اب ایک نئی افتاد نے مجھے آن گھیرا۔ چونکہ پیاس کی شدت سے میں دو تین گلاس پانی ایک ہی بار پی لیتا لہٰذا جب پیشاب کی حاجت محسوس ہوتی تو مجھے بھاگ کر ٹوائلٹ جانا پڑتا۔ کچھ دیر کی تاخیر کا نتیجہ کپڑوں میں ہی پیشاب نکلنے کی شکل میں ظاہر ہوتا۔ شدت اس قدر ہوتی کہ اسے کچھ لمحوں کے لیے بھی روکنا ممکن نہ ہوتا۔ پھر یہ وقت آیا کہ مجھے رات کو ہر آدھ گھنٹے بعد اُٹھنا پڑتا۔ ایک طرف پیاس جو بجھنے کا نام نہ لیتی دوسری طرف پیشاب کی حاجت سونے نہ دیتی۔ زندگی عجب مخمصے میں گرفتار ہو چکی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس معمول سے میرے جسم میں کمزوری پیدا اور نظام انہضام بھی بہت متاثر ہونے لگا ہے۔ رہی سہی کسر قبض نے پوری کر دی جو اپنی پوری شدت کے ساتھ آن موجود ہوا۔ شروع میں اس کا عام علاج میں نے کھانے سے پہلے باقاعدگی سے اسپغول کا چھلکا پانی کے ساتھ لینے سے کیا لیکن جیسے ہی اس معمول میں ایک آدھ دن کا ناغہ ہوتا، مسئلہ اپنی پرانی جگہ پر آجاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ معدے میں شدید تیزابیت کی شکایت بھی پیدا ہو چکی تھی۔

معمولاتِ زندگی میں نمایاں تبدیلی آنے لگی جس سے میرے شب و روز بری طرح متاثر ہونے لگے۔ اب تھوڑی ہی دیر کام کرنے سے جسم میں تھکن پیدا ہو جاتی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑنے لگے اور اکثر آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ چہرے کی شادابیت بھی رخصت ہو گئی نیز سر کے بال تیزی سے گرنے کی بدولت میں پینتیس برس کی عمر میں ہی اپنے ہم عمروں کی نسبت زیادہ عمر کا اور بوڑھا لگنا شروع ہو گیا۔

ایک دن باغِ جناح میں صبح کی سیر کرتے کرتے اپنا وزن کروایا تو حیران رہ گیا کہ وہ دس کلو کم ہو چکا تھا۔ اب نئی

مصیبتیں شروع ہوئیں۔ گلا اکثر خراب ہو جاتا، سینے میں بلغم پیدا ہو جاتی اور ہر دوسرے تیسرے مہینے مجھے کسی اینٹی بائیوٹک دوائی کا کورس کرنا پڑتا۔

پیشاب کی حاجت بڑھ جانے کی وجہ سے میری نیند بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ اِدھر آنکھ لگی، اُدھر اُٹھنا پڑ گیا۔ اس سے تنگ آ کر آخر کار میں نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ساری بات و علامات سننے کے بعد ان کا خیال تھا کہ مجھے ذیابیطس کا مرض لاحق ہو چکا۔ بار بار پیشاب آنا اس مرض کی اہم علامت ہے۔ انھوں نے فوراً گلوکومیٹر سے میرے خون میں شوگر کی سطح چیک کی اور حیران ہو کر میری شکل دیکھنے لگے۔ میں نے پوچھا:

''ڈاکٹر صاحب کیا ہوا؟'' میں پریشانی سے زیادہ متجسس تھا۔

''کچھ نہیں۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''یہاں آنے سے قبل آپ نے کھانا کتنے بجے کھایا تھا؟

میں نے بتایا کہ تقریباً تین گھنٹے ہو چلے۔

''کیا کھایا تھا؟''

میرا جواب تھا چاول اور اس کے بعد کچھ آم۔ اب میرا تجسس مزید بڑھ گیا کہ ڈاکٹر صاحب اتنے سوالات کیوں کر رہے؟ سیدھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ آخر گلوکومیٹر میں ایسی کیا بات آئی ہے کہ انھیں اتنی تشویش ہو گئی۔ آخر کار مجھے پتا چلا کہ میرے خون میں شوگر کی سطح انتہائی خطرناک حد تک بڑھ چکی۔ گلوکومیٹر کی اسکرین پر 472mg/dL کا ہندسہ جگمگا رہا تھا۔

میرا فوری ردِعمل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کا گلوکومیٹر شاید صحیح کام نہیں کر رہا کیونکہ میں پُریقین ہوں کہ مجھے شوگر نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے آلے کی درستی پر مصر

رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بیان کردہ علامات کے تناظر میں گلوکو میٹر کی ریڈنگ ٹھیک ہے۔ ایک صحت مند انسان کی، کھانے کے محض تین گھنٹے بعد خون میں شکر کی سطح زیادہ سے زیادہ 140mg/dL ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب نے بیک وقت میری تسلی اور اس بات کی تشفی کرنے کہ شوگر میرے دیگر اعضا پر بھی اثر انداز ہوئی یا نہیں، گردے (RFT)، جگر (LFT)، جسم میں تین ماہ کی شوگر کی سطح ماپنے (HbA1c)، خالی پیٹ شوگر لیول اور خون میں چربیلے مادوں کی پیمائش (Lipid Profile) کے ٹیسٹ تجویز کیے۔

میں نے شہر کی بہترین لیبارٹری کا انتخاب کیا تاکہ ٹیسٹ کے نتائج میں کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔ دل ہی دل میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے آلے کی رپورٹ غلط نکلے لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ جب ٹیسٹوں کی رپورٹیں آئیں تو نتائج میرے ہوش ٹھکانے لگانے کے لیے کافی تھے۔ اگرچہ گردوں اور جگر کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا مگر یہ بات حتمی تھی کہ ذیابیطس میرے جسم میں اپنے پنجے گاڑ چکی۔

تین ماہ کے اوسط شوگر لیول کی ریڈنگ 10.2% تھی جو نہایت خطرناک تھی۔ اسی طرح خون کے اندر Triglycrides بھی 512mg/dl کی خوفناک شرح کے ساتھ موجود تھے جو کسی بھی وقت دل کے دورے کا سبب بن سکتے تھے۔ ایک صحت مند انسان کے خون میں ٹرائی گلاسیرائیڈز 150mg/dl تک ہونے چاہئیں۔ اسی طرح HbA1c کی رپورٹ صحت مند انسان کی 5.7% تک ہونی چاہیے۔

میں نے اپنی بیماری کا ذکر گھر میں کسی سے کیا تھا اور نہ ہی دفتر میں اپنے کسی ساتھی کو بتایا تھا۔ میرا دل ابھی تک اس بات کو ماننے پر تیار نہ تھا کہ میں نہ صرف شوگر کی بیماری کا شکار ہو چکا بلکہ اس کے ساتھ دیگر پیچیدگیاں بھی آ چکیں۔ یہ صورتحال میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ میرے ذہن کے پردۂ اسکرین پر ان رشتہ داروں کے چہرے نمودار ہونے لگے جو اس موذی مرض کا شکار ہونے کے بعد بڑی تکلیف اُٹھا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ کسی کے اعضاء کاٹنے پڑے تو کوئی گردوں کے فیل ہونے کے سبب ڈائی لیسز کے تکلیف دہ عمل سے گزرتا ہوا راہی ملک عدم ہوا۔

زندگی کی رعنائیاں اپنا حسن کھو رہی تھیں۔ بار بار اپنے بیٹے اور چھوٹی بیٹی جس نے ابھی اسکول جانا بھی شروع نہیں کیا تھا، کا خیال آتا کیا میں اپنی زندگی میں ان کی خوشیاں دیکھ پاؤں گا؟ اس موذی بیماری کی ادویات کا خرچہ اور پھر بندہ کسی کام کاج کے قابل بھی نہیں رہتا..... گزارہ کیسے ہو گا؟ بچوں کی تعلیم کا کیا بنے گا؟ ایسے ہی بے شمار سوالات میری پریشانی بڑھا رہے تھے۔ دل بجھ سا گیا اور جسم میں جو توانائی موجود تھی وہ بھی ختم ہوتی محسوس ہونے لگی۔ نیند غائب ہو گئی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہی پریشان کن خیالات کی یلغار ہو جاتی اور میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آئندہ زندگی کا لائحہ عمل کیا ترتیب دوں؟

میری طبیعت کی افسردگی کو سب سے پہلے میری بیوی نے محسوس کیا اور کریدنے لگی کہ آخر کیا مسئلہ ہے؟ لیکن میں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ اُلٹا اس کا ایسے پوچھنا مجھے برا لگتا۔ وجہ یہ کہ میرا مزاج بھی تلخ ہو چکا تھا۔ کوئی بھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو میں اس کے ساتھ درشتی سے پیش آتا۔ سب میری ان حرکات وسکنات پر حیراں تھے۔

میرے رویے میں یہ غیر معمولی تبدیلی میرے گھر

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

والوں کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔ بیگم نے میرے والد صاحب سے ذکر کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ شاید دفتر میں کسی پریشان کن صورتحال کی وجہ سے میں چڑچڑے پن کا شکار ہورہا ہوں۔ بہرحال والد صاحب نے جب مجھ سے پوچھا تو اُن سے میں کچھ نہ چھپا سکا اور کھل کر اپنی بیماری کے متعلق انھیں آگاہ کیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ ساری بات سن کر ان کا چہرہ لمحے بھر کو متغیر ہوا لیکن جلد ہی وہ سنبھل گئے اور انھوں نے مجھے حوصلہ دیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میری بیماری کی خبر بجلی بن کر میرے گھر والوں پر گرے گی۔ ٹیسٹ رپورٹ میں شوگر کی بلند سطح سب کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ میری والدہ جو گزشتہ بیس برس سے اس بیماری کا شکار تھیں اور باقاعدگی سے انسولین لیتی تھیں، اتنی بلند شرح ان کی بھی کبھی نہیں آئی۔ چالیس سال کی عمر سے قبل شوگر کا مرض لاحق ہوجانا ایک خطرناک بات ہے۔ کیونکہ یہ جسم کو بڑی تیزی سے کھوکھلا کردیتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ سب میری ہمت ظاہری طور پر تو بڑھا رہے ہیں لیکن اندر سے خود بھی ڈرے ہوئے ہیں کہ کہیں کوئی انہونی نہ ہوجائے۔

دو ہفتے گزر گئے۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ ادویات تو میں نے کھانی شروع کردیں لیکن ایک سوگ کی سی کیفیت ابھی تک طاری تھی۔ ڈاکٹر، دوست احباب اور گھر کے افراد کی باتوں اور تجربات سے مجھے یہی لگتا کہ اب میری ساری عمر شوگر اور اس سے پیدا شدہ عوارض کی ادویات کھانے میں ہی گزر جائے گی۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے تو پوری صراحت کے ساتھ آئندہ زندگی کا ایسا نقشہ کھینچا جس سے صحت مند زندگی جینے کی جو ہلکی سی اُمید کی رمق باقی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔

ایک دن میں سونے کے لیے لیٹا تو اچانک یونیورسٹی

کے دنوں میں پڑھی ہوئی ایک دعا میرے ذہن کے پردہ سیمیں پر جھلملانے لگی اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ برسوں پہلے یاد کی ہوئی یہ دعا میرے لاشعور میں شاید اسی دن کے لیے محفوظ تھی:

''اے میرے پروردگار!

☆ مجھے اتنا سکون دے کہ میں ان حالات کو تسلیم کرسکوں جنہیں میں بدل نہیں سکتا۔

☆ مجھے اتنی ہمت دے کہ میں ان حالات کو بدل ڈالوں جنہیں میں بدل سکتا ہوں۔

☆ اور عقل سلیم دے کہ میں ان دونوں میں فرق کرسکوں۔ آمین!''

جیسے ہی میں نے دعا کے الفاظ دہرائے سکون کی لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی اور تنے ہوئے اعصاب پرسکون ہوگئے۔ اُس رات میں تین چار ہفتوں بعد گہری نیند سویا۔

جو ہونا وہ ہوچکا، اب ماضی پر کڑھنے سے کیا حاصل کہ ایسا کرتا تو ویسا ہوجاتا۔ پرہیز کرنا چاہیے تھا، وقت پر ٹیسٹ کروانے چاہیے تھے۔ میں اپنے ماضی کو بدلنے پر قادر نہیں۔ مجھے یہ حقیقت بھی تسلیم کرلینی چاہیے کہ اب میں بیماری کا شکار ہوچکا۔

اس بیماری سے نبرد آزما ہونے کے لیے میرے پاس کیا امکانات؟ میں کیسے مکمل طور پر صحت مند ہوسکتا ہوں؟ باقی زندگی کے شب و روز کیسے بہتر بنائے جاسکتے ہیں؟ اب میری سوچ کا محور یہ سوالات تھے۔

اگلی صبح میری منتظر تھی جب میں اک نئے عزم کے ساتھ اپنی زندگی کی نئی شروعات کرنے جارہا تھا۔

(جاری ہے)

معاشرتی کہانی

کنول بہزاد

روزنِ زنداں

کی ہو۔ میری اُمید بھری نظریں اُن کے چہرے کا طواف کرتیں اور مایوس لوٹ آتیں، میرا کاسۂ دل اُن کی محبت کے سکوں سے خالی ہی رہا۔ اُن کے نزدیک تو عورتوں کو شاید پیدا ہونے کا ہی حق نہیں تھا جینا تو دُور کی بات۔ حویلی سے باہر بھی

کوئی کھڑکی ہو
کوئی دریچہ ہو
کوئی روزن ہو
کوئی جھروکا ہو
کہ
سانس لینا آسان ہو
اور
زندگی مہربان ہو

طبیعت میں کروفر، چہرے پہ رعونت، آنکھوں میں سُرخی، اُونچا شملہ اور آواز میں سختی۔ یہ چودھری علی نواز تھے۔ اس اُونچی حویلی کے سربراہ جہاں میں رہتی تھی۔ وہ جیسے پتھر کے اِنسان تھے۔ اُن کے سینے میں شاید دل ہی نہیں دھڑکتا تھا۔ مجھے نہیں یاد انھوں نے کبھی مجھ سے نرمی اور محبت سے بات بھی

وہ ایک جابر حکمران ہی تھے۔ گاؤں کے غریب لوگ اور مزارعے اُن کی دہشت سے تھر تھر کانپتے۔ گاؤں میں لڑکیوں کے اسکول نام کی کوئی عمارت نہیں تھی البتہ لڑکوں کا ایک پرائمری اسکول ضرور تھا۔ ہاں حویلی کے لڑکے چاہتے تو پڑھنے کے لیے سات سمندر پار بھی جا سکتے تھے مگر لڑکیوں کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

اس حویلی میں ہم چار عورتیں تھیں۔ بڑی اماں، چھوٹی امی، صاحباں پھوپھو اور میں۔ ہم ابا کی زنان خانے میں آمد پر سہم جاتیں۔ مجھے اُنھیں دیکھ کر کبھی خوشی نہیں ہوئی۔ چھوٹی امی ان کی چچا زاد تھیں اور پسندیدہ بیوی بھی۔ اس لیے اُن کو تھوڑی بہت مراعات ضرور حاصل تھیں۔ میرے دونوں بھائی جوابا کی ہو بہو تصویر تھے، اُن کے چہیتے تھے۔ وہ ہر وقت ان کے ساتھ ہی رہتے اور انھی کی طرح سخت لہجے اور اُونچی آواز میں بات کرنے کے عادی تھے۔

بڑی اماں جو میری سگی ماں تھیں، مدت ہوئی حالات سے سمجھوتہ کر چکی تھیں۔ اُنھیں حویلی کے معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کا زیادہ وقت عبادت میں گزرتا۔ مجھ سے بھی بہت کم بات کرتیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا میں اُن کی سگی بیٹی نہیں ہوں۔ اگر چھوٹی امی اس حویلی میں نہ ہوتیں تو شاید میں مر ہی جاتی۔ اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ مجھے بے حد چاہتی تھیں اور چپکے چپکے میرے سارے ناز اُٹھاتیں۔ کبھی کبھی انھیں شہر جانا پڑتا کیونکہ وہ بیمار رہتی تھیں۔ تب میں اُن کے ساتھ جاتی تھی۔

وہاں وہ اپنے ایک ہی بھائی کے گھر رہتی تھیں۔ اُنھیں اپنے اس بھائی سے بے حد محبت تھی اور اس کی بھی وجہ تھی ورنہ بھائی تو اُن کے تین تھے۔ وہ کہتی تھیں:

''میں بھی اپنے گھر میں تمہاری طرح اکیلی تھی۔ کھوئی کھوئی، اُداس اور محبتوں کی متلاشی۔ ہمارے گھر میں بھی بہت گھٹن تھی۔ ایسے میں مظفر چودھری نے میری تنہائی بانٹ لی۔ وہ بھائی سے سہیلی بن گیا۔ اُس سے میں ہر دُکھ کہہ لیتی تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ اس نے مجھے بھی کتابوں سے روشناس کرایا۔ میرے پاس کوئی ڈگری نہیں لیکن میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ علم ہمارا اندر روشن کر دیتا ہے۔''

ارے ہاں! صاحباں پھوپھو کے بارے میں بتانا تو میں بھول ہی گئی۔ شہزادیوں کی سی آن بان رکھنے والی وہ خوبصورت عورت اب شاید ایک مٹی کی مورتی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں اتنی ویرانی ہے کہ ڈر لگتا ہے۔ دریچے میں بیٹھ کر کسی کی راہ تکتی رہتی ہے۔ نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا۔

میں نے کبھی اُنھیں ہنستے اور بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ وہ روتی بھی نہیں تھیں مگر وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھیں۔ کبھی اُن کی مترنم آواز میں بھی جادو تھا۔ وہ ہنستی تھیں تو جیسے راہی راستہ بھول جایا کرتے تھے۔ پھر صاحباں پھوپھو کو کسی سے محبت ہوگئی۔ وہ بھی گاؤں کے ایک عام سے نوجوان سے۔ یہ جُرم بہت بڑا تھا۔ اُن کے باپ اور بھائیوں نے اُس نوجوان کو غائب کروا دیا۔ جانے اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ پھر اُسے گاؤں میں کسی نے نہیں دیکھا۔ صاحباں پھوپھو کو ایسی چُپ لگی کہ پھر اُنھیں کسی نے بولتے ہوئے نہ دیکھا۔ وہ بس دریچے میں بیٹھی کسی کی راہ تکتی رہتیں۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ میں اور چھوٹی امی ان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتے اور وہ بس ایک روبوٹ کی طرح ہمارا کہا مان لیتیں۔

چھوٹی امی کی صحبت میں رہ کر مجھے بھی پڑھنے کا شوق ہو چلا تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہر حال میں مجھے پڑھائیں

گی اور انھوں نے اپنا وعدہ وفا بھی کیا۔ کتابوں کی دُنیا بہت خوبصورت اور دلچسپ تھی۔ اتنی کہ میں گھنٹوں اس میں محو رہتی تھی۔ بقول چھوٹی امی، میں ذہین تھی اور میں نے بہت جلد لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

اب میرے دو ہی دوست تھے، چھوٹی امی اور کتابیں۔ البتہ اس سارے قصے کی میرے باپ کو خبر تھی اور نہ میرے بھائیوں کو۔ وہ زنان خانے میں ویسے بھی کم ہی آتے تھے۔ ایک دن اماں نے بھی مجھے ٹوک دیا:

''کیوں اپنی دشمن بنی ہو اس سوتیلی کے کہنے میں آ کر؟'' میں نے اماں کو حیران ہو کر دیکھا اور بس اتنا کہا:

''اماں میں جینا چاہتی ہوں۔'' اور وہ چُپ ہو کر تسبیح کے دانے گھمانے لگیں۔

اب تو صاحباں پھوپھو بھی کبھی کبھار میرے پاس آ کر بیٹھ جاتیں اور کتابیں اُلٹ پُلٹ کر دیکھتی رہتیں۔ یہ ایک اچھی تبدیلی تھی۔ اتنے برسوں بعد وہ کسی چیز میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ میں اُنھیں متوجہ دیکھ کر کوئی کتاب کھول لیتی اور اُنھیں کچھ پڑھ کر سنانے لگتی۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ کچھ دیر سنتیں پھر اُٹھ کر چلی جاتیں۔ شاید ایک دن پھوپھو پہلے جیسی ہو جائیں۔ میرے دل میں اُمید کی کرن جاگتی۔

بہت دن ایسے ہی گزر گئے۔ پھر میں نے چھوٹی امی سے ایک انوکھی فرمائش کر دی۔

''نہیں یہ ممکن نہیں۔'' وہ سختی سے بولیں:

''کیا کرو گی تم میٹرک کا امتحان دے کر؟''

''بس مجھے شوق ہے۔''

آخر وہ مجبور ہو گئیں اور کسی نہ کسی طرح میرا داخلہ بھجوا دیا۔ جب امتحان قریب تھے تو وہ 'بیمار' پڑ گئیں۔ وہی سانس کی تکلیف، جس میں وہ بچپن سے مبتلا تھیں اور ابا نے ہم دونوں کو ہمیشہ کی طرح شہر بھیج دیا۔

چھوٹی امی نے خوب محنت سے پڑھایا۔ میرے سارے پرچے اچھے ہو گئے اور ہم گاؤں لوٹ آئے۔ جس دن میٹرک کی سند میرے ہاتھوں میں آئی۔ میں گویا ساتویں آسمان پر پہنچ گئی۔ ایک انوکھا احساس تھا خوشی اور سرشاری کا۔ ہاں میں بھی کچھ کر سکتی ہوں..... میں بھی کچھ کر سکتی ہوں۔ اس کے بعد میں اور بھی دل لگا کر پڑھنے لگی۔ میرا دل چاہتا تھا میں انٹر کروں مگر اپنی اس خواہش کا اظہار میں نے چھوٹی امی سے نہیں کیا۔ میں اپنی وجہ سے انھیں کسی مُشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ بس اللہ سے دعا کرتی رہتی کہ یہ خواہش کسی طرح پوری ہو جائے۔

صاحباں پھوپھو اب اکثر میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھیں اور میں اُن سے ڈھیر ساری باتیں کرتی رہتی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا جیسے ابھی وہ کچھ کہیں گی مگر پھر جیسے کوئی چیز اُنھیں روک لیتی یا شاید یہ سب میرا وہم تھا۔

ایک دن میں اُداس بیٹھی تھی کہ چھوٹی امی میرے پاس چلی آئیں اور کہنے لگیں:

''فصل کی کٹائی کا موسم ہے۔ ایسے میں تمھیں پتا ہے میری سانس کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ تم تیاری کرو ہم شہر جائیں گے۔ انٹر کے امتحان بھی ہونے والے ہیں۔''

''چھوٹی امی.....''

''شش!'' انھوں نے میرے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھی۔ میں بے انتہا خوش تھی۔ چھوٹی امی نے کیسے بِن کہے میری خواہش جان لی تھی۔ میں حیران و ششدر تھی۔

''چھوٹی امی! اب میں آپ کو کبھی کسی مُشکل میں نہیں ڈالوں گی۔ میں نے جتنا چاہا تھا مجھے اس سے زیادہ ہی مل گیا۔'' انٹر کی سند ہاتھ میں لے کر میں نے اُن سے کہا:

''پگلی کہیں کی۔'' اُنھوں نے مجھے گلے لگا کر ماتھا چوما۔ اُن کے آنسو میرا چہرہ بھی تر کر گئے۔

خوشی اور سرشاری کے دن تھوڑے ہی تھے۔ اس حبس زدہ اور گھٹن کے ماحول میں آگہی بھی کسی عذاب سے کم نہ تھی۔ میں نے چھوٹی امی سے جو کچھ کہا تھا اس پر عمل کرنا مُشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میری خواہشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں گریجوایشن، اس کے بعد ماسٹرز اور نا جانے کیا کیا کرنا چاہتی تھی۔ میرا جی چاہنے لگا تھا کہ حویلی سے باہر نکلوں۔ اپنے علم کو کام میں لاؤں۔ گاؤں کی لڑکیوں کو تعلیم دوں مگر یہ سب ایک دیوانے کے خواب جیسا ہی تو تھا۔

ایسے ہی اُداس دنوں میں، مَیں جب یونہی ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی تو صاحباں پھوپھو میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''صاحباں پھوپھو! آپ نے کیوں چپ کی چادر اوڑھ لی۔ کچھ تو کہتیں۔ کسی سے اپنا حق تو مانگتیں اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں تو چیخ چیخ کر اس حویلی کے در و دیوار ہلا دیتیں۔ شاید پتھر کے انسانوں میں کوئی جونک لگ جاتی.....''

مُجھ پر ایک جنوں کی سی کیفیت طاری تھی۔ جانے میں اور کیا کیا کہتی رہی کچھ یاد نہیں۔ چونکی تو اس وقت جب میں نے پھوپھو کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔

''پھوپھو..... پھوپھو.....'' میں نے انھیں ساتھ لپٹا لیا۔ پھر جب وہ چُپ ہوئیں تو میں نے انھیں الگ مگر یہ کیا وہ تو ہمیشہ کے لیے چُپ ہو چکی تھیں۔ میں نے چیخ چیخ کر حویلی سر پہ اُٹھا لی۔ ابا نے چھوٹی امی سے کہا:

''اسے کہو چُپ ہو جائے۔ اس حویلی کی عورتوں کی آواز مردان خانے تک نہیں آنی چاہیے۔''

اور میں واقعی چپ ہو گئی اور اتنے برس پہلے مرجانے والی عورت کو بالآخر دفنا دیا گیا۔

حویلی اور بھی حبس زدہ اور وحشت ناک ہو گئی۔ ہم تینوں عورتیں بھی جیسے ایک دوسرے سے مُنہ چھپائے پھرتی تھیں۔ کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ میرا کتابیں پڑھنے کو دل کرتا اور نہ ہی عبادت میں جی لگتا۔ یوں جیسے جینے کی خواہش ہی ختم ہو گئی تھی۔ ایسے میں جانے کب میں بھی دریچے میں بیٹھ کر کسی کی راہ تکنے لگی۔

میں پہروں وہاں چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ چھوٹی امی آ کر اُٹھاتیں تو اُٹھ جاتی۔

''چھوٹی امی! بھلا حویلی میں دریچے بھی کیوں ہیں؟''

شاید پہلی بار چھوٹی امی نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور منہ پھیر کر چلی گئیں۔

پھر ایک دن میں نے دریچے کی اوٹ سے اُسے دیکھا۔ ہاں وہ بالکل میرے خوابوں جیسا تھا۔ سادہ سی پُروقار شخصیت۔ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا وہ حویلی میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے چہرے سے بے انتہا نرمی اور محبت چھلکتی تھی اور میں اُسے پہروں تکتی رہتی۔ ہاں شاید مجھے بھی صاحباں پھوپھو کی طرح محبت ہو گئی تھی۔

چھوٹی امی مجھے آواز دیتی رہتیں مگر میں سُنی اَن سُنی کر دیتی۔ بڑی اماں آ کر مجھے اُٹھانے کی کوشش کرتیں۔

''بچے! کیا تکتی رہتی ہے دریچے سے؟ میں تجھے منع کرتی تھی ناں! تیری سوتیلی ماں تجھے دوسری صاحباں بنانا چاہتی ہے۔''

''دوسری صاحباں.....'' میں نے دہرایا۔

''ہاں! دیکھو تو اپنی حالت!'' اماں غصے سے بولیں۔

انھی دنوں چھوٹی امی پھر بیمار پڑ گئیں۔ وہ شہر جانے کی تیاری میں تھیں اور مجھے اُن کے ساتھ جانا تھا ہمیشہ کی طرح مگر

اب میں اُن کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اتنے دن وہ چہرہ نہیں دیکھوں گی تو کیسے رہ پاؤں گی؟ میں بے حد پریشان تھی۔ کاش کوئی سبب بن جائے کہ مجھے شہر نہ جانا پڑے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔

''ہاں! میں شہر بانو ہوں۔ کہتے ہیں دُعا بھی سوچ سمجھ کر کرنی چاہیے۔ اس دن جب میں دعا مانگ رہی تھی کہ کسی طرح مجھے شہر نہ جانا پڑے۔ اچانک حویلی میں کہرام مچ گیا۔ میرے باپ اور بھائیوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ سب کیوں ہوا؟ میں نے یہ کب چاہا تھا۔ میرے اندر کی بہن اور بیٹی بین کرنے لگی۔ وہ جیسے بھی تھے میرے اپنے تھے۔ کاش، انھیں ہدایت کا راستہ ملتا۔ کاش یہ سب نہ ہوتا۔ ہم تینوں عورتیں جیسے تپتی دھوپ میں آن بیٹھی تھیں۔ وہ جیسے بھی تھے ہمارا سائبان تھے۔ کتنے دن اس غم میں گزر گئے۔ پھر چھوٹی امی نے میری ہمت بندھائی۔

''پتا ہے شہر بانو! ان مشکل حالات میں بھی تم کیوں زیورِ تعلیم سے آستہ ہوئیں؟ سوچو تو ایک ناممکن بات کیونکر ممکن ہوئی؟ اس اُوپر والے نے تم سے کوئی بڑا کام لینا تھا۔ تمہاری گریجوایشن کی تیاری مکمل ہے۔ امتحان دو اور آگے بڑھو۔ شہرِ علم کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ اس گاؤں کی کتنی ہی لڑکیاں حصولِ علم کے لیے ترس رہی ہیں۔ اُن کے لیے بھی یہ دروازے تمہارے ہاتھ سے کھلیں تو کتنی بڑی سعادت کی بات ہوگی..... تمہارے پاس وسائل ہیں۔

یہ اتنی بڑی حویلی ہے، اسی حویلی کو ہی ایک مثالی درس گاہ میں بدل کر تم نہ صرف اپنے لیے بلکہ وہ جو چلے گئے، اُن کے راستے بھی آسان کر سکتی ہو..... میں جب تک زندہ ہوں، ہر ہر مرحلے پر تمہارا ساتھ دوں گی..... اُٹھو میری بچی..... نئی زندگی، نیا کل تمہارا منتظر ہے.....''

پھر وہ ہوا جس کا یقین مجھے خود کو بھی نہیں ہوا۔ حالانکہ سب میرے اور چھوٹی امی کے ہاتھوں، ہماری نظروں کے سامنے ہوتا چلا گیا۔ شاید یہ نیتوں کا پھل تھا کہ راستے خود بخود آسان ہوتے چلے گئے۔ میں، جو اپنے باپ اور بھائیوں کے رویوں کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں سے خائف تھی، انھوں نے میری توقع سے بڑھ کر میرا ساتھ دیا۔ مجھ سے باپ بھائی کیا چھنے..... میں سب کی بیٹی اور بہن بن گئی۔

حویلی کو لڑکوں کے لیے فلاحی مرکز اور لڑکیوں کے لیے اسکول میں بدل دیا جہاں وہ نا صرف ہنر سیکھتیں بلکہ زیورِ تعلیم سے بھی آراستہ ہوتی ہیں۔ زمینوں کا بڑا حصہ غریب مزارعوں میں تقسیم کر دیا۔ سڑکیں اور ڈسپنسریاں بنوائیں۔ اب ایک بڑا اسپتال بھی زیرِ تعمیر ہے۔ اماں کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی۔ وہ حادثے کے چند ماہ بعد ہی ہمیں چھوڑ گئیں۔

چھوٹی امی میری شادی کی خواہاں تھیں مگر وہ ایک شخص جسے میں دریچے میں بیٹھ کر دیکھا کرتی تھی، پھر کہیں نہ ملا۔ شاید وہ محض میرا واہمہ تھا..... کوئی خیالی پیکر جسے میری محرومیوں نے تراش لیا تھا، پھر ہم نے اُس کی تلاش ختم کر دی۔ زندگی میں کرنے کو بہت کچھ تھا، اور ہے..... بس ذرا ذات کی قید سے نکلنے کی ضرورت ہے۔

دریچوں سے دروازوں تک کا سفر کٹھن ضرور ہے مگر اوروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا..... دروازے کھولنا بڑا ہی معتبر کام ہے۔

آج سوچتی ہوں کہ وہ چھپ چھپ کر پڑھائی کرنا، شاید اس لیے اللہ کو پسند آ گیا کہ میں نے اوروں کی طرح شاید غلط راستے نہ چنے۔ صرف ایک جائز اور نیک کام چُنا اور وہ تھا حصولِ علم..... تو اللہ کیسے نہ سہارا دیتا۔

◆◆◆

سبق آموز کہانی

شفیق حمید

کہکشاں

تین مرلے کے گھر میں تین بھائی مقیم تھے۔ تینوں شادی شدہ تھے لیکن خدا نے اولاد صرف بڑے بھائی یعنی فاروق کو نواز رکھی تھی۔ فاروق کریانہ سٹور کا مالک تھا۔ ایک روز فاروق کے کریانہ اسٹور پر اچانک ایک بارہ سالہ بچہ ہاتھوں میں لفافہ لیے آیا اور فاروق کو دے کر بھاگ گیا۔ دوسرے گاہکوں کی وجہ سے فاروق نے لفافہ ایک جگہ رکھا اور مصروف ہوگیا۔ رات کو اسے لفافہ یاد آیا تو فوراً اسے کھولا۔ اس میں ایک گولی اور کچھ یوں درج تھا۔

''مارچ کی سولہ تاریخ کو فلاں جگہ بیس لاکھ کا بیگ پہنچا دو ورنہ یہ گولی سترہ مارچ کو تمہاری کھوپڑی میں ہوگی۔ پولیس کو اطلاع دی تو اپنے بیٹے قاسم کو کھونے کے لیے تیار ہوجانا۔''

یہ لفافہ لیے وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ ہاتھ پاؤں ڈر کے مارے کانپ رہے تھے۔ گھر پہنچنے پر نو سالہ بیٹا قاسم اور بیوی نے اس حالت کی وجہ پوچھی تو اس نے لفافہ انھیں تھمایا۔ گھر میں سب پریشان ہوگئے۔ فاروق اگر اپنا سارا مال و متاع بھی بیچتا تو نو لاکھ ہی بن پاتے۔ باقی گیارہ لاکھ کہاں سے لاؤں گا؟ پولیس کو مطلع کروں؟ نہیں نہیں قاسم میرا بیٹا مجھے میری جان سے زیادہ عزیز ہے۔ دن گزرتے گئے۔ آخر سترہ مارچ کا دن آپہنچا۔ فاروق نے صبح فجر کی نماز ادا کی اور دکان کی طرف چل پڑا۔ دن کے ایک بجے دو نقاب پوش آدمی موٹر سائیکل پر سوار اس کی دکان کی طرف آئے اور اچانک فائرنگ شروع کردی۔ اگلے چند لمحوں میں گولی فاروق کی کھوپڑی کے آر پار ہوچکی تھی۔

فاروق کی موت کے تین ماہ بعد اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں نے اس کی بیوی اور قاسم کو گھر سے نکال دیا۔ دونوں فٹ پاتھ پر آگئے۔ قاسم سرکاری سکول میں تعلیم حاصل کررہا تھا۔ وہ ماں کو سسکتا دیکھ کر دل میں عہد کرتا کہ ہار نہیں مانے گا۔ پڑھائی میں دل و جان سے محنت کرتا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ دوسرے بچوں کے ساتھ گتے اور پلاسٹک کی بوتلیں چنتا اور شام کو انھیں کباڑ میں بیچ کر چند پیسے کمالیتا۔ یوں قاسم نے میٹرک اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا اور کباڑ کے کام سے تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کر اس قابل ہوگیا کہ ایک کرائے کی دکان خرید سکے۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس سرمایہ نہ تھا۔ اس نے کرائے کی دکان پر چائے بنانا شروع کردی۔ آہستہ آہستہ منافع اچھا خاصا ہونے لگا اور وہ اس قابل ہوگیا کہ ایک گھر خرید سکے۔

دن گزرتے دنوں میں قاسم کی دکان ہوٹل کا روپ اختیار کرگئی اور ایک سے کئی دکانیں بڑھ گئیں۔ اگر کام ایمانداری سے ہو تو خدا کی ذات مدد کرتی ہے۔ چائے کے کاروبار نے قاسم کو عزت سے جینے کے قابل اور پیسے والا بنا دیا تھا۔

آج قاسم نے اپنی ہمت، محنت اور لگن سے ثابت کر دکھایا کہ انسان اگر چاہے تو اپنی قسمت خود بدل سکتا ہے، تقدیر اپنی مرضی سے لکھوا سکتا ہے۔

آج کل کے نوجوانوں کو زندگی کی ہر سہولت، آزادی، گھر کا لاڈ، بڑوں کا سہارا، پیار، سب ہی تو میسر ہے مگر کاش وہ بھی اپنا وقت فضول گنوانے کے بجائے ان سے سبق سیکھیں جنہیں زندگی سنہری موقعے اگر نہیں دیتی تو وہ خود اپنے لیے جگمگاتی کہکشاں ڈھونڈ لیتے ہیں۔

آپ بیتی

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

غمِ عشق اگر نہ ہوتا
غمِ روزگار ہوتا

ہر شخص کی زندگی کے سفر میں ماسوائے بچپن کے، اِن دونوں قسم کے غموں کی آمیزش میں کمی بیشی وقت کے ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ کبھی ایک کم، دوسرا زیادہ، کبھی ایک مخفی، دوسرا ظاہر والی کیفیت سے ہر بنی نوع انسان دوچار رہتا ہے۔

خصوصیت کے اعتبار سے غمِ عشق یکجائی اور غمِ روزگار ہرجائی ہوتا ہے۔ عشق کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، خواہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہو یا اُس کی مخلوق سے۔ اِس سفر میں جتنا آگے جاؤ، منکسر مزاجی اور دَرویشی دَر آتے ہیں۔ جب غمِ عشق میں شدت آ جائے، تو آدمی بے خودی کی قلم رو میں داخل ہو جاتا ہے۔ منصور حلاج ''انا الحق'' کا نعرہ لگاتے، لگاتے سولی پر چڑھ گیا۔ چکور چاند کے گرد چکر لگاتے لگاتے نڈھال ہو جاتی ہے۔

عشق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک دل سے کیا جاتا ہے اور دُوسرا دماغ سے۔ ماں بچوں سے دل سے عشق کرتی ہے۔ اس کے عشق میں والہانہ پن ہوتا ہے اور باپ

اس سفر میں جتنا آگے بڑھتے جائیں، منکسر المزاجی اور درویشی کے در وا ہوتے ہیں

دماغ استعمال کرتا ہے۔ اس کے عشق میں ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ شیریں فرہاد اپنے عشق کی وارفتگی کے باعث مشہور ہیں۔ فرہاد نے شیریں کے فراق میں اپنے آپ کو ختم کر دیا۔ اگرچہ غالبؔ، فرہاد کے طریقِ کار سے متاثر نہ ہو سکے۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

فرہاد کا تعلق، الف لیلوی دور سے تھا۔ اُس زمانہ میں غمِ عشق کو غمِ روزگار پر فوقیت حاصل تھی۔ آج کل کے مادیت کے دور میں جوانی کا آغاز روزگار سے ہوتا ہے۔

غمِ عشق کے برعکس، جب غمِ روزگار اور دولت کی محبت شدت پکڑتی ہے، تو آدمی کی آنکھوں پر حرص و ہوس کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والے تناوے کے چکر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ دولت مند ہونے کے باعث اس میں خود غرضی آ جاتی ہے اور عزیز و اقارب کی مالی اعانت کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ قارون کی مثال بے حد سبق آموز ہے۔ قارون حضرت موسیٰ کا رشتہ کا بھائی تھا۔ اپنے وقت کا امیر ترین شخص تھا۔ اُس کے خزانوں کی چابیاں، قرآنِ کریم کے مطابق القصص (20:76-81) طاقتور لوگوں کا ایک گروہ بمشکل لے کر چلتا تھا۔ قارون بے حد مغرور، منافق، دروغ گو، چال باز، بے ایمان اور کینہ پرور شخص تھا۔ لوگوں کے مال میں خیانت کرتا۔ خودنمائی اور خودآرائی کا شوقین تھا۔ بے حد قیمتی، زمین پر گھسٹتا ہوا لباس پہنتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا دشمن تھا۔ اُس نے ایک عورت کو پیسے دے کر حضرت موسیٰؑ پر ایک جھوٹا الزام بھی لگوایا تھا۔ قارون کو جب اُس کے کچھ احباب نے نصیحت کی کہ تمہارے پاس اتنا مال و دولت ہے، اللہ کا شکر ادا کیا کرو اور مسکینوں کی بھی امداد کیا کرو، تو اُس نے بڑی رعونت سے جواب دیا،

یہ سب مال و دولت میں نے اپنی عقل و فراست کی وجہ سے کمایا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اُس کا مال و دولت اس کے کام نہ آیا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اُسے اُس کے مکان سمیت زمین میں دفن کر دیا۔

اِس ضمن میں مجھے ایک حکایت یاد آئی جو پاکستان کے لیڈروں کی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے: ایک پہاڑی علاقہ سے ایک ولیِ کامل کا گزر ہوا۔ اُنھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک پاکستانی آ رہا تھا۔ اُنھوں نے پوچھا کیا چاہیے؟ پاکستانی نے جواب دیا، غریب ہوں، کچھ عنایت فرمائیں۔ ولی نے ایک پہاڑ کی طرف اُنگلی اُٹھائی، پہاڑ سونے کا ہو گیا۔ وہ چل پڑے، دیکھا وہ پاکستانی پھر پیچھے آ رہا ہے۔ اُنھوں نے پوچھا اب کیا چاہیے؟ اُس نے جواب دیا تھوڑا ہے۔ ولی نے دوسرے پہاڑ کی طرف اُنگلی اُٹھائی وہ بھی سونے کا ہو گیا۔ اور اِسی طرح تیسری اور چوتھی طرف اُنگلی اُٹھائی۔ چاروں طرف کے پہاڑ سونے کے ہو گئے۔ ولی چل پڑے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ پاکستانی پھر پیچھے آ رہا تھا۔ ولی نے پوچھا، اب کیا چاہیے؟ پاکستانی نے عرض کیا: بزرگو..... ''یہ اُنگلی!''

دولت کے حصول کے لیے بڑھتی ہوئی ہوس ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج قناعت اور سادگی کے سوا کچھ نہیں۔

میری زندگی میں غمِ روزگار کا آغاز میرے انجینئرنگ کا امتحان پاس کرنے کے بعد 53-1952ء میں شروع ہوا۔ میری پیشہ ورانہ زندگی کو پانچ ادوار میں بانٹا جا سکتا ہے جس میں مجھے پانچ اداروں میں کام کرنے کے مواقع ملے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے تعلیمی دور میں چار جز وقتی ملازمتیں بھی کیں۔

میں نے اپنی پہلی پیشہ ورانہ ملازمت کا آغاز بطور اسسٹنٹ گیریژن انجینئر (Assistant Garrison Engineer)، ایم ای ایس (MES)، ایبوٹیشن

(Ammunition) فیکٹری، واہ کینٹ سے کیا۔ ایم ای ایس، ملٹری انجینئرنگ سروس کا مخفف ہے، لیکن لوگ اسے Money Earning Service کے طور پر زیادہ جانتے ہیں۔

جب میں نے واہ آرڈی نینس فیکٹری پروجیکٹ میں بطورِ اسسٹنٹ انجینئر کام شروع کیا، تو مجھے اِس پروجیکٹ میں ایک ہاؤسنگ کالونی کی تعمیر کی نگرانی کا کام سونپا گیا۔ اِس کالونی کی سڑکوں، پلاٹس اور کوٹھیوں کی زمین پر نشان دہی سے لے کر، کوٹھیوں کی تعمیر کی نگرانی کا کام میری ذمہ داری تھی۔

میں نے گرمیوں کے موسم میں رمضان کے روزوں کے باوجود، اپنے اوورسیئر اور مزدوروں کی مدد سے اِس کالونی کو تھیوڈولائٹ (Theodolite) کے ذریعے زمین پر منتقل کیا اور اس کی سڑکوں، پلاٹوں اور کوٹھیوں کی نشان دہی کے لیے اینٹوں کی برجیاں بنوادیں تاکہ ٹھیکیدار کا کام آسان ہوجائے۔ اِس کالونی کی تعمیر کا ٹھیکہ ایک بہت بڑے ٹھیکیدار کالے خان کو دے دیا گیا۔ یہ ٹھیکیدار انجینئرز میں بہت مقبول تھا کیونکہ کمیشن کے معاملہ میں وہ بالکل ہیرا پھیری نہیں کرتا تھا اور ہر انجینئر کا حصہ بہت 'دیانت داری' سے ادا کیا کرتا تھا۔ مجھے میرے اوورسیئر نے بتایا کہ کمانڈر ایم ای ایس نے کالے خان سے کہا تھا کہ یہ جو نیا انجینئر آیا ہے، اس کی کمیشن بھی مجھ کو ادا کردینا، اس کی کمیشن کھانے کے لیے عمر پڑی ہے! مجھے ویسے بھی کمیشن کی خواہش نہیں تھی۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ جو کوٹھیاں میری نگرانی میں بنیں، وہ مطلوبہ معیار کے مطابق ہوں۔

تعمیر کے دوران مختلف مرحلوں پر میری منظوری کے بعد ٹھیکیدار کے بلوں کی ادائیگی کی جاتی تھی۔ پہلا مرحلہ کوٹھیوں کی بنیادوں کی کھدائی کا تھا۔ میں نے بنیادوں کی چوڑائی اور گہرائی چیک کر کے ٹھیکیدار کا بل پاس کردیا۔ دوسرا مرحلہ بنیادوں میں کنکریٹ ڈالنے کا تھا۔ جب مَیں بنیادوں میں کنکریٹ ڈالنے کے وقت موقع پر پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ مزدور سیمنٹ، ریت اور بجری کو ہاتھوں سے ملا کر بنیادوں میں ڈالنے کی تیاری کررہے ہیں۔ کنٹریکٹ کے مطابق یہ سب کچھ دستی طور پر کرنے کے بجائے کنکریٹ مکسر کے ذریعے کرنا چاہیے تھا، کیونکہ ہاتھوں سے بنائے ہوئے کنکریٹ کی کوالٹی ناقص ہوتی ہے اور بجری، ریت اور سیمنٹ یکجان نہیں ہوپاتے۔ اِس لیے میں نے تعمیر کا کام رکوادیا اور ٹھیکیدار کو کنکریٹ مکسر لانے کے لیے کہا۔ ٹھیکیدار کو اس سے کافی نقصان پہنچا، ایک تو کنکریٹ مکسر لانے کا خرچ اور دُوسرے اتنے سارے مزدوروں کی مزدوری اسے ادا کرنا پڑی۔ اُس نے یہ سمجھا کہ میں نے یہ قدم کمیشن نہ ملنے کے باعث اُٹھایا ہے۔ میری کمیشن تو وہ کمانڈر صاحب کو ادا کرچکا تھا، اِس لیے اُس نے مجھے پیغام بھجوایا کہ آپ کو جتنی تنخواہ حکومت کی طرف سے ملتی ہے، اتنی ہی میں آپ کو ماہانہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے جواب بھجوایا کہ مجھے آپ کا تنخواہ دار ہونا منظور نہیں۔ اگر میں نے آپ سے تنخواہ لینی منظور کرلی، تو آپ کے کام کی نگرانی کیسے کروں گا۔ اگر آپ معیاری کام کرتے رہے، تو آپ کو میری طرف سے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ مجھے نہ تو کمیشن چاہیے اور نہ ہی مجھے کسی تنخواہ کی حاجت ہے۔

مجھے ایم ای ایس کی نوکری دو وجوہ کے باعث پسند نہیں آئی۔ ایک تو ایم ای ایس میں براہِ راست بھرتی کیے ہوئے انجینئرز اور فوج سے ڈیپوٹیشن پر آئے ہوئے انجینئرز میں بے حد تفریق برتی جاتی تھی۔ ایک ہی انجینئرنگ کالج میں پڑھے ہوئے، دو کلاس فیلوز میں سے اگر ایک فوج کی طرف سے آئے، تو برتر اور دُوسرا اگر براہِ راست بھرتی ہوکر آئے، تو کم تر ہوجاتا تھا۔ میری ایم ای ایس کی نوکری کے دوران ایم ای ایس کے فوجی انجینئر اِن چیف ہمارے پروجیکٹ پر دورے پر آئے، تو اُنھوں نے فوجی انجینئرز سے خصوصی طور پر خطاب کیا اور اُن کو ہدایت کی کہ وہ سویلین انجینئرز سے

زیادہ راہ و رسم نہ بڑھائیں، یہ لوگ راشی ہوتے ہیں۔ دوسرے بطورِ سویلین انجینئر، ایم ای ایس میں ترقی کے راستے بھی مسدود تھے۔ زیادہ سے زیادہ سویلین انجینئرز کمانڈر ایم ای ایس کے عہدہ تک پہنچ سکتے تھے۔ انجینئر اِن چیف کے عہدہ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ اِس لیے میں نے اپنی تقرری کے معاہدے کے مطابق ایک ماہ کے نوٹس کے ساتھ اپنا استعفیٰ کمانڈر ایم ای ایس کی معرفت انجینئر اِن چیف صاحب کو بھیج دیا۔

جب میرا استعفیٰ کمانڈر صاحب کے پاس پہنچا، تو اُنھوں نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ بہت شفقت سے پیش آئے۔ کہنے لگے اتنی اچھی نوکری کیوں چھوڑ رہے ہو۔ ایک دن تم بھی میری طرح کمانڈر ہو جاؤ گے۔ دیکھو میری زندگی کتنے ٹھاٹ سے گزر رہی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ کمانڈر صاحب کو میں عزیز نہیں، بلکہ میری کمیشن جو اُن کو مل رہی تھی، عزیز ہے۔ بہرحال میں اپنے نوٹس کی معیاد ختم کرنے کے بعد لاہور واپس آ گیا اور یوں میرے حصولِ روزگار کا پہلا دور اختتام کو پہنچا۔

میرے لاہور واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد میرا انتخاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں بطور اسسٹنٹ انجینئر ہو گیا۔ اسسٹنٹ انجینئر کو عام طور پر سب ڈویژنل آفیسر تعینات کیا جاتا تھا، لیکن اُس زمانہ میں ٹاؤن پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں ٹاؤن پلانرز کی بے حد کمی تھی، اس لیے وہاں بھی اسسٹنٹ انجینئرز کو تعینات کیا جاتا تھا۔ چیف انجینئر صاحب نے حکم صادر فرمایا کہ دو سب سے جونیئر اسسٹنٹ انجینئرز کو ٹاؤن پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں بطورِ اسسٹنٹ ٹاؤن پلانر تعینات کر دیا جائے۔ اُس وقت سینیارٹی عمر کے حساب سے مرتب کی جاتی تھی۔ چودھری عبداللطیف اور میں عمر میں سب سے کم ہونے کی وجہ سے کیونکہ سب سے جونیئر تھے، اِس لیے ہم دونوں کو ٹاؤن پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں بطورِ اسسٹنٹ ٹاؤن پلانرز تعینات کر دیا گیا۔ ٹاؤن پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں تقرری انجینئرز کے لیے کالے پانی بھیجنے کے مصداق تھی۔ یہ ایسی ہی تھی جیسے کسی تھانیدار کو لائن حاضر کر دیا جائے۔ میرے پاس میرے ساتھی انجینئرز ہمدردی کے لیے آئے کہ ہمیں تمہارے اِس یتیم قسم کے محکمہ میں تعیناتی کا بے حد افسوس ہے۔

عبداللطیف صاحب نے حکومت پر دعویٰ کر دیا کہ ٹاؤن پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں تقرری میرے بطورِ اسسٹنٹ انجینئر کے انتخابی قواعد کی خلاف ورزی تھی۔ اِس لیے مجھے واپس پی ڈبلیو ڈی میں بھیجا جائے۔ عدالت نے فیصلہ لطیف صاحب کے حق میں دیا، اِس لیے لطیف صاحب کا تبادلہ پی ڈبلیو ڈی میں کر دیا گیا۔ میرے لیے بھی یہ راستہ کھلا تھا۔ پی ڈبلیو ڈی میں آئندہ ترقی کا راستہ بھی ایم ای ایس کی طرح مسدود نہیں تھا اور میں اپنی کارکردگی کی بنیاد پر چیف انجینئر کے عہدہ تک ترقی پا سکتا تھا، لیکن میں نے سوچا کہ پی ڈبلیو ڈی میں ساری عمر سڑکوں، پُلوں اور عمارات کی تعمیر کی نگہداشت میں مصروف رہوں گا۔ اگرچہ تھانیداری تو بہت ہوگی، لیکن علمیت کے راستے مسدود ہو جائیں گے۔ جہاں تک اوپر کی آمدن کا معاملہ ہے، میری نیت کمیشن لینے کی نہیں تھی، اگرچہ ہر عمل کا دارومدار آدمی کی نیت پر ہوتا ہے، لیکن لالچ بری بلا ہے، نامعلوم کب نیت بدل جائے۔ اس لیے ایسے راستوں کو اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ روزی تو ہر شخص کی مقسوم ہوتی ہے۔ (قرآن: القصص آیت 82)۔ صرف دیر سویر کی بات ہے۔ کچھ لوگ بے صبری کے باعث اپنی مقسوم شدہ روزی ناجائز طریقوں سے پہلے کما لیتے ہیں اور جو لوگ صبر کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں، اُنھیں بھی اپنی مقسوم شدہ روزی اپنے وقتِ مقررہ پر مل جاتی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے

ٹاؤن پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس ضمن میں مجھے حضرت علیؓ کا ایک واقعہ بھی یاد آ گیا۔ حضرت علیؓ جب امیر المومنین تھے، اُن کا اپنے ایک سفر کے دوران ایک گاؤں سے گزر ہوا۔ حضرت علیؓ گاؤں کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے اپنے گھوڑے سے اترے۔ مسجد کے دروازہ پر ایک غریب شخص بیٹھے، پرانے کپڑوں میں زدہ حال بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ کو اُس پر رحم آیا۔ اُنھوں نے اِس شخص سے کہا جب تک میں نماز پڑھوں، تم میرے گھوڑے کی مالش کردو۔ واپسی پر میں تمہیں اِس کی اجرت دے دوں گا۔ جب حضرت علیؓ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلے، تو دیکھا کہ وہ شخص حضرت علیؓ کے گھوڑے کی کاٹھی لے کر رفو چکر ہو چکا تھا۔ حضرت علیؓ گاؤں میں ایک چمڑے کے دکان پر کاٹھی خریدنے کے لیے پہنچے، تو دیکھا اُن کی کاٹھی وہاں رکھی ہوئی ہے۔ دکاندار سے پوچھا یہ کاٹھی تمہارے پاس کیسے آئی؟ اُس نے جواب دیا، ابھی ایک شخص بیچ کر گیا ہے۔ حضرت علیؓ نے پوچھا، تم نے کتنے میں یہ کاٹھی خریدی؟ اُس نے جواب دیا میں نے تین دینار میں یہ کاٹھی خریدی۔ حضرت علیؓ نے کہا اتنے ہی میرا اُسے اپنے گھوڑے کی مالش کرنے کے عوض دینے کا ارادہ تھا۔ وہ شخص ذرا انتظار کر لیتا، تو وہ تین دینار اُس کے حلال کی کمائی ہوتے جو اُس نے چوری کر کے کمائے ہیں۔

ٹاؤن پلاننگ ڈیپارٹمنٹ کی نوکری میرے حصولِ روزگار کا دوسرا دور تھا جو 1954ء میں ایم ای ایس کی ملازمت چھوڑنے کے بعد شروع ہوا اور 1975ء تک رہا۔ یہ دور تقریباً اکیس سال پر محیط رہا۔ یہ دور وَاقعاتی طور پر بھرپور رَہا۔ تعلیمی اعتبار سے یہ بے حد مفید رَہا۔ اس دور میں مَیں ایک مرتبہ ٹروپیکل آرکیٹیکچر کا کورس کرنے چھے ماہ کے لیے 58-1957ء میں لندن گیا۔ دوسری مرتبہ دو سال کے لیے ٹاؤن پلاننگ میں ایم ایس سی کرنے، چھٹی برائے تعلیم لے کر 61-1959ء میں

امریکا گیا۔ تیسری مرتبہ 1967ء میں تین ماہ کے لیے اربن اور ریجنل پلاننگ کے اداروں، قانون اور نقشوں کے مطالعہ کے لیے ہالینڈ گیا۔ چوتھی اور پانچویں مرتبہ 68-1967ء اور 75-1973ء میں پی ایچ ڈی کی شروعات اور تکمیل کے لیے دوبارہ اور تیسری بار امریکا گیا۔ مالی طور سے یہ دور آسودگی اور تنگی کی آمیزش کا دور رَہا۔ اسی دور میں 1964ء میں میری شادی ہوئی۔ پہلے ہالینڈ اور امریکا، بیوی اور ایک بیٹی کے ساتھ گیا۔ دوسری مرتبہ بیوی، دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ گیا۔ میں 68-1967ء میں امریکا کیونکہ وزٹ ویزے پر گیا تھا، اِس لیے امریکا میں کام نہیں کر سکتا تھا، لیکن بشریٰ کے ویزہ میں کام کرنے کی اجازت تھی، اِس لیے بشریٰ کو وسکونسن کے سٹیٹ پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں پلانر کی نوکری مل گئی تھی۔ وہ صبح دفتر جاتے وقت کسریٰ کو بے بی سسٹر کے پاس چھوڑتی ہوئی جاتی تھیں اور دَفتر سے آتے وقت کسریٰ کو بے بی سسٹر کے پاس سے لیتی ہوئی گھر واپس آتی تھیں۔ 1973ء میں مَیں امریکا سٹوڈنٹ ویزہ پر گیا تھا جس میں کام کرنے کی اجازت تھی، لیکن بشریٰ کے ویزہ میں کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اِس لیے گھر کا خرچ پورا کرنے کے لیے بشریٰ کو بے بی سٹنگ کرنا پڑی اور مجھے رات کو لڑکیوں کے ہاسٹل کی چوکیداری کا کام کرنا پڑا۔ لڑکیوں کے ہاسٹل کی چوکیداری کا کام صرف پی ایچ ڈی طلبا کو ملتا تھا، کیونکہ یہ بہت ذمے داری کا کام تھا۔ انڈر گریجویٹ طلبا کو یہ کام دینے میں خطرہ لاحق تھا کہ وہ چوکیداری کی بجائے، رات لڑکیوں سے دوستی کرنے میں گزار دیں گے۔

لڑکیوں کے ہاسٹل میں رات کی چوکیداری میں میرا کام یہ ہوتا تھا کہ رات کے بارہ بجے سے صبح چھے بجے تک کسی لڑکے کو ہاسٹل میں نہ تو داخل ہونے دیا جائے اور نہ ہی باہر نکلنے دیا جائے۔ مجھے داخلے کے دروازے کے ساتھ ایک ڈیسک اور لیمپ فراہم کر دیا جاتا تھا اور میں رات کے بارہ بجے سے صبح

چھے بجے تک کا وقت لکھنے پڑھنے میں گزار کر گھر واپس آجاتا تھا۔ دراصل مجھے پڑھنے کے لیے پیسے ملتے تھے۔ اِس نوکری میں فی گھنٹہ اجرت بھی یونیورسٹی کی دوسری نوکریوں کی نسبت زیادہ تھی۔ صرف کڑاکے کی سردی میں رات کے بارہ بجے گھر سے نکلنے اور صبح چھے بجے لَوٹنے کا مسئلہ کافی گھمبیر تھا۔ رات بھر یونیورسٹی کا مستقل چوکیدار بوب لڑکیوں کے ہاسٹل کا چکر لگا کر رات کے طالب علم چوکیداروں کو چیک کرتا رہتا تھا کہ کہیں سو تو نہیں رہے یا لڑکیوں سے دوستیاں تو نہیں کر رہے۔ رات کے چوکیداروں کے اپنے اپنے انداز تھے، بوب میرا دوست بن گیا تھا۔ اُس زمانہ میں میرے پاس اپنی کار نہیں تھی۔ میں اپنے ایک دوست فرحت علی برنی کی کار میں رات کی چوکیداری کے لیے آیا کرتا تھا۔ اُن کی کار کے پٹرول، تیل کے اخراجات ہم دونوں آدھے آدھے بانٹ لیتے تھے۔ دن کو یونیورسٹی آنے جانے کے لیے میں یونیورسٹی کی بس استعمال کیا کرتا تھا۔ یہ بس صبح چھے بجے سے رات کے بارہ بجے تک ہر گھنٹہ بعد یونیورسٹی اور طلبا کی رہائشی کالونی ایگل ہائٹس (Eagle Heights) کے درمیان چلتی تھی۔ کبھی کبھی جب مجھے یونیورسٹی لائبریری سے نکلنے میں دیر ہو جاتی، تو مجھے آخری بس چلے جانے کی وجہ سے پیدل گھر واپس آنا پڑتا تھا۔ بوب کو اس بات کا پتہ تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا میری بیسمنٹ (basement) میں میری پرانی سائیکل بیکار رکھی رہتی ہے، تم اُس کی مرمت کروا کر یونیورسٹی آنے جانے کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ بوب کی سائیکل مل جانے کے باعث مجھے ایگل ہائٹس سے یونیورسٹی آنے جانے میں بہت آسانی ہوگئی۔ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد جب مجھے گرین بے میں یونیورسٹی آف وسکونسن میں پڑھانے کی جگہ ملی، تو پھر میں نے بوب کی سائیکل واپس کی۔

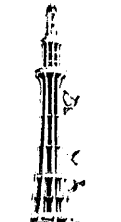

میرے لڑکیوں کے ہاسٹل کی چوکیداری کرنے والوں میں ایک صاحب یوسف ضیغم نقوی بھی تھے۔ شاعری کا شوق رکھتے تھے۔ چوکیداری کے اوقات میں لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر اُن پر بے ساختگی سے غزلوں کا نزول شروع ہو جایا کرتا تھا۔ ایک رات بوب جب اپنے عمومی چکر میں رات کے چوکیداروں کی کارکردگی چیک کرنے کے لیے لڑکیوں کے ایک ہاسٹل میں پہنچا، تو ضیغم صاحب ایک لڑکی سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ بوب نے ڈانٹا کہ تمہارا کام لڑکیوں سے گپ شپ کرنا نہیں ہے۔ ضیغم نے جواب دیا گپ شپ تو یہ لڑکی کر رہی ہے، میں تو صرف اِس کا جواب دے رہا ہوں۔

ایک اور ساتھی مشتاق علی خاں تھے۔ لکھنو کے پاس فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ جہاں کبھی امراؤ جان ادا نے اِس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ اُردو، گرمکھی میں لکھتے اور پڑھتے تھے۔ س اور ش ٹھیک طرح سے پڑھ سکتے تھے، صرف استعمال میں اُلٹ کر دیا کرتے تھے شعر کو سیر اور رسم کو رشم کہتے تھے۔ شادی کی رسم کو سادی کی رشم کہا کرتے تھے۔ بڑے اچھے مسلمان تھے۔ ایک رات اُن کی چوکیداری کے دوران ایک صاحب زادے رات کے دو بجے جھومتے جھامتے ہاسٹل سے باہر جانے کے لیے آئے، تو مشتاق صاحب نے کہا کہ اپنا یونیورسٹی کا آئی ڈی کارڈ نمبر لکھواؤ، تمہاری رپورٹ کرنی پڑے گی کہ تم رات کے دو بجے گرلز ہاسٹل سے نکلے ہو۔ اُس لڑکے نے خان صاحب کی بہت منت سماجت کی، بہت گڑگڑائے، لیکن خان صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے کہ ہم اپنی ڈیوٹی سے غفلت نہیں برت سکتے۔ جب لڑکے نے بہت خوشامد کی تو خان صاحب نے کہا تمہارے سامنے دو راستے ہیں، یا تو مجھے آئی ڈی کارڈ نمبر درج کرواؤ اور اِس ہاسٹل سے نکل جاؤ یا پھر اپنی گرل فرینڈ کے پاس واپس چلے جاؤ اور چھے بجے کے بعد جب میری ڈیوٹی ختم ہو جائے، تو چلے جانا۔ اُس

لڑکے نے دوسرا راستہ منتخب کیا اور واپس ہاسٹل میں اپنی گرل فرینڈ کے پاس چلا گیا۔

ایک ساتھی فرحت علی برنی بھی تھے۔ بے حد نمازی اور عبادت گزار تھے۔ ایک رات جب لڑکیوں کے ہاسٹل کی نگہداشت کے لیے گھر سے نکلنے لگے، تو بیوی نے کہا کہ یہ الائچی کھا کر اور میرا نیا بُنا ہوا سویٹر پہن کر کہاں چلے؟ یہ سویٹر تو میں نے خاص دعوتوں میں شرکت کرنے کے لیے بُنا ہے۔ یہ سویٹر اُتارو اور اپنا پرانا کوٹ پہن کر لڑکیوں کے ہاسٹل کی چوکیداری کے لیے جاؤ۔

اپنی پی ایچ ڈی کے دوران میں نے اپنا خرچ پورا کرنے کے لیے دو اور جز وقتی ملازمتیں بھی کیں۔ ایک گرمیوں کے سمسٹر میں، میرے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ پروفیسر جیکب سن (Jacobson) ڈیپارٹمنٹ میں آئے، مجھ سے پوچھا، گرمیوں کے سمسٹر میں کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا شہر کے سب آرکیٹکس کے دفاتر میں ڈرافٹسمین کی آسامی کے لیے درخواست بھیج رہا ہوں۔ پروفیسر جیکب سن نے کہا تم کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس مشی گن (Michigan) سٹیٹ کے ساحل پر ایک شہر ملگین میں ایک کنسلٹنگ جاب ہے، تم میرے ریسرچ اسسٹنٹ ہو جاؤ۔ وہ گرمیاں میری پروفیسر جیکب سن کے ساتھ وسکونسن اور مشی گن کے درمیان کبھی ہوائی جہاز میں کبھی پانی کے جہاز میں مشی گن جھیل کو پار کرنے میں گزریں۔ مشی گن جھیل اتنی وسیع وعریض ہے کہ اس پر سمندر کا شبہ ہوتا ہے۔ پانی کے جہاز سے اسے عبور کرنے میں کئی گھنٹے لگتے تھے۔ ایک دن پروفیسر جیکب سن نے مجھ سے کہا ''کیا تم اتوار کو صبح سات بجے میرے گھر پر آسکتے ہو؟'' ظاہر ہے میرا جواب اثبات میں ہی ہو سکتا تھا۔ اتوار کی صبح ٹھیک سات بجے میں پروفیسر جیکب سن کے گھر پہنچ گیا۔ پروفیسر جیکب سن کے بیٹے نے دروازہ کھولا

اور بتایا کہ والد ابھی ناشتہ کر رہے ہیں۔ آپ اندر آ کر عقبی برآمدہ میں بیٹھیے اور آپ کافی پئیں گے؟ میں نے کہا ہاں اور اُس نے کافی بنا کر میرے پاس ایک چھوٹی تپائی پر رکھ دی۔ پروفیسر جیکب سن کے عقبی برآمدے کے سامنے کا لان بے حد خوبصورت تھا۔ اس کی لینڈ سکیپنگ ان کے نفیس ذوق کا پتہ دیتی تھی۔ میں کافی پیتے ہوئے ان کے عقبی برآمدے کے خوش نما منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پروفیسر جیکب سن ناشتہ کے بعد آئے۔ دیر سے آنے کی معذرت کی۔ میں نے کہا میں تو آپ کے عقبی برآمدے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ بہت خوبصورت ہے، بالکل آپ کی شخصیت کے عقبی صحن کی طرح! یہ سن کر پروفیسر جیکب سن نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ اُن کی آنکھیں بڑی ہو کر چھوٹی ہو گئیں۔ وہ واقعی بہت سخت گیر تھے، لیکن اندر سے بے حد نرم دل تھے۔ اِتنے سخت گیر تھے کہ جب وہ اِس دنیا سے گئے تو سینگوگ (Synagogue) میں اُن کی آخری رسومات میں اُن کے بیوی، بچوں نے شرکت نہیں کی۔

میری پی ایچ ڈی کے آخری سمسٹر میں میرے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا صرف بشریٰ بے بی سٹنگ کر رہی تھی۔ یہ پریشانی پروفیسر وید پرکاش نے مجھے یونیورسٹی میں جز وقتی لیکچرار تعینات کروا کر دور کر دی۔

1975ء میں پی ایچ ڈی کے لوازمات پورے کرنے کے بعد میں نے یونیورسٹی آف وسکونسن کے گرین بے کیمپس میں اسسٹنٹ پروفیسر کی آسامی کے لیے درخواست دی۔ مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ یہ امریکا میں میرا کسی نوکری کے لیے پہلا انٹرویو تھا۔ امریکا کی ملازمت کے لیے انٹرویوز پاکستان کی پبلک سروس کمیشن کے انٹرویوز سے بے حد مختلف ہوتے ہیں۔ پاکستان میں آٹھ، دس ماہرین ایک امیدوار پر انٹرویو میں چاروں طرف سے سوالوں کی بوچھار کر دیتے

ہیں۔ بیچارہ امیدوار خاصا گھبرا جاتا ہے اور دس پندرہ منٹ کے انٹرویو کے بعد ممبران، امیدوار کی اہلیت اور نااہلی کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ امریکا میں امیدوار کو آنے جانے کا کرایہ ادا کیا جاتا ہے۔ انٹرویو دو، تین دن چلتا ہے۔ شہر کے باہر سے آئے ہوئے امیدواروں کا ہوٹل میں رہنے کا خرچہ بھی انٹرویو کرنے والی ایجنسی ادا کرتی ہے۔

میرے معاملہ میں یونیورسٹی نے کیونکہ دو، تین امیدواروں کو بلایا تھا، اس لیے ہر ایک کو ایک، ایک روز کے انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ میرا انٹرویو صبح شروع ہوا اور اتنے دوستانہ انداز میں ہوا کہ مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میرا انٹرویو ہو رہا ہے۔ چائے ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین کے ساتھ پی۔ پھر طالب علموں کی ایک جماعت مجھ سے گپ مارنے کے لیے آ گئی۔ دوپہر کا کھانا ڈین کے ساتھ کھایا۔ پھر مختلف پروفیسرز فرداً فرداً مجھ سے ملے اور بہت دوستانہ انداز میں بات چیت ہوئی۔ شام کو چیئرمین مجھے میری کار تک چھوڑنے آئے اور مجھے بتایا کہ ہم نے کچھ اور اُمیدواروں کو بھی انٹرویو کے لیے بلایا ہوا ہے۔ آپ سے عنقریب رابطہ کریں گے۔ واپس آ کر دوسرے دن جب میں اپنی یونیورسٹی میں آیا، تو پروفیسر وید پرکاش نے مجھے بتایا کہ تمہیں بطور اسسٹنٹ پروفیسر منتخب کر لیا گیا ہے۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ ابھی تو کچھ امیدواروں کے انٹرویوز باقی ہیں۔ پروفیسر وید پرکاش نے بتایا کہ تمہارے انٹرویو کے بعد یونیورسٹی کے عہدیداروں نے فیصلہ کیا کہ اب مزید اُمیدواروں کے انٹرویوز کی ضرورت نہیں رہی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے لیے وید پرکاش کے زبردست سفارشی خط کے باعث میرے انتخاب کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

میرے حصولِ روزگار کا تیسرا دور 1975ء میں یونیورسٹی آف وسکونسن گرین ہے۔ کیمپس میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر شروع ہوا۔ ویسے پنجاب ٹاؤن پلاننگ ڈیپارٹمنٹ سے میرا تعلق برائے نام قائم رہا، کیونکہ میں پانچ سال کے لیے بغیر تنخواہ کی چھٹی برائے بیرونِ پاکستان (Leave Ex-Pakistan) پر تھا۔

میرا تیسرا حصولِ روزگار کا دور مالی اعتبار سے کافی منفعت بخش رہا۔ طالب علمی کی تنگ دستی کے بعد مجھے مالی طور پر فراغت کا احساس ہوا۔ مجھے اور بشریٰ کو امیگریشن کی طرف سے گرین کارڈ پر کام کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ شروع میں بشریٰ کا تقرر یونیورسٹی کے ایک پروجیکٹ میں بطور لیکچرار کے ہو گیا اور بعد ازاں انہیں وسکونسن کے سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ میں ڈائریکٹر پلاننگ کی آسامی پر منتخب کر لیا گیا۔ ان کی ریسرچ رپورٹ ''وسکونسن میں بچوں کے ساتھ زیادتی اور نظر اندازی'' (Child abuse and neglect in Wisconsin) کو بہت پذیرائی ملی تھی اور سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ نے اسے بطور اپنی محکمانہ رپورٹ کے شائع کرایا تھا۔ اس رپورٹ کی ایک اہم دریافت یہ تھی کہ وسکونسن کے جن علاقوں میں یہ سروے کیا گیا تھا، ان میں بچوں کی قدرتی اموات سے زیادہ اموات، بچوں کے ساتھ زیادتی اور ان کی نظر اندازی کے باعث ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ کنبوں میں ناچاقی (broken families) اور شراب کی لت (drunkardness) تھی۔

یہ دور تعلیمی اعتبار سے بھی مفید رہا۔ میں نے اپنے لیکچرز بڑی محنت سے تیار کیے اور کئی کمیونٹی پروجیکٹس کا آغاز بھی کیا جن کو عمومی طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

ایک دن یونیورسٹی کے میرے دفتر میں بوب داخل ہوئے۔ یہ میرے لیے بڑی خوش گوار حیرت تھی۔ امریکا میں یہ میرے پہلے افسر تھے۔ ان کی پرانی سائیکل میرے گھر سے یونیورسٹی جانے اور آنے کے بہت کام آئی تھی۔ اُنھوں نے کہا

گرین بے آیا ہوا تھا، سوچا تم سے ملتا چلوں۔ میں نے بشریٰ کو ٹیلی فون کیا کہ میرے رات کی چوکیداری کے زمانہ کے افسر مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں، یہ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔

میرا گرین بے کا قیام بے حد تسلی بخش رہا۔ یہاں کی گرمی خوش گوار اور سردی بے حد شدید ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کی سب عمارتیں آپس میں زیرِ زمین سرنگوں کے ذریعے ملی ہوئی تھیں۔ یہ سرنگیں کافی چوڑی چکلی تھیں۔ ہر موڑ پر باہر سے مٹی کھود کر لینڈ سکیپنگ کی ہوئی تھی اور سرنگوں میں بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیوں سے گرمیوں میں سرسبز منظر بہت دل فریب لگتا تھا اور سردیوں میں دھوپ میں چمکتی ہوئی سفید برف کا نظارہ، گرم سرنگ میں آنکھوں کی ٹھنڈک کا سبب بنتا تھا۔ سرنگ میں بیٹھنے کے لیے جگہ جگہ بینچ رکھے ہوئے تھے۔ سرنگوں کی دیواروں پر بہت خوبصورت پینٹنگز بنائی ہوئی تھیں۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ اِن سرنگوں میں چلنے سے چہل قدمی کا لطف آتا تھا۔ یونیورسٹی کی کسی عمارت سے باہر نکلو، تو شدید کاٹنے والی سردی سے پالا پڑتا تھا۔ ناک کو ہاتھ لگا لگا کر محسوس کرنا پڑتا تھا کہ ناک قائم ہے یا جھڑ گئی ہے۔ میرے بچوں کا سکول میرے گھر کے قریب ہی واقع تھا۔ میرا بیٹا مونس سڑک پر چل کر گھر آنے کی بجائے چرچ کے لان میں برف پر قلابازیاں کھاتا ہوا گھر آیا کرتا تھا۔

یونیورسٹی کے پروفیسرز کی تنخواہوں میں سالانہ اضافہ میں شفافیت قابلِ داد تھی۔ اِس کی مثال میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یونیورسٹی ہر محکمہ کو آئندہ سال کے بجٹ میں رکھے ہوئے تنخواہوں کے اضافہ کی رقم کی اطلاع کر دیتی تھی۔ اس یکمشت رقم کو آپس میں بانٹنے کا کام ہر محکمہ پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب یہ اطلاع میرے ڈیپارٹمنٹ میں موصول ہوئی، تو چیئرمین نے سب پروفیسروں کی میٹنگ منعقد کی اور کہا یہ رقم ہم کو آپس میں بانٹنی ہے۔ ایسا کرتے ہیں

کہ کیونکہ پچھلے سال کی نسبت اس سال مہنگائی سات فی صد بڑھی ہے، اِس لیے سب کی تنخواہوں میں سات فی صد اضافہ کر لیتے ہیں اور باقی رقم کو چار معائیر کی بنیاد پر آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ پہلا معیار تو یہ ہوگا کہ طلبہ کی ہر پروفیسر کی گریڈنگ کیا ہے۔ دوسرا معیار یہ ہوگا کہ کس نے معیاری رسالوں (Referred Journals) میں کتنے تحقیقی مضامین شائع کیے ہیں۔ تیسرا معیار یہ کہ کمیونٹی کی بھلائی کے لیے کس نے کتنے پروجیکٹس میں شراکت کی ہے اور چوتھا معیار یہ ہوگا کہ مختلف محکمانہ کمیٹیوں میں کتنی دلچسپی سے حصہ لیا ہے۔ اِن چاروں معائیر کے نمبروں کو جمع کردہ نمبر کے مطابق باقی رقم پروفیسروں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ اِس میٹنگ میں ہر پروفیسر کا نامۂ اعمال تیار کیا گیا اور جب ہم اِس میٹنگ کے بعد کمرے سے باہر نکلے، تو ہر ایک کو معلوم تھا کہ اگلے سال کے لیے اس کی تنخواہ میں کتنے ڈالرز کا ماہانہ اضافہ کیا جائے گا۔

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون ''آئی سی ایس'' میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے:

''ایک کالا انگریز کسی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اُس کے والد کمرے میں بے تکلفانہ چلے آئے۔ اُن کی دیہاتی وضع قطع ایسی تھی کہ صاحب بہادر کو اپنے دوست کے سامنے اُنھیں اپنا والد بتاتے ہوئے شرم آئی، لہٰذا یہ کہہ کر تعارف کرایا۔ یہ میرے والد کے ایک دوست ہیں۔''

والد محترم کو غصہ آ گیا۔ اُنھوں نے بیٹے کے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں ان کے والد کا نہیں، والدہ کا دوست ہوں۔''

☆☆☆

مزاح

مخلوقِ خدا اور ہم

چرند پرند اور انسانوں کے مابین تعلق اور خصلتوں کو مزاح کے پیرائے میں بیان کرتی قہقہہ بار تحریر

شفیق الرحمٰن

سریلا کوّا:

کوّا گرائمر میں ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔ یہ صبح صبح مُوڈ خراب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ویسے تو مُوڈ کوّے کے بغیر بھی کوئی خاص اچھا نہیں ہوتا۔ علی الصبح کوّے کا شور انسان کو مذہب کے قریب لاتا ہے اور نروان کی خواہش شدت سے پیدا ہوتی ہے۔

کوّا گا نہیں سکتا اور کوشش بھی نہیں کرتا۔ وہ کائیں کائیں کرتا ہے۔ کائیں کے کیا معنے ہیں؟ میرے خیال میں تو اس کا کوئی مطلب نہیں۔

کوّے کالے ہوتے ہیں۔ برفانی علاقوں میں سفید یا سفیدی مائل کوّا نہیں پایا جاتا۔ کوّا سیاہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے۔

پہاڑی کوّا ڈیڑھ فٹ لمبا اور وزنی ہوتا ہے۔ میدان کے باشندے اس سے کہیں چھوٹے اور مختصر کوّے پر قانع ہیں۔ کوّے خوبصورت نہیں ہوتے لیکن پہاڑی کوّا تو باقاعدہ بدنما ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ معمولی کوّے سے حجم میں زیادہ ہوتا ہے۔

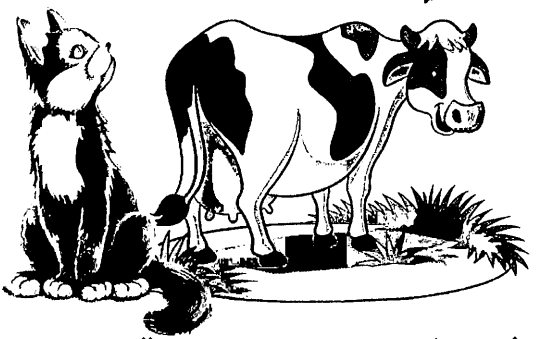

کوّے کا بچپن گھونسلے میں گزرتا ہے جہاں اہم واقعات کی خبریں ذرا دیر سے پہنچتی ہیں۔ اگر وہ سیانا ہو تو بقیہ عمر وہیں گزار دے لیکن سوشل بننے کی تمنا اُسے آبادی میں کھینچ لاتی

ہے۔ جو کوّا ایک مرتبہ شہر میں آ جائے وہ ہرگز پہلا سا نہیں رہتا۔

کوّے کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ جن چیزوں کو کوّا نہیں دیکھتا وہ دراصل اس قابل نہیں ہوتیں کہ انھیں دیکھا جائے۔ کوّا بے چین رہتا ہے اور جگہ جگہ اُڑ کر جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے۔ چنانچہ وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ کون نہیں چاہتا؟

کبھی کبھی کوّے ایک دوسرے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

دراصل ایک کوّا دوسرے کو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس سے ہم دیکھتے ہیں۔ دوسرے پرندوں کی طرح کوّوں کے جوڑے کو کبھی چہلیں کرتے نہیں دیکھا گیا۔ کوّا کبھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا..... یا کرتا ہے؟ کوّے کو لوگ ہمیشہ غلط سمجھتے ہیں۔ سیاہ رنگ کی وجہ سے اسے پسند نہیں کیا جاتا۔ لوگ تو بس ظاہری رنگ رُوپ پر جاتے ہیں۔ باطنی خو بُو اور کردار کوئی نہیں دیکھتا۔ کوّا کوئی جان بُوجھ کر تو سیاہ نہیں ہوا۔ لوگ چڑیوں، مُرغیوں اور کبوتروں کو دانہ ڈالتے وقت کوّوں کو بھگا دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح نہ صرف اُن کے لاشعور میں کئی ناخوشگوار باتیں بیٹھ جاتیں بلکہ اُن کی ذہنی نشوونما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ آخر کوّوں کے بھی تو حقوق ہیں۔

کوّا باورچی خانے کے پاس بہت مُسرور رہتا ہے۔ ہر لحظے کے بعد کچھ اُٹھا کر کسی اور کے لیے کہیں پھینک آتا ہے اور پھر درخت پر بیٹھ کر سوچتا ہے کہ زندگی کتنی حسین ہے۔

کہیں بندوق چلے تو کوّے اسے اپنی ذاتی توہین سمجھتے ہیں اور دفعتاً لاکھوں کی تعداد میں کہیں سے آ جاتے ہیں۔ اس قدر شور مچتا ہے کہ بندوق چلانے والا مہینوں پچھتاتا رہتا ہے۔

بارش ہوتی ہے تو کوّے نہاتے ہیں لیکن حفظانِ صحت کے اُصولوں کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔

کوّا سوچ بچار کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ زیادہ فکر کرنا اعصابی بنا دیتا ہے۔ کوّے سے ہم کئی سبق سیکھ سکتے ہیں۔

یہ بڑی سنجیدگی سے اُڑتا ہے، بالکل چونچ کی سیدھ میں۔ کوّے اُڑ رہے ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شرط لگا کر اُڑ رہے ہیں۔ یہ فکرِ معاش میں دُور دُور نکل جاتے ہیں لیکن کبھی کھو نہیں جاتے۔ شام کے وقت کوئی دس ہزار کوّا کہیں سے واپس آ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی اور کوّے ہوں۔

کوّا اتنا غیر رومانی نہیں جتنا میں اور آپ اسے سمجھتے ہیں۔ شاعروں نے اکثر کوّے کو مخاطب کیا ہے۔ ''کاگا لے جا ہمارو سندیس''، ''کاگا رے جا رے جا رے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ہمیشہ کوّے کو کہیں دُور جانے کے لیے کہا گیا ہے۔ کسی نے بھول کر بھی خوش آمدید نہیں کہا۔ بلکہ ایک شاعر تو یہاں تک کہہ گیا کہ..... ''کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس.....'' یہاں میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ جانیں اور آپ کا کاگا۔

اگر آپ کوّوں سے نالاں ہیں تو یہ مت بھولیے کہ کوّے بھی آپ سے نالاں ہے۔

بُلبل

بُلبل ایک روایتی پرندہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے سوائے وہاں کے جہاں اسے ہونا چاہیے۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ نے چڑیا گھر میں یا باہر بُلبل دیکھی ہے تو یقیناً کچھ اور دیکھ لیا ہے۔ ہم ہر خوش گلو پرندے کو بُلبل سمجھتے ہیں۔ قصور ہمارا نہیں ہمارے ادب کا ہے۔

شاعروں نے بُلبل دیکھا نہ اُسے سُنا ہے۔ کیونکہ اصل بُلبل اس ملک میں نہیں پائی جاتی۔ سُنا ہے کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں کہیں کہیں بُلبل ملتی ہے لیکن کوہ ہمالیہ کے دامن میں شاعر نہیں پائے جاتے۔

عموماً SONNET وہ نظم ہوتی ہے جسے محض بُلبل کے لیے لکھا گیا ہو..... خوش قسمتی سے بُلبل اَن پڑھ ہے۔

عام طور پر بُلبل کو آہ وزاری کی دعوت دی جاتی ہے اور رونے پیٹنے کے لیے اُکسایا جاتا ہے۔ بُلبل کو ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔ ویسے بُلبل ہونا کافی مضحکہ خیز ہوتا ہوگا۔

بُلبل اور گلاب کے پھول کی افواہ کسی شاعر نے اُڑائی تھی جس نے رات گئے گلاب کی ٹہنی پر بُلبل کو نالہ وشیون کرتے دیکھا تھا۔ کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ پرندہ بلبل ہے اور وہ چیز نالہ وشیون..... دراصل رات کو عینک کے بغیر کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔

بُلبل پروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے۔ یعنی اگر پروں کو نکال دیا جائے تو کچھ زیادہ بُلبل نہیں بچتی۔

بُلبل کی ذاتی زندگی کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ بلبل رات کو کیوں گاتی ہے؟ پرندے جب رات کو گائیں تو ضرور کچھ مطلب ہوتا ہے۔ وہ اتنی رات گئے باغ میں اکیلی کیوں جاتی ہے؟ بلبل کو چہچہاتے سن کر دُور کہیں ایک اور بلبل چہچہانے لگتی ہے۔ پھر کوئی بلبل نہیں چہچہاتی۔ وغیرہ..... ہمارے ملک میں تو لوگ بس سیکنڈل بنانا چاہتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر کسی چیز کا یقین نہیں کرنا چاہیے۔

کبھی کبھی بلبل غلطیاں کرتی ہے لیکن اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتی۔ چنانچہ پھر غلطیاں کرتی ہے..... سیاست میں تو یہ عام ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ بلبل کے گانے کی وجہ اس کی غمگین خانگی زندگی ہے جس کی وجہ یہ ہر وقت گاتا ہے۔ دراصل بلبل ہمیں محظوظ کرنے کے لیے ہرگز نہیں گاتی۔ اُسے اپنے فکر ہی نہیں چھوڑتی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بلبل گاتے وقت بُل، بُل، بُل کی سی آوازیں نکالتی ہے..... یہ غلط ہے۔

بُلبل پکے راگ گاتی ہے یا کچے؟

بہرحال اس سلسلے میں وہ بہت سے موسیقاروں سے بہتر ہے۔ ایک تو وہ گھنٹے بھر کا الاپ نہیں لیتی۔ بے سری ہو جائے تو بہانے نہیں کرتی کہ ساز والے نکمے ہیں، آج گلا خراب ہے۔ آپ تنگ آ جائیں تو اُسے خاموش کرا سکتے ہیں..... اور کیا چاہیے؟

جہاں تیتر..... 'سُبحان تیری قدرت'؛ 'پپیہا.....' 'پی کہاں' اور 'گیدڑ پدرم سلطان بود' کہتا ہوا سنا گیا ہے۔ وہاں بلبل کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ یوں معلوم ہوا ہے جیسے کسی مصرعے کے ایک حصے پر اٹک گئی ہو۔ مثلاً..... مانا کہ ہم سے جورو جفا، جورو جفا، جورو جفا..... یا تعریف اُس خدا کی، خدا کی، خدا کی..... اور دلے بفر وختم، بفر وختم، بفر وختم..... شاید اسی میں آرٹ ہو۔

ہوسکتا ہے کہ ہماری توقعات زیادہ ہوں لیکن یہ گانے کا ریکٹ اس نے خود شروع کیا تھا۔ بُلبل کو شروع شروع میں قبول صورتی، گانے بجانے کے شوق اور نفاست پسندی نے بڑی شہرت پہنچائی کیونکہ یہ خصوصیات دوسرے پرندوں میں یکجا نہیں ملتیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی نوعیت جاتی رہی اور لوگوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُدھر بلبل پر نئی نئی تحریکوں اور جدید قدروں کا اتنا سا بھی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ اب بلبل سو فیصدی رجعت پسند ہے۔ کچھ لوگ اس زمانے میں بھی بلبل کے نغموں، چاندنی راتوں اور پھولوں کے شائق ہیں۔ یہ لوگ حالات حاضرہ اور جدید مسائل سے بے خبر ہیں اور سماج کے مفید رُکن ہرگز نہیں بن سکتے۔ وقت ثابت کر دے گا کہ..... وغیرہ وغیرہ۔

جیسے گرمیوں میں لوگ پہاڑ پر چلے جاتے ہیں اسی طرح پرندے بھی موسم کے لحاظ سے نقل وطن کرتے ہیں۔ بلبل کبھی سفر نہیں کرتی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی سے وہاں ہے

جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔
ہمارے ادب کو دیکھتے ہوئے بھی بلبل نے اگر اس ملک کا رُخ کیا تو نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

اُلّو

اُلو بردبار اور دانشمند ہے، لیکن پھر بھی اُلّو ہے۔
وہ کھنڈروں میں رہتا ہے لیکن کھنڈر بننے کی وجوہات کچھ اور ہوتی ہیں۔ اُلو کا ذکر پرانے بادشاہوں نے اپنے روزنامچوں میں اکثر کیا ہے لیکن اس سے اُلو کی پوزیشن بہتر نہیں ہوسکی۔

اُلو کی بیس بائیس قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں پانچ چھے قسمیں کافی ہوتیں۔ ویسے اُلوؤں کی عادتیں آپس میں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ ایک اُلو کو دیکھ لینا تمام اُلو دیکھ لینے کے مترادف ہے۔
اُلو کو وہی پسند کرسکتا ہے جو فطرت کا ضرورت سے زیادہ مداح ہو۔ روزمرہ کے اُلو کو بوم کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑے کو چغد۔ چُغد سے بڑا اُلو ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔
پالتو اُلّو وہ لوگ رکھتے ہیں جو اس قسم کی چیزوں کو پالنے کے عادی ہوں۔ اُلّو کی شکل وصورت میں اصلاح کی بہت گنجائش ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک اُلو دوسرے اُلو کو کیونکر بھاجاتا ہے۔

دن بھر اُلّو آرام کرتا ہے اور رات بھر ہو ہو کرتا ہے۔ اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟...... میرا قیاس اتنا ہی صحیح ہو سکتا ہے جتنا کہ آپ کا......! لوگوں کا خیال ہے کہ اُلّو تو ہی تو کا وظیفہ پڑھتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ ان خود پسندوں سے ہزار درجہ بہتر ہے جو ہر وقت میں ہی میں کا ورد کرتے رہتے ہیں۔
شوخ اور باتونی پرندوں میں اُلو کا مرتبہ بہت بلند ہے کیونکہ وہ چپ چاپ رہتا ہے، اور غالباً حسِ مزاح سے محروم ہے۔ بہت سے لوگ محض اس لیے ذی فہم سمجھے جاتے ہیں کہ وہ کبھی نہیں مسکراتے۔
اُلّو یہ انتظار نہیں کرتے کہ کوئی اُن کا تعارف کروائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یوں بے تکلف ہو جاتے ہیں جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ شریک حیات منتخب کرتے وقت اُلّو طبیعت، شکل وصورت اور خاندان کا خیال نہیں رکھتے۔ تبھی وہ صدیوں سے ویسے کے ویسے ہیں۔
مادہ ننھے اُلّوؤں کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے مگر جونہی وہ ذرا بڑے ہوئے اور ان کی شکل اپنے ابا سے ملنے لگتی ہے انھیں باہر نکال دیتی ہے۔
اُلّو کو اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب بے سود ہے۔
اُلّو دوسرے پرندوں سے میل جول کو اچھا نہیں سمجھتا۔ وہ اپنا وقت اور زیادہ اُلّو بننے میں صرف کرتا ہے۔ ''آپ کا کام سوم ہا کام''......اُلّو کا مقولہ ہے۔
اُلّو کا محبوب مشغلہ رات بھر بھیانک آوازیں نکال کر پبلک کو ڈرانا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پبلک کیا چاہتی ہے۔ ہمارے ملک کی مثالی توہم پرستی میں اُلّو نے قابلِ تقلید حصہ لیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی ناکامیوں کا سبب اس غریب اُلّو کو بتاتے ہیں جو مکان کے پچھواڑے درخت پر رہتا ہے۔ اُلّو کی نحوست ہوتی ہے مگر اتنی نہیں۔
اُلّو اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اچھے تو وہ ہوتے ہیں جو دُور جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اُلّوؤں کو بُرا بھلا کہتے وقت یہ مت بھولیے کہ انھوں نے اُلّو بننے کی التجا تھوڑا ہی کی تھی۔

ماہرین غور کرتے رہتے ہیں کہ اُلّو ہمیشہ تنہا کیوں نکلتا ہے؟ اُلّووں کا جوڑا باہر کیوں نہیں نکلتا؟ ماہرین کو یہ بھی ڈر ہے کہ اُلّو دن بدن کم ہوتے جارہے ہیں، کہیں نایاب نہ ہو

جائیں۔ اُنھیں فکر نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی چیزیں کبھی نہیں مٹتیں، یہ ہمیشہ رہنے کے لیے آئی ہیں۔

ویسے اُلّوؤں کے بغیر بھی گزارا ہوسکتا ہے۔ مگر وہ بات نہیں رہے گی۔ اُلّو آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے تو اس کی نیت آپ کو پریشان کرنے کی نہیں ہوگی۔ آپ بھی تو اسے گھور رہے ہیں۔ ذرا سی دیر میں وہ زبان ہلائے بغیر آپ کو اپنا ہم خیال بنا لے گا..... اسے HYPNOTISM کہتے ہیں۔

اُلّو کی تلاش میں آپ کو زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔ اُلّو آپ کے قیاس سے کہیں قریب ہے۔ انسان کو ناشکرا نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا میں اُلّو سے زیادہ بُری چیزیں بھی ہیں..... دو اُلّو یا تین اُلّو!

اُلّو اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر قدرت ایک مرتبہ کچھ ٹھان لے تو اُسے پورا کر کے رہتی ہے۔

اس ساری لے دے کے باوجود اُلّو کی زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتی ہے۔

بھینس

بھینس موٹی اور خوش طبع ہوتی ہے۔

بھینسوں کی قسمیں نہیں ہوتیں۔ وہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بھینس کا وجود بہت سے انسانوں کے لیے باعث مسرت ہے۔ ایسے انسانوں کی زندگی میں بھینس کے علاوہ مسرتیں بس گنی گنائی ہوتی ہیں۔

بھینس کا ہم عصر چوپایہ گائے دنیا بھر میں موجود ہے لیکن بھینس کا فخر صرف ہمیں ہی نصیب ہے۔ تبت میں گائے کے وزن پر سراگائے ملتی ہے۔ سرا بھینس کہیں نہیں ہوتی۔

جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ افریقہ میں بھینس سے ملتی جلتی کوئی چیز BISON ہوتی ہے۔ مگر وہ دودھ نہیں دیتی۔ جغرافیہ دان اتنا نہیں سمجھتے کہ جو چیز دودھ نہ دے بھلا وہ بھینس جیسی کیونکر ہوسکتی ہے۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بھینس اتنی ہی بے وقوف ہے جتنی دکھائی دیتی ہے یا اُس سے زیادہ۔ کیا بھینسیں ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں؟ غالباً نہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے مگر اتنی اندھی نہیں۔

بھینس کے بچے شکل وصورت میں تھیال اور ددھیال دونوں پر جاتے ہیں۔ لہٰذا فریقین ایک دوسرے پر تنقید نہیں کرسکتے۔

بھینس سے ہماری محبت بہت پرانی ہے۔ یہ ہمارے بغیر رہ لے لیکن ہم بھینس کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتے۔ آج کل یہ شکایت عام ہے کہ لوگوں کو ٹھنڈی ملتی ہے تو ایسی جس میں گیراج تک نہیں ہوتا جہاں بھینس باندھی جاسکے۔

کئی بھینسیں اتنی بھدی نہیں ہوتیں، مگر کچھ ہوتی ہی ہیں۔ دور سے یہ پتا چلانا مشکل ہوجاتا ہے کہ بھینس ادھر آرہی ہے یا اُس طرف جارہی ہے۔

بھینس اگر ورزش کرتی اور غذا کا خیال رکھتی تو شاید چھریری ہوسکتی تھی لیکن کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ بعض لوگ مکمل احتیاط کرنے پر بھی موٹے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

بھینس کا مشغلہ جگالی کرنا ہے یا تالاب میں لیٹے رہنا۔ وہ اکثر نیم باز آنکھوں سے اُفق کو تکتی رہتی ہے۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے ہیں کہ وہ کیا سوچتی ہے؟ وہ کچھ بھی نہیں سوچتی۔ اگر بھینس سوچ سکتی تو رونا کس بات کا تھا۔

ڈارون کی تھیوری کے مطابق صدیوں سے ہر جانور اسی کوشش میں ہے کہ اپنے آپ کو بہتر بنا سکے۔ یہاں تک کہ بندر انسان بن گئے۔ بھینس نے محض سستی کی وجہ سے اس تگ ودو میں حصہ نہیں لیا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ارتقائی دور ختم ہو چکا کیونکہ انسان بالکل نہیں سدھر رہا۔ بھینس یہ سب نہ جانتی ہے نہ جاننا چاہتی ہے۔ اگر ماہرین اُسے نقشوں اور تصویروں

کی مدد سے سمجھانا چاہیں تب بھی بے سود ہو گا۔

بھینس کا حافظہ کمزور ہے۔ اُسے کل کی بات آج یاد نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے وہ انسان سے زیادہ خوش نصیب ہے۔

اگر بھینس کی کمر میں پتھر یا لٹھ آ لگے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی۔ ذرا سی کھال ہلا دیتی ہے بس!...... اسے فلسفۂ عدم تشدد کہتے ہیں۔

بھینسے کو بالکل نکما سمجھا جاتا ہے۔ اسے ہل میں جوتنے کی سکیم ناکامیاب ثابت ہوئی کیونکہ وہ دائمی طور پر تھکا ہوا اور ازلی سست ہے...... اُس نے بچپن میں بھینس کا دودھ پیا تھا۔

کبھی کبھی بھینسا چہرے کی جھریوں کو دیکھ کر چونک اُٹھتا ہے اور سینگ کٹا کر کٹڑوں میں شامل ہو جاتا ہے لیکن یہ حرکت کون نہیں کرتا؟

بھینس کے سامنے بین بجائی جائے تو نتیجہ تسلی بخش نہیں نکلتا۔ بھینس کو بین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

کبھی کبھی مجھ پر موڈ آتے ہیں جب میں گائے بکری وغیرہ کو بھینس جیسا سمجھنے لگتا ہوں۔

خالہ بلی:

بلیاں سلطنت برطانیہ کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بلیوں پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔

بلیوں کی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ جو لوگ بلیوں کی قسمیں گنتے رہتے ہیں ان کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بلیاں پالنے والوں کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ بلی انھیں خواہ مخواہ چاہتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ بلی کے قیام و طعام کا بندوبست کرتے ہیں۔ کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔

بلیاں دو ہفتے کی عمر ہی میں ناز و انداز دکھانا شروع کر دیتی ہیں، بغیر کسی ٹریننگ کے۔ سنا ہے کہ کچھ بلیاں دوسری بلیوں سے خوبصورت ہوتی ہیں۔ بعض لوگ سیامی بلی کو حسین سمجھتے ہیں (ایسے لوگ کسی چیز کو بھی حسین سمجھنے لگیں گے)۔ انگورا کی بلی کی جسامت اور خدوخال کتے سے زیادہ ملتے ہیں۔ ویسے ایرانی بلی ایک اچھی آل راؤنڈر بلی کہی جا سکتی ہے۔

لیکن ایران میں ایرانی بلیوں پر غیر ملکی بلیوں کو ترجیح دی جاتی ہے...... سودیشی بدیشی کا سوال ہر جگہ ہے۔

ویسے ایرانی بلی بھی تماشا ہے۔ کبھی گربہ مسکین بن جاتی ہے اور کبھی ''نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود''...... شاید ایرانیوں نے اپنی بلی کو نہیں سمجھا...... یا شاید سمجھ لیا ہے۔

بلیاں میاؤں میاؤں کرتی ہیں۔ قنوطی بلی می ی ی آؤوں کہتی ہے تاکہ ہر ایک سن لے۔ جب بلی زیر لب بڑبڑانا شروع کر دے اور تنہائی میں دیر تک بڑبڑاتی رہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کے بہترین دن گزار چکی۔

گرمیوں میں بلیاں پنکھے کے نیچے سے نہیں ہلتیں۔ سردیوں میں بن ٹھن کر ربن بندھوا دھو سینکتی ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا مقصد یہی ہے۔ بلی کا بورژوا پن نوعمر لڑکے لڑکیوں کے لیے مہلک ہے۔ اُنھیں یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بلی کے لیے مفید ہے وہ سب کے لیے مفید ہوگا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ بلیاں اتنی مغرور اور خود غرض کیوں ہوتی ہیں؟ میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو محنت کیے بغیر ایسی مرغن غذا ملتی رہے جس میں پروٹین اور وٹامن ضرورت سے زیادہ ہوں تو آپ کا رویہ کیا ہوگا؟

بلی دوسرے کا نکتۂ نظر نہیں سمجھتی۔ اگر اسے بتایا جائے کہ ہم دنیا میں دوسروں کی مدد کرنے آئے ہیں تو اس کا پہلا سوال یہ ہوگا کہ دوسرے یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟

تقریباً سال بھر میں بلی سدھائی جا سکتی ہے مگر سال بھر کی مشقت کا نتیجہ صرف ایک سدھائی ہوئی بلی ہوگا۔ جہاں بقیہ چوپائے دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہیں

وہاں بلی دودھ پینے والے جانوروں سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر غلطی سے دودھ کھلا رہ جائے تو آپ کی سدھائی ہوئی بلی پی جائے گی۔ اگر دودھ کو بند کر کے قفل لگا دیا جائے تب بھی پی جائے گی۔ کیونکہ......؟ یہ ایک راز ہے جو بلیوں تک محدود ہے۔

شکی لوگ بلیوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ بلیاں کیا کریں؟ ان پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب انھیں خود پر اعتبار نہیں رہتا۔

بلی کو بلانے کے لیے پُوس پُوس پُوس، مانو مانو، پُسی پُسی جیسے مہمل اور غیر مہذب کلمات استعمال کیے جاتے ہیں اور بلی پھر بھی نہیں آتی۔ کبھی کوئی بلی خوامخواہ ساتھ ہو لیتی ہے، جہاں جاؤ پیچھا کرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر سوائے صبر و شکر کے اور کوئی چارہ نہیں۔

بلیاں پیار سے پنجے مارتی ہیں اور کبھی چند وجوہات کی بنا پر جنھیں پبلک نہیں سمجھتی کاٹ بھی لیتی ہیں...... شکر ہے کہ بلی کے کاٹے کا علاج آسان ہے۔ اس کا کاٹا پاگل نہیں ہوتا۔

بلیاں آپس میں لڑتی ہیں تو ناخنوں سے ایک دوسرے کا منہ نوچ لیتی ہیں اور مہینوں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتی رہتی ہیں۔

بلی اور کُتے کی رقابت مشہور ہے۔ بلی برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان کا کوئی وفادار دوست ہو۔ بلی میں برداشت بہر حال کم ہوتی ہے۔

کبھی کبھی بلیاں اپنی کمر کو خم دے کر بہت اونچا کر لیتی ہیں اور دیر تک کیے رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ تو وہی جانتی ہوں گی مگر وہ جو کچھ کرتی ہیں اکثر غلط ہوتا ہے...... ممکن ہے اس طرح وہ گیئر بدلتی ہوں۔

جب بلی چاند کی طرف دیکھ کر بُری طرح رونے لگے تو

روئے سخن آپ کی طرف یا میری طرف نہیں۔ یہ سب کسی اور بلی کے لیے ہے۔

چند بلیاں گھر میں سارے چوہوں کو ختم کر سکتی ہیں۔ چوہے تو دفع ہو جائیں گے...... مگر بلیاں رہ جائیں گی! بلیاں دن بھر میک اپ کرتی رہتی ہیں۔ اُن کی جلد پر طرح طرح کے ڈیزائن ہوتے ہیں۔ موٹی بلیاں اپنے جسم پر لمبائی میں یعنی عمودی سیدھی دھاریاں بنا لیں تو اُن کا مٹاپا چھپ سکتا ہے اور وہ چھریری اور کیوٹ معلوم ہوں گی۔

بلیاں دوپہر کو سو جاتی ہیں، وہ رات تک انتظار نہیں کر سکتیں۔ بعض اوقات بظاہر سوئی ہوئی بلی ادھر اُدھر دیکھ کر چپکے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اس سے باز پُرس کی جائے تو خفا ہو جاتی ہے۔ (بلی کی جگہ کوئی بھی ہو تو خفا ہو جائے گا)۔ ایک ہی گھر میں سالہا سال گزارنے کے باوجود انسان اور بلی اجنبی رہتے ہیں...... زندگی کتنی عجیب ہے۔

بلی سامنے سے گزر جائے تو لوگ خوشخبری کا انتظار کرتے ہیں۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے میں کسی کام جا رہا تھا اسی طرح بلی بھی کہیں جا رہی ہوگی۔

اندھیرے میں کالی بلی کا نظر آ جانا خوش قسمتی سمجھا جاتا ہے...... پتہ نہیں بد قسمتی کیا ہوتی ہوگی؟

خیر جو کچھ بھی ہو، ہم سب کی تقدیر میں بلی لکھی ہے۔ اپنی بلی سے بچنا محال ہے۔ کوئی دلیر ہو یا بزدل، عقل مند ہو یا احمق، کسی نہ کسی دن ایک بلی اسے آ لے گی۔

ویسے ایرانیوں کا اصول رہا ہے کہ گربہ کشتن روز اول۔ میں گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ میں بلیوں سے دُور رہتا تو بہتر ہوتا۔

◆◆◆

1947ء

دنیا کی سب سے بڑی نقل مکانی

تاریخ کا سب سے

ہولناک خون خرابہ

لازوال داستانیں بنتا چلا گیا

ہجرت کے ان مٹ نقوش

سفرِ یقین

فسانۂ ہجرت

پروفیسر ڈاکٹر محمد امتیاز رسول

جنوری 1947 کی صبح ایک ماہ کی چھٹی گزارنے کے بعد ولی داد اپنی نو بیاہتا بیوی سکینہ کو لے کر فتح گڑھ پہنچا۔ اس کا ہمسایہ اکرم استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ جب وہ گھر پہنچے تو اکرم کی بیوی زرینہ سکینہ سے یوں ملی جیسے دو گہری سہیلیاں عرصۂ دراز بعد ملی ہوں۔

زرینہ سارا دن اپنے بچے کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی۔ سکینہ کو فراغت ہی فراغت تھی۔ وہ ولی داد کے دفتر جانے کے بعد زرینہ کے پاس چلی جاتی اور ولی داد کے گھر لوٹنے تک وہیں رہتی۔ چند روز بعد اس کے جہیز کا سامان بھی پہنچ گیا۔ اس نے ایک کمرے کو اپنی خواب گاہ اور دوسرے کو مہمانوں کی آؤ بھگت کے لیے بیٹھک اور برآمدے کو چق سے بند کر کے ڈائننگ روم کی شکل دے دی۔

ایک دن سکینہ صحن میں بیٹھی سردیوں کی سنہری دھوپ میں کروشیئے سے اپنے دوپٹے پر پھول بوٹے بنانے میں مگن تھی کہ اُسے گھر کے دروازے کے باہر گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ جب آواز مسلسل آتی رہی تو زرینہ نے اپنے گھر کی دیوار پر کھڑے ہو کر آواز دی۔

''باجی! بھائی جان بہت دیر سے باہر کھڑے سائیکل کی گھنٹی بجا رہے ہیں''۔

''اچھا'' سکینہ نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

دروازہ کھلتے ہی ولی داد ہر کولیس سائیکل پر بیٹھا گھنٹی بجاتا اور ہونٹوں پر مُسکراہٹ سجائے گھر میں داخل ہوا۔

''یہ سائیکل میں نے تمہاری خاطر خریدی ہے تاکہ تمہیں شہر کی سیر کرواؤں''۔ ولی داد نے کہا۔

سکینہ خوشی سے نہال ہوگئی۔ وہ پہلی مرتبہ اپنے گاؤں سے دُور افتادہ جگہ پر آئی تھی اس لیے بعض اوقات اس کا دل اُداس ہو جاتا۔ ولی داد سکینہ کو ہر ممکن خوش رکھنے کی کوشش کرتا اور اس کا دل لبھانے کے طریقے ڈھونڈتا۔ اتوار یا چھٹی کے روز وہ دریائے گنگا کے گھاٹ پر چلے جاتے جو ان کی رہائش گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں خوب چہل پہل ہوتی۔ وہ کشتی کی سیر کا لطف اُٹھاتے۔

سردیوں کی طویل اور سرد راتوں کی جگہ بہار کی خوشگوار موسم نے لے لی۔ جس روز سکینہ نے ولی داد کو بتایا کہ ان کے آنگن میں ایک خوبصورت پھول کھلنے والا ہے، وہ خوشی سے سرشار ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی خوبصورت اور خوشگوار زندگی میں قوسِ قزح کے رنگ بھر گئے۔

3 جون 1947ء کو ولی داد گھر آیا تو بہت خوش تھا۔

''سکینہ مجھے اللہ پر کامل یقین تھا کہ ایک دن پاکستان قائم ہو کر رہے گا۔ آج ریڈیو پر اعلان ہوا کہ ہندوستان 15 اگست 1947 کو آزاد ہوگا اور دو علیحدہ ممالک بھارت اور پاکستان قائم ہو جائیں گے۔ ریڈیو سے قائداعظم کی تقریر نشر ہوئی ہے اور انھوں نے اپنی تقریر کے آخر میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا''۔ ولی داد کی خوشی دیدنی تھی۔

دن گزرتے گئے لیکن ولی داد نے پاکستان جانے کے بارے کوئی بات نہ کی۔ ایک دن سکینہ نے ولی داد سے

پوچھا۔ہم کب پاکستان جائیں گے؟''

''سکینہ تم تو جانتی ہو آج کل مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ اس چھاؤنی سے پاکستان کے حصے میں آنے والا سامان بھیجا جائے گا۔ اس کی فہرست تیار ہورہی ہے اور روزانہ ہی ٹرک روانہ کیے جارہے ہیں۔ اس لیے کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ میری کوشش ہے کہ 14 اگست سے پہلے تمام کام نمٹالوں۔ ولی داد نے کہا۔

ایک روز ولی داد دفتر سے گھر آیا تو پریشانی اس کے چہرے پر آویزاں تھی۔

''آج آپ کا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے؟''

سکینہ نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔ آزادی کی دستاویز میں یہ طے پایا ہے کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کے ساتھ الحاق کریں گے اور غیر مسلم اکثریت کے علاقے ہندوستان کے ساتھ۔ برطانوی حکومت نے ریڈکلف کی سربراہی میں باؤنڈری کمیشن بنایا ہے جس کا کام بنگال اور پنجاب میں اس اصول کے مطابق مرحد کا تعین کرنا ہے۔ اس کمیشن نے بے ایمانی اور دھوکا دہی کی انتہا کر دی ہے۔ پنجاب میں مسلم اکثریت کے علاقے گورداس پور اور فیروز پور بھارت کے حوالے کردیے ہیں۔ گورداس پور کو بھارت کے حوالے کرنے کا مقصد کشمیر کے لیے راستہ فراہم کرنا اور فیروز پور دینے کی وجہ وہاں پر موجود ہیڈ ورکس ہیں۔ جہاں سے پانی پاکستان کے حصے میں آئے ہوئے علاقوں کی زمینوں کو سیراب کرتا ہے۔

بھارت ان ہیڈ ورکس سے جب چاہے پاکستان کا پانی روک سکتا ہے۔ ریڈکلف کی اس غیر منصفانہ تقسیم سے پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات کا آتش فشاں پھوٹ پڑا ہے۔ جس سے نکلنے والی آگ نے ہر شے کو بھسم کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی شدت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ پنجاب میں سکھوں کی ریاستوں پٹیالہ، فرید کوٹ اور نابھہ کے حکمرانوں نے سکھوں کے جتھوں کو اسلحہ سے لیس کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان جتھوں کو سابق فوجی تربیت دے رہے ہیں۔ جن کا مقصد مسلمانوں کی لوٹ مار اور قتل و غارت ہے۔ سکھ پوری منصوبہ بندی اور تیاری کے ساتھ گورداس پور اور امرتسر کے مسلمانوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ ان کے سروں پر خون سوار ہے۔ وہ وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ عورتوں کی آبروریزی کی جارہی ہے۔ مال واسباب کی لوٹ مار جاری ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے اپنی جان اور آبرو بچانے کے لیے بے سروسامان پاکستان کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دی ہے۔ ولی داد نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''ولی داد چند ہی ماہ میں یہ کیا ہوگیا۔ تمہیں یاد ہے ہماری شادی کی تقریب میں گاؤں کے کئی سکھوں نے شرکت کی تھی۔ مہندی کی رات میری کئی سکھ سہیلیوں نے گیت گائے تھے۔ جہیز کے کپڑے سیئے اور ڈھولک بجائی تھی۔ ہمیں تو پتہ بھی نہیں تھا کہ کون سکھ ہے اور کون مسلمان؟ آپس میں اتنی محبت اور پیار تھا اور اب اتنی نفرت کیوں؟'' سکینہ نے سوال کیا۔

''سکینہ! ہندوؤں نے سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا ہے۔ اس لیے بابا فرید گنج شکر اور گرونانک کے پیروکار اور ایک خدا ماننے والے ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تل چکے۔ نفرت کی آگ نے لاکھوں دلوں کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ انسانیت اس آگ میں جل چکی ہے۔ اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل گیا ہے''۔ ولی داد یہ کہہ کر خاموش ہوگیا جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔

''کیا بات ہے؟ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔'' سکینہ نے اُسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''سکینہ تمہارا ان حالات میں یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

پاکستان کے حصے میں آنے والے سامان کو لے کر ٹرکوں کا ایک بڑا قافلہ کل لاہور جا رہا ہے جس کی حفاظت کے لیے پاکستانی فوج کا ایک دستہ ساتھ جائے گا۔ میرا اور اکرم کا خیال ہے کہ تم، زرینہ اور اس کا بیٹا اس قافلے کے ساتھ پاکستان چلے جاؤ'' ولی داد نے کہا۔

''میں آپ کے بغیر کبھی نہیں جاؤں گی آپ کو کیسے اکیلا چھوڑ دوں اور وہ بھی ان حالات میں جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں میں صبح شام آپ کی راہ تکتی رہوں گی۔ میں تو جیتے جی مر جاؤں گی''۔ سکینہ نے روہانسی ہو کر جواب دیا۔

''سکینہ سمجھنے کی کوشش کرو حالات بہت مخدوش ہیں۔ میرا یہاں ٹھہرنا بہت ضروری ہے اکرم اور میں نے رضا کارانہ طور پر یہ ذمہ داری لی ہے کہ ہم پاکستان کے حصے میں آنے والا باقی ماندہ سامان لے کر سب سے آخر میں جائیں گے۔'' ولی داد نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے بالکل پرواہ نہیں ہے میں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گی''۔ سکینہ نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''لیکن تم اس حالت میں۔۔۔۔'' ولی داد کے لہجے میں بہت تشویش تھی۔

''میری حالت بہت اچھی ہے آپ میری پروانہ کریں'' سکینہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اُدھر زرینہ نے بھی اپنے خاوند کے بغیر پاکستان جانے سے انکار کر دیا۔

اگست کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان کے حصے کا کچھ مزید سامان ٹرکوں کے ذریعے روانہ کر دیا گیا تھا۔ ولی داد کی ہر ممکن کوشش تھی کہ باقی ماندہ سامان لے کر 14 اگست سے پہلے پاکستان پہنچ جائے۔ 12 اگست کی رات وہ گھر واپس آیا تو اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار تھے۔ ''سکینہ اللہ کا شکر ہے کہ کام مکمل ہو گیا ہے رات کے آخری پہر ہم ٹرکوں کے آخری قافلے کے ساتھ روانہ ہوں گے اور ان شاء اللہ کل سورج غروب ہونے سے پہلے واہگہ بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہو جائیں گے۔'' ولی داد نے خوش دلی سے کہا۔

پرسوں 14 اگست ہے ہمارا پہلا یوم آزادی ہے اور ہم یہ دن ان شاء اللہ اپنے آزاد وطن میں منائیں گے لیکن ولی داد۔۔۔۔'' سکینہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''کیا بات ہے'' ولی داد نے فکر مند لہجے میں دریافت کیا۔

''ہمیں اپنے سامان کا تو خیال ہی نہیں رہا سارا سامان تو گھر میں بکھرا پڑا ہے'' سکینہ نے اداس لہجے میں کہا۔

''سکینہ اس سامان کی کسی ٹرک میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ پاکستان کے حصے کا سامان ہی بڑی مشکل سے آخری دو ٹرکوں میں سمایا ہے۔ تم فکر نہ کرو اللہ نے اتنا بڑا ملک دے دیا ہے پاکستان پہنچ کر نیا سامان بنا لیں گے'' ولی داد نے کہا۔ سکینہ کا دل بھر آیا اس نے کتنے چاؤ سے گھر کو جہیز کے سامان سے سجایا تھا۔

''ایک شے تو لے چلیں''۔ سکینہ نے کہا۔

وہ کیا؟ ولی داد نے پوچھا۔

بائیسکل ۔۔۔ جو آپ نے خصوصاً میرے لیے خریدی تھی۔ اس سائیکل پر ہم دونوں نے شہر کی کئی بار مٹر گشت کی ہے۔ بازار میں جا کر دہی بھلے اور گول گپے کھائے ہیں۔ دریائے گنگا کے کنارے ٹھنڈی ہوا کے مزے لیے ہیں۔ اس سائیکل کے ساتھ ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ سکینہ نے کہا۔

''مجھے تمہاری خواہش منظور ہے''۔ ولی داد نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

اگلے روز نماز فجر ادا کرنے کے بعد آزادی کا سفر شروع

ہوا۔ اگلے ٹرک میں اکرم اور اس کی فیملی سوار تھی۔ جبکہ پچھلے ٹرک میں ولی داد اور اس کی بیوی تھے۔ دونوں ٹرکوں میں ڈرائیور کے علاوہ ایک ایک فوجی جوان بھی ساتھ تھا۔

وہ جرنیلی سڑک پر محوِ سفر تھے۔ یہ سڑک شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی جو پشاور کو براستہ دلی بنگال سے ملاتی ہے۔

سہ پہر کے قریب جب وہ امرتسر کے قریب پہنچے تو ولی داد نے امرتسر سے گزرنے کے بجائے ایک ذیلی سڑک کا انتخاب کیا تاکہ سکھوں کے ممکنہ حملے سے بچا جا سکے۔ فضا میں ہر سُو خاموشی تھی۔ سڑک دُور دُور تک سنسان تھی۔ مون سون کے بادل چھائے ہوئے تھے اور کسی بھی لمحے بارش ہو سکتی تھی۔ حفاظتی اقدامات کے پیشِ نظر دونوں ٹرکوں کے درمیان ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ آگے ایک موڑ تھا جہاں سڑک 90 کا زاویہ بناتے ہوئے مُڑتی اور پھر واہگہ جانے والی سڑک سے مل جاتی۔ اگلا ٹرک موڑ کاٹ کر درختوں کے جھنڈ کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پچھلے ٹرک نے ایک ہچکی لی اور ایک جھٹکے سے رک گیا۔

''صاحب یہ پرانا فوجی ٹرک ہے جو شاید جنگ عظیم اوّل میں زیرِ استعمال تھا۔ بھارت نے ڈنڈی ماری اور اسے پاکستان کے حوالے کر دیا''۔ ڈرائیور نے ایک موٹی گالی نکال کر کہا۔ پلک جھپکنے میں ولی داد اور فوجی نوجوان ٹرک سے کودے اور پوزیشنیں لے کر کھڑے ہو گئے۔ اس دوران موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کے بڑے بڑے قطرے درختوں پر گرتے تو عجیب سنسنی خیز آواز پیدا ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہر طرف پانی کھڑا ہو گیا۔

ولی داد کو ایسے محسوس ہوا جیسے لوگوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی ہوں۔ ناگاہ اس کی نظر اُٹھی۔ اس نے دیکھا کہ دُور امرتسر کی طرف سے مہاجرین کا ایک قافلہ چلا آ رہا تھا۔ یہ آوازیں انھی لوگوں کی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ قافلہ ان کے نزدیک پہنچ کر رُک گیا جو کئی سو لوگوں پر مشتمل تھا۔ بچے اور عورتیں بیل گاڑیوں پر سوار اور مرد حضرات پیدل چل رہے تھے۔ قافلے والوں کو فوجی ٹرک دیکھ کر اطمینان ہو گیا جیسے خدا نے غیبی امداد بھیجی ہو۔

اسی دوران ٹرک کے انجن کا نقص بھی ٹھیک کر لیا۔ چنانچہ لوگ بارش میں شرابور، کیچڑ میں لت پت زخموں سے چُور ٹرک کے ساتھ ساتھ پاکستان کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ جونہی ٹرک نے موڑ کاٹا اور واہگہ کی طرف سفر شروع ہوا تو ولی داد نے ٹرک کے دھندلے شیشوں میں سے دیکھا۔ دُور دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اس کا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔

''ٹرک کی رفتار تیز کرو'' اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ڈرائیور نے ٹرک کی رفتار تیز کر دی۔ جب وہ قریب پہنچا تو ولی داد کی آنکھوں کے سامنے ناقابلِ یقین منظر تھا۔ ٹرک سڑک کے کنارے کھائی میں گرا ہوا تھا اور سارا سامان شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ سکھوں نے حملہ کر کے اسے آگ لگا دی تھی۔

''روکو'' ولی داد کو اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔ ٹرک رُکتے ہی وہ چھلانگ لگا کر نیچے اُترا اور جو منظر اس نے دیکھا، اس کا اپنا ہی دل دھڑکنا بھول گیا۔ اکرم کھائی میں گرا ہوا تھا، اس کا پیٹ پھٹا ہوا اور آنتیں باہر نکل کر سانپوں کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ اس کے اپنے ہی خون نے کپڑوں کو ارغوانی رنگ دے دیا تھا۔ اس میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی لیکن ہر دم پیلا ہوتا ہوا چہرہ اور اُکھڑتی ہوئی سانسیں یہ پیغام دے رہی تھیں کہ زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ بڑی سُرعت سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

''میری بیوی اور بیٹے کو بچا لو'' اکرم نے سسکی بھری۔ اس کے لب ہلے اور کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کی آنکھیں ساکت اور گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ ولی داد نے اردگرد کا جائزہ

لیا۔ ڈرائیور کی لاش ٹرک کے اندر ہی تھی اور فوجی جوان کی لاش کھیتوں کے منڈیر پر پڑی تھی۔

''اکرم کی بیوی اور بیٹا؟'' بجلی کی طرح اس کے دل میں خیال کوندا۔

''اف میرے اللہ کیا سکھا سے اغواء کر کے لے گئے؟''

اس نے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ مکئی کے سبز کھیتوں سے نفرت کے سرخ شعلے بلند ہو رہے تھے۔ سٹے برہنہ ہو گئے تھے اور ان کے دانے لال انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ انسانیت نے اپنا لبادہ اُتار پھینکا تھا۔

''سر یہاں رُکنا خطرناک ہے۔ سارا قافلہ رُک چکا۔'' ڈرائیور نے سرگوشی کی۔ میں انھیں دفن کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' ولی داد نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اس کھائی میں میتیں رکھ کر اُوپر مٹی ڈال دیتے ہیں۔'' کسی نے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' ولی داد نے جواب دیا۔

اچانک سامنے کھیتوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ ولی داد نے پستول مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا لیکن اس نے جو منظر دیکھا، اس کی آنکھیں پلک جھپکنا بھول گئیں۔ زرینہ بچے کو گود میں اُٹھائے کھیتوں سے باہر نکلی۔ خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ سارا لباس تار تار اور کیچڑ سے لت پت تھا۔ ہر طرف پانی پھیلا ہوا تھا لیکن زرینہ کی آنکھیں خشک تھیں۔ کسی نے اس کے اُوپر چادر ڈال دی۔ سورج بھی اس دل خراش منظر کی تاب نہ لا کر بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔

''بھائی جان سکھوں نے حملہ کر دیا اور میں بھاگ کر بیٹے کے ساتھ کھیتوں میں گھس گئی۔ یکا یک بچے نے بھوک کی وجہ سے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے چھاتی سے لگایا لیکن دودھ کہاں تھا۔ وہ تو خوف سے خشک ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا جس سے اس کا دم گھٹ گیا۔''

وہ زمین پر بیٹھ گئی اور اپنے خوبصورت بالوں میں کیچڑ ڈالنے لگی۔

''میں قاتل ہوں اس سکھ کی طرح جس نے میرے خاوند کو قتل کیا۔ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا۔ میں نے اب زندہ رہ کر کیا کرنا ہے۔ مجھے اور میرے بیٹے کو بھی اکرم کے ساتھ دفنا دو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ غش کھا کر گر پڑی۔

ولی داد نے بچے کا معائنہ کیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نیلے تھے۔ بچے کی گردن پر ہاتھ رکھ کر نبض ٹٹولی تو وہ چل رہی تھی۔ اُمید کی ایک کرن اس کے دل میں جاگی۔ زمانۂ طالب علمی میں نیشنل گارڈ کی ٹریننگ کے دوران ابتدائی طبی امداد کے سکھائے ہوئے طریقوں کے مطابق اُس نے بچے کو مصنوعی سانس دینا شروع کیا۔ کچھ ہی دیر میں بچے میں زندگی کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے اور اس نے رونا شروع کر دیا۔

''زرینہ ہوش کرو، تمہارا بیٹا زندہ ہے۔'' ولی داد جذبات سے گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

''تمہارے خاوند نے پاکستان کے لیے جان دی۔ اس کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ یہ پاکستان کے پودے کو سینچے گا اور اسے دوام بخشے گا''۔

زرینہ نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ ''میرا بیٹا بھی ایک روز پاکستان کے لیے اپنا خون اور جان دے گا۔'' اس کی خشک آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگ گئی۔

اس دوران تینوں میتوں کو قافلے والوں نے دفنا دیا اور قافلہ پاکستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوئے تو سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا لیکن ان کے لیے ایک نئے دن کا آغاز تھا۔ پاکستان کی سرحد عبور کرتے ہی ولی داد نے تشکر سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سر جھکا دیا۔ ◆◆◆

چھوٹا پاکستان

جمیل عثمان

"پتلی بی.....؟ میں نے اس کے منہ کے قریب اپنا منہ لے جا کر کچھ کہنا چاہا، مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا آدھا دھڑ پیچھے کو سرکا لیا اور تقریباً لیٹتی ہوئی بولی۔

"پرے ہٹ..... پرے ہٹ!! تیرے منہ سے پیاز کی بُو آتی ہے۔"

"تو کیا ہوا پتلی بی؟" میں اس کے اور قریب ہوتا ہوا بولا۔

"تو نے ابھی پیاز کھائی ہے نا؟"

"ہاں، دوپہر کے کھانے پر اماں نے لیموں اور پیاز کی سلاد بنائی تھی۔ مجھے تو پسند ہے پیاز کی سلاد!"

"مگر مجھے پیاز کی بُو سے سخت چڑ ہے۔" کہتے ہوئے اس نے پان کی ایک چھوٹی سی گلوری بنائی اور میرے منہ میں اپنے ہاتھ سے ٹھونس دی۔

"ایک کھلی (گلوری) پان کھالے، منہ نہیں مہکے گا۔"

اس دن کے بعد سے جب بھی ہمارا دل پان کھانے کو چاہتا، تھوڑی سی پیاز چبا کر جاتے اور پتلی بی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے کچھ باتیں شروع کر دیتے۔

میری عمر اُس وقت آٹھ سال تھی۔ سخت جاڑوں کے دن میں پتلی بی دوپہر کے کھانے کے بعد، سی سی کرتی ہوئی آنگن میں رکھے ہوئے تخت کی طرف بھاگتی۔

"بھات (چاول) کھانے کے بعد تو اور بھی کنکنی (کپکپی) شروع ہو جاتی ہے۔" وہ کہتی۔ آنگن میں رکھے ہوئے تخت پر اس وقت پوری دھوپ پڑ رہی ہوتی۔ پتلی بی تخت پر سفید چادر بچھا کر، ایک گاؤ تکیہ رکھتی اور پھر اپنا بڑا سا پان دان سنبھال کر بیٹھ جاتی۔ کلّے میں پان دبا کر وہ اپنا سروتا اُٹھا لیتی اور آہستہ آہستہ چھالیہ کترنے میں مصروف ہو جاتی۔ میں، عدنان اور جمیلہ بھی ایک ایک کر کے اُس کے گرد لیٹ جاتے۔

"پتلی بی ..... پان!" مجھ سے دو سال چھوٹا عدنان درخواست کرتا۔

"نہیں..... پان کھانے سے زبان موٹی ہو جاتی ہے۔" پتلی بی کہتی۔

"پھر آپ کیوں کھاتی ہیں؟" سب سے چھوٹی جمیلہ سوال کرتی۔

"مجھے پڑھنا تھوڑی ہے، تم لوگوں کو تو پڑھنا ہے۔"

"کتنی موٹی ہو جاتی ہے زبان؟" عدنان سوال کرتا۔

اور وہ اپنی زبان منہ سے نکال کر دکھاتی۔ سرخ سرخ زبان جس کے دونوں کنارے سیاہ ہو چکے تھے۔ مجھے اس وقت وہ ہندوؤں کی کالی دیوی کی طرح لگتی۔

"زبان موٹی ہونے سے پڑھ کیوں نہیں سکتے پتلی بی؟" میں پوچھتا۔

"بس نہیں پڑھ سکتے! ہم نے تو یہی

"پتلی بی تمہارے بیٹے کا جنازہ اُٹھ رہا ہے"۔ وہ چلّایا
"میں اُسے اللہ حافظ کہہ آئی ہوں"۔ پتلی بی سکون سے بولی

ہے۔''

لیکن جب ہم پیاز کھا کر پُتلی بی کے پاس جاتے، تو وہ ہمیں پان دے دیتی۔ ''ذرا دیکھیں تو کس کا منہ کتنا لال ہوا ہے؟'' اور عدنان جلدی سے اپنی سرخ زبان نکال دیتا۔

''ہاں! تیری ساس تو تجھے بہت چاہے گی!''

''اور میری پُتلی بی؟'' میں اپنی زبان دکھاتا۔

''ہاں!! تیرا تو منہ ذرا لال نہیں ہوا۔ تیری ساس تو تجھے بالکل نہیں چاہے گی۔'' پھر ننھی جمیلہ منہ میں پان بھرے ہوئے کہتی۔

''مے، ای شاش؟'' اور ایسا کرنے میں تھوڑی سی پیک ٹپک کر اس کے کپڑوں پر لگ جاتی۔ پُتلی بی جلدی سے اسے گود میں بھر کر پیار کر لیتی۔

رات کو جب ہم تینوں سونے کے لیے لیٹتے، تو پُتلی بی اس وقت تک ہمارے پاس بیٹھی رہتی جب تک ہم سو نہ جاتے۔

''پُتلی بی کوئی کہانی سناؤ نا؟''

''کون سی؟''

''سنگھاڑے والی۔'' جمیلہ کہتی۔

''نہیں سوداگر والی''۔ عدنان بول پڑتا۔

''نہیں پُتلی بی، جنگِ آزادی والی۔'' میں کہتا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' یہ کہانی پُتلی بی ہمیں بڑے شوق سے سنایا کرتی تھی۔

''ایک تھا شیر۔'' وہ کہانی شروع کرتی، مگر عدنان فوراً بیچ میں ٹپک پڑتا۔

''وہ جو جنگل میں رہتا ہے؟''

''نہیں رے! وہ تو آدمی تھا، اُس کا نام شیر علی تھا، بڑا بہادر تھا، شیر ہی کی طرح..... جوان، لمبا تڑنگا اور جیالا۔ اُس کی ایک بیوی تھی، وہ بھی بڑی اچھی تھی۔ سب لوگ اس کو پتّل کہتے تھے۔ وہ تھی ہی بالکل گڑیا جیسی۔ پتّل جانو ہونا؟''

''پُتلی..... جیسی کہ تم!'' میں کہتا۔

''ارے میں کہاں، بڈھی کھوسٹ!!''

''تم بھی تو بہت اچھی ہو پُتلی بی!'' جمیلہ اس سے قریب ہوتے ہوئے کہتی۔

''خیر، دونوں کے دو بیٹے تھے اور وہ سب بڑے چین کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ 1946ء کا رائٹ شروع ہو گیا!''

''رائٹ کیا؟'' عدنان پوچھتا۔

''یہی مار دھاڑ، قتل غارت، لُوٹ مار وغیرہ، مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ اُن کے گھر لُوٹ لیے گئے تھے۔''

''کیوں پُتلی بی؟''

''اِس لیے کہ مسلمانوں نے ہندوستان تقسیم جو کر دیا تھا، اُنھوں نے پاکستان جو بنانا چاہا تھا۔''

''پاکستان پہلے سے نہیں بنا ہوا تھا؟'' ہم میں سے کوئی پوچھ بیٹھتا۔

''نہیں بیٹے، پہلے تو سارا ہندوستان تھا۔ پھر ہم نے پاکستان کے لیے جنگ لڑی اور پاکستان بنایا۔''

''ہاں تو شیر اور پتّل اور اُن کے بچے؟'' جمیلہ بے تابی سے پوچھتی۔

''ہاں پھر ہندوؤں نے شیر کے گھر پر بھی دھاوا بول دیا۔ بس اُس نے اپنی تلوار اُٹھائی اور بلوائیوں پر پل پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار بلوائی وہیں ڈھیر ہو چکے تھے۔ پھر اُنھوں نے شیر کے گھر کو آگ لگا دی۔ شیر نے ایک ہاتھ میں تلوار لی اور دُوسرے میں اپنے سال بھر کے بیٹے کو گود میں اُٹھا لیا، پھر اپنی بیوی، بڑے بیٹے کو جو اُس وقت چار سال کا تھا اور اپنی بہن کو ساتھ لیا اور کیمپ کی طرف چل پڑا۔ سارے مسلمان

شہر کے ایک اسکول میں جمع ہو رہے تھے۔ وہی اُن کا کیمپ تھا۔ راستے کے دونوں طرف شرپسند، بھوکے بھیڑیوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے، مگر شیر کی تلوار دیکھ کر کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے آئے۔

شیر جب کیمپ کے دروازے پر پہنچا، تو دیکھا کہ اُس کی بہن پیچھے رہ گئی تھی۔ بدمعاش کیمپ کے باہر بھی جتھے بنائے کھڑے تھے۔ کیمپ میں مسلمانوں کو امان تھی، مگر باہر نکلے نہیں کہ مارے گئے۔ شیر اپنی بیوی اور بیٹوں کو لے کر کیمپ میں داخل ہو گیا، مگر اُس کی بہن پیچھے رہ گئی تھی۔ شیر کے کیمپ میں داخل ہوتے ہی ایک بلوائی نے اُس کی بہن کو پکڑ لیا۔ شیر نے مڑ کر یہ منظر دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ تلوار سونت کر اُس بلوائی کو للکارتا ہوا آگے بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں دس بارہ لاشیں گر پڑیں۔ اکیلا شیر غنڈوں کی ایک پوری فوج پر بھاری تھا۔

مگر پھر..... نہ جانے کہاں سے دو گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں اور ایک شیر کو لگی اور دُوسری اُس کی بہن کو۔ اور دونوں وہیں شہید ہو گئے! پتلی بی کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگتے۔

''اور شیر کی بیوی اور بچے کہاں گئے؟'' میں سوال کرتا۔

''وہ بعد میں مشرقی پاکستان آ گئے۔''

''پتلی بی تم رو کیوں رہی ہو؟'' ہم پوچھتے۔

''ایسے ہی بیٹے! بیچارہ شیر مر گیا نا! تو مجھے بھی رونا آ گیا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ اس کے رخسار پر ڈھلک آتا۔

❀❀

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا، پتلی بی کو اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ ہمارے مکان کے ساتھ ہی بنے ہوئے کوارٹر میں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ رہتی تھی۔ امّی اس کی بڑی عزت کرتی تھیں اور گھر کا سارا کاروبار اسی کے سپرد کر رکھا تھا۔

روزانہ نوکروں سے سودا منگوانا، کھانا پکانا، دھوبی کو کپڑے دینا اور دُھلے ہوئے کپڑے گن کر لینا وغیرہ وغیرہ۔ پتلی بی ہمارے گھر کے ایک فرد کی طرح رہتی تھی۔

اسکول سے آنے کے بعد امّی کی بجائے ہم اس کے پاس جاتے۔ عدنان دور ہی سے صدا لگاتا: ''پتلی بی کھانا!'' اور پتلی بی ہمیں کھانا نکال کر دیتی۔ پتلی بی کی موجودگی میں امّی ہم لوگوں کی طرف سے بے فکر رہتی تھیں۔ رات کو وہی ہمارا بستر بچھاتی اور کھانا وغیرہ کھلا کر ہمیں سُلانے کے لیے لاتی اور سونے سے پہلے ہمیں کہانی ضرور سناتی۔

پتلی بی کی گود میں کھیل کر ہم جوان ہو گئے۔ میری شادی پر پتلی بی بہت خوش تھی۔ اگرچہ اب کافی ضعیف ہو گئی تھی، مگر اب بھی اس کی تیزی میں فرق نہیں آیا تھا۔ گھوم پھر کر دیکھتی رہتی تھی کہ نوکر صحیح کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ گھر کی نگہداشت اب بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ میں کبھی کبھی یونہی مذاق میں کہہ دیا کرتا تھا: ''پتلی بی، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہو، اب تو اللہ اللہ کرو، یہ دنیاداری چھوڑو!'' تو وہ تنک کر جواب دیتی:

''چل! بڑا آیا مجھے سبق پڑھانے۔ میں دنیاداری اور اللہ اللہ ساتھ ہی کروں ہوں۔''

''پھر بھی پتلی بی جو تھوڑی بہت رہ گئی ہے، اسے ضائع نہ کرو، کیا پتا کل کے بجائے آج ہی چل بسو، تو ہم تو کہیں کے نہ رہیں گے۔''

''فکر نہ کر! اتنی جلدی نہیں مروں گی، تُو تو میرے ہاتھ کا پیدا ہے نا! اب تیرا بیٹا بھی انہی ہاتھوں سے پیدا ہوگا۔'' وہ معنی خیز نظروں سے میری بیوی کی طرف دیکھتی، تو شہناز شرم سے گلنار ہو جاتی۔

''آپ کیوں فضول باتیں کرتے ہیں، اللہ نہ کرے پتلی بی کے دشمنوں کو کچھ ہو۔'' شہناز کہتی۔

''دیکھ لے بیٹی! بچپن سے پال پوس کر اسی دن کے لیے

جوان کیا تھا۔"

"ارے میری اچھی پُتلی بی!" میں اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔"

تب پُتلی بی اپنے پوپلے منہ سے ہنستی ہوئی مجھے ایک چپت رسید کر دیتی۔

❀❀

شہناز عجیب الّم غلّم چیزیں کھاتی رہتی تھی۔ مثلاً گولے گنڈے، ماچس کی تیلی کے اوپر لگا ہوا مسالا، کچی املیاں، چورن اور سب سے بڑھ کر پُتلی بی کے چھالیے کے ڈبے کی گرد! پُتلی بی جب بھی اپنا پان دان لے کر بیٹھتی، شہناز بھی پہنچ جاتی۔ چھالیہ کا ڈبہ اُٹھا لیتی اور ساری چھالیہ ایک کاغذ پر الگ نکال کر رکھ دیتی..... پھر ڈبے کی تہ میں بچی ہوئی چھالیہ کی باریک گرد کو اپنی ہتھیلی پر اُلٹ لیتی اور اسے انگلیوں سے یوں چاٹتی جیسے کوئی بہت ہی مزیدار چیز کھا رہی ہو۔ پُتلی بی نے ایک روز ڈبہ اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

"چل ہٹ!" اس نے شہناز کو ڈانٹ پلائی۔ "عجیب لڑکی ہے، یہ کوئی کھانے کی چیز ہے؟"

"اچھا لگتا ہے پُتلی بی!" شہناز ٹھنک کر کہتی، تو پُتلی بی مسکرا دیتی۔

"ہاں رے! ایسی حالت میں دل اُلٹی سیدھی چیزیں کھانے کو چاہتا ہے۔" پھر وہ اپنا قصہ سنانے بیٹھ جاتی۔

"پتا ہے؟ جب میرا بڑا بیٹا پیدا ہونے کو تھا، تو میں بچوں کے مٹی کے کھلونے توڑ کر کھا جایا کرتی تھی۔ اُس زمانے میں چولہے مٹی کے ہوا کرتے تھے۔ چولہے کے اندر کی مٹی آگ میں تپنے کی وجہ سے بالکل سرخ ہو جایا کرتی تھی۔ مجھے وہ سوندھی سوندھی مٹی اتنی اچھی لگتی کہ کیا کہوں، میں تو چولہے کی اندر کی مٹی توڑ توڑ کر کھاتی تھی۔" شہناز، پُتلی بی کی باتیں

سن کر خوب ہنسا کرتی تھی۔

❀❀

25 مارچ 1971ء کو مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن ہو[ا] تھا۔ اِس کے ساتھ ہی رضا کار "البدر" اور "الشمس" تحریکو[ں] کا اجرا ہوا۔ محبِ وطن بنگالی اور غیر بنگالی جوان جوق در جوق فوجی تربیت حاصل کرنے لگے۔ پُتلی بی کے چھوٹے بیٹے نے بھی البدر تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی۔ شہروں میں تو فوج نے کنٹرول حاصل کر لیا، لیکن دیہاتوں میں باغی دہشت گردی کرتے رہتے تھے۔ اُن کی سرکوبی کے لیے پاکستانی فوج کے سپاہی جاتے، تو اُن کی مدد کے لیے البدر اور رَضا کاروں کے دستے بھی جاتے۔ ایسے ہی ایک دستے کے ساتھ پُتلی بی کا چھوٹا بیٹا بھی روانہ ہوا، لیکن واپسی اُس کی قسمت میں نہ تھی۔ دشمن کی ایک گولی اُس کے سینے پر لگی تھی اور اَپنے باپ کی طرح وہ بھی وطن پر قربان ہو گیا تھا۔ لاش جب گھر آئی، تو پُتلی بی صبر و استقامت کا پیکر نظر آئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔

شہر میں کرفیو نافذ تھا اور شہناز دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ امی سخت پریشان تھیں، اسپتال لے جانا ممکن نہ تھا، پھر کوئی سواری بھی میسر نہ تھی۔ اِدھر شہناز کا یہ حال تھا اور اُدھر پُتلی بی کے بیٹے کے جنازے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں کبھی جنازے کی خبر لیتا، تو کبھی آ کر شہناز کی خیریت معلوم کرتا۔ میں ابھی گھر میں ہی تھا کہ جنازہ اُٹھنے کی خبر آئی اور ساتھ ہی پُتلی بی ہمارے گھر میں داخل ہوئی، اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا:

"تُو جنازے کے ساتھ جا۔ میں تیری بیوی کے پاس ہوں..... اِن شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر پُتلی بی؟ تمہارے بیٹے کا جنازہ اُٹھ رہا ہے!"

"میں اُسے اللہ حافظ کہہ آئی ہوں۔"

''لیکن ابھی تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''میرے نہ آنے سے اُسے زندگی تھوڑی مل جائے گی، جب کہ یہاں ایک نئی زندگی جنم لینے والی ہے۔ یہاں میری زیادہ ضرورت ہے۔'' میں اس عورت کی استقامت پر حیران تھا۔

ہم قبرستان گئے اور شہید کو اللہ کے حوالے کر آئے۔ شہید تو اللہ کی امانت ہوتے ہیں۔ ہم نے اللہ کی امانت کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ واپس آ کر میں سیدھا گھر گیا تاکہ شہناز کی خیریت معلوم کر سکوں۔ پُتلی بی میرے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔

''مبارک ہو! اللہ نے تجھے بیٹا دیا ہے۔ شہناز اور بچہ دونوں اللہ کے فضل سے خیریت سے ہیں۔'' اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں تھوڑی دیر مبہوت کھڑا رہا، پھر ضبط کے بندٹوٹ گئے۔ میں بے اختیار پُتلی بی کے پیروں پر گر پڑا اور رونے لگا۔

''پُتلی بی! یہ کیسا انصاف ہے؟ میرے ہاتھ تیرے بیٹے کو دفن کر کے آ رہے ہیں جب کہ تیرے ہاتھوں میں میرے بچے نے زندگی کی پہلی سانس لی!!''

پُتلی بی نے ایک لفظ کہے بغیر مجھے اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا..... میں دیر تک پُتلی بی کے شانے سے لگا سسکتا رہا۔

فوجی آپریشن کے نومہینوں کے دوران بے شمار خاندان مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ بھائی کی موت کے بعد پُتلی بی کا بیٹا بھی دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کراچی چلا گیا۔ جون 1971ء کی کسی تاریخ کو چالنا کی بندرگاہ سے مسافر بردار جہاز ''شمس'' روانہ ہوا، پُتلی بی کا بیٹا بھی اس جہاز سے روانہ ہوا۔ میں چالنا تک اُسے چھوڑنے گیا تھا۔ پُتلی بی اپنے بیٹے کے ساتھ کراچی

نہیں گئی۔ وہ بھلا اِس سرزمین کو کیسے چھوڑ سکتی تھی، یہاں اس کے جگر کا ٹکڑا دفن تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی رہے، بعد میں اسے کراچی اس کے بیٹے کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ اِس دوران جنگ چھڑ گئی اور دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان ختم ہو گیا، بنگلہ دیش نے جنم لیا۔ غیر بنگالیوں کا قتلِ عام شروع ہوا، مگر ہم اِس طوفانِ کرب و بلا سے بھی گزر گئے۔ اللہ نے ہماری جان اور عزت و آبرو محفوظ رکھی۔ البتہ گھر لُٹ گیا، تمام جمع پونجی ختم ہو گئی۔

جون 1972ء میں پُتلی بی کا ایک بھانجا ہندوستان سے آیا، پُتلی بی اُس کے ساتھ ہندوستان جانے پر رضامند ہو گئی۔

''سنا ہے وہاں کے لوگ نیپال کے راستے پاکستان جا رہے ہیں۔''

''مگر اِس ضعیف العمری میں تمہارا اِتنا لمبا سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے، راستے میں ہزار دشواریاں ہیں اور جان جانے کا بھی خطرہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''نہیں بیٹا میں تو جاؤں گی..... اُس وقت میں اِس لیے نہیں گئی تھی کہ یہ ملک پاکستان تھا۔ اب تو یہ پاکستان نہیں ہے اور ہم نے تو ساری قربانیاں پاکستان کے لیے دی تھیں۔ جب پاکستان ہی نہ رہا، تو یہاں رہ کر کیا فائدہ؟ میں پاکستان ہی میں مرنا پسند کروں گی۔'' پُتلی بی نے پُرعزم انداز سے کہا۔

ہم نے اسے بہت روکا، مگر وہ اپنے بھانجے کے ساتھ ہندوستان چلی گئی۔ ڈیڑھ سال تک وہ اپنے آبائی وطن میں رہی۔ اپنے ''شیر'' کے شہر میں۔ وہاں سے اس کا خط برابر آتا رہا۔ وہ نیپال جانا چاہتی تھی، مگر راستے میں دشواریاں تھیں، پیسے نہیں تھے۔ اس کے رشتہ دار بھی اِس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس کی مدد کر سکیں۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد ہمارے ذرائعِ آمدنی بھی محدود ہو گئے تھے۔ ورنہ ہم ہی کسی طرح اس کی مدد کر دیتے۔ ہمیں خبر ملی کہ پاکستان سے اس کے بیٹے نے

کلیئرنس نیپال بھجوا دیا ہے۔ بس اس کے نیپال پہنچنے کی دیر تھی۔

اپریل 1974ء میں خبر آئی کہ پُتلی بی نیپال چلی گئی ہے۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اب وہ اپنے خوابوں کی سرزمین ''پاکستان'' پہنچ جائے گی۔ اِسی دوران بنگلہ دیش سے بھی غیر بنگالیوں کی منتقلی شروع ہوگئی اور ہم بھی پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اِس دوران میں پُتلی بی کی کوئی خبر ہمیں نہیں ملی۔ ہم مطمئن تھے کہ اب تک وہ پاکستان پہنچ گئی ہوگی، لیکن اکتوبر 1974ء کی ایک صبح نیپال سے ایک خط موصول ہوا۔ یہ کسی اجنبی نے لکھا تھا جو اُس سرائے میں قیام پذیر تھا جس میں پُتلی بی مقیم تھی۔ اُس نے لکھا تھا کہ پُتلی بی کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کے ہندوستانی رشتہ داروں نے کچھ عرصے تک خبر گیری کی، مگر اب سب چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہاں سے کوئی مالی امداد بھی نہیں کر رہا تھا۔ پاکستانی سفارت خانے سے بیس روپے ہفتہ اُسے گزارہ اَلاؤنس ملتا تھا۔ اِسی پر وہ گزارہ کر رہی تھی۔ اس کی بیماری بڑھ چکی تھی اور دواؤں اَور علاج کے پیسے نہیں تھے۔ وہاں کون تھا جو اسے کھانا وغیرہ پکا کر دیتا۔ بیس روپے جو ملتے تھے، اس سے بازار سے کچھ منگوا کر کھا لیا کرتی تھی۔ بیماری میں بازاری چیزیں اسے مزید نقصان پہنچا رہی تھیں۔ سرائے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے، اِس لیے سرائے کے مالک نے اسے کمرے سے نکال دیا تھا، البتہ ترس کھا کر اسے نچلی منزل پر سیڑھیوں کے نیچے رہنے کی جگہ دے دی تھی۔ اس کا کلیئرنس آ چکا تھا، مگر نیپال سے پروازیں بند ہو چکی تھیں اور وہ فلائٹ کے انتظار میں موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا تھی۔

امی خط پڑھ کر بے چین ہوگئیں، روتی جاتی تھیں اور بے قراری کے عالم میں ٹہلتی جاتی تھیں:

''اللہ کے لیے کچھ کرو! وہ بیکار ہی نیپال گئی۔ اگر یہاں ہوتی تو اب تک جا چکی ہوتی۔ کتنی ہی ضعیف عورتوں کی گنجائش بہت سے لوگوں کے کلیئرنس میں تھی، وہ کسی کے نام پر جا سکتی تھی۔''

''امی اسے تو پاکستان پہنچنے کی جلدی تھی۔ آج سے دو سال پہلے کسی کو کیا خبر تھی کہ یہاں سے بھی تبادلہ شروع ہو جائے گا۔''

''اس کا تو کلیئرنس آ چکا ہے۔ صرف فلائٹ کا انتظار ہے نا؟'' امی جوش و خروش سے میری طرف پلٹیں: ''اگر ٹکٹ کا انتظام ہو جائے، تو وہ کسی بھی ایئر لائن سے جا سکتی ہے؟''

''ہاں! جا تو سکتی ہے، مگر نیپال سے پاکستان جانے کے لیے کوئی ڈائریکٹ فلائٹ نہیں ہے۔ رنگون یا بینکاک ہو کر جانا پڑے گا۔''

''کتنا خرچ آئے گا؟''

''تقریباً پانچ ہزار روپے!!''

''اوہ میرے اللہ!'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ہمارے پاس تو پانچ سو روپے بھی فالتو نہیں ہیں، سب کچھ لُٹ گیا۔''

''امی میں نیپال جا کر پُتلی بی کو لے آؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''مگر اس میں تو خرچ آئے گا۔''

ہوائی جہاز کے کرائے کی نسبت کم خرچ آئے گا۔ میں ریل یا بس سے سفر کروں گا؟''

شہناز کے گلے میں ایک سونے کا ہار بچ رہا تھا۔ میں نے اس سے وہ مانگ لیا اور اس نے خوشی خوشی وہ ہار مجھے اتار کر دے دیا۔

''ہزار دو ہزار تو اِس کے مل جائیں گے۔ میرے جانے اور پُتلی بی کو لانے کا خرچ نکل آئے گا۔'' پھر میں نے یونہی شہناز سے پوچھ لیا: ''تمہیں ہار کے جانے کا افسوس تو نہیں ہوا؟''

''اگر یہ کسی کے کام آجائے تو میری خوش قسمتی ہوگی۔''
اس نے مسکرا کر کہا۔
''تم بہت اچھی ہو!'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''جلدی واپس آجایئے گا، آپ کا بیٹا آپ کو یاد کرے گا۔''
''بہت جلدی، بس میں گیا اور آیا۔''
نومبر کی ٹھٹھرتی شام کو میں ٹھمنڈو پہنچا اور سیدھا اُس سرائے کی راہ لی جہاں پُتلی بی ٹھہری ہوئی تھیں۔ سرائے کی بوسیدہ سی عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ریسیپشن پہلی منزل پر تھا۔ میں لکڑی کی سیڑھیوں سے اوپر گیا اور کاؤنٹر کلرک سے معلوم کیا۔
''میرے ساتھ آئیں۔'' وہ مجھے لیے ہوئے نیچے اترا اور سیڑھیوں کے پاس ایک مدھم بلب آن کر دیا۔
''خدایا!'' سیڑھیوں کے نیچے ایک جھلنگا سی چارپائی پر کوئی چیز گٹھڑی کی صورت میں پڑی ہوئی تھی۔ بستر اور لحاف میل سے سیاہ ہو رہے تھے، فرش بھی پختہ نہیں تھا۔ سرخ اینٹیں بچھی ہوئی تھیں جو گیلی گیلی لگ رہی تھیں۔ جہاں چارپائی رکھی ہوئی تھی، وہاں کوئی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ سیڑھیاں بہت نیچی تھیں، دیواروں پر مکڑیوں کے جالے تھے اور چھپکلیاں بیٹھی ہوئی تھیں، مچھر مسلسل بھنبھنا رہے تھے اور سردی سے میرے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔
''یہ نیچے اور کوئی نہیں رہتا؟''
''صاحب نیپال میں نیچے کی منزل پر کوئی نہیں رہتا، یا دکانیں اور گودام ہوتے ہیں یا پھر لیٹرین اور باتھ روم!'' سرائے کے ہندوستانی کلرک نے بتایا۔ ''یہاں سردی جو بہت پڑتی ہے۔ زمین ڈیمپ ہو جاتی ہے، اوپر کے فلور سارے تختے کے ہوتے ہیں۔''

میں نے اس کے سر سے لحاف سرکایا اور پُتلی بی کو دیکھ کر آنسو نکل پڑے۔ سیاہ چہرہ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، چہرے پر بے شمار جھرّیاں، بال گرد میں اَٹے ہوئے اور پورا جسم گویا ہڈیوں کا ڈھانچا۔
''پُتلی بی!'' میں نے اس کے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا۔
''تُو آیا ہے؟'' اس کی آواز ڈوبی ہوئی تھی۔
''ہاں پُتلی بی!''
''تیرے منہ سے پیاز کی بُو آ رہی ہے!'' وہ نحیف آواز میں بولی۔ غم کی زیادتی کے باوجود میں مسکرا دیا۔
''بس میں مَیں نے برگر کھائے تھے۔ اس میں پیاز ڈلی ہوئی تھی۔''
''کیوں آیا ہے؟'' کپکپاتی آواز پھر اُبھری۔
''میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''
''نہیں، اب میں کہاں سفر کے قابل، لگتا ہے آخری وقت آ گیا۔ یہیں مر جاؤں گی۔''
''نہیں پُتلی بی ایسا نہ کہو۔''
''عدنان، جمیلہ، شہناز، تیرا بیٹا اور تیری ماں کیسے ہیں؟'' اس نے نحیف آواز میں پوچھا۔
''سب ٹھیک ہیں پُتلی بی، پہلے تم یہاں سے چلو۔ میں تمہارے لیے کمرے کا انتظام کرتا ہوں۔''
میں نے اس سرائے میں دوسری منزل پر ایک کمرا لیا اور پُتلی بی کو لے آیا۔ جب میں اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، تو سخت حیران تھا۔ اس کا وزن نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے کمرے میں اسے لٹا کر دو تین خوب گرم کمبل ڈال دیے۔ اسے آرام ملا، تو سو گئی۔ میں ڈاکٹر کو لینے چلا گیا۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد نا اُمیدی ظاہر کی: ''یہ تو چند دنوں کی مہمان ہیں۔''

میں نے اسے اسپتال میں داخل کرنے کی کوشش کی، مگر کسی اسپتال میں داخلہ نہیں ملا۔ ہر جگہ سے وہی جواب ملتا: ''کیا فائدہ! مرض اب لاعلاج ہو چکا ہے۔ چند دنوں کی یہ مہمان ہیں۔''

تین دن تک پُتلی بی موت سے لڑتی رہی، پھر اس نے مجھ سے آخری خواہش بیان کی:

''میں نے سن رکھا ہے ..... کہ ..... کسی ملک میں ..... دوسرے ملکوں کے ..... سفارت خانے ..... ایسے ہوتے ہیں ..... جیسے ان ملکوں کی سرزمین!''

''ہاں!''

تو پھر ..... نیپال ..... میں ..... پاک ..... استانی ..... سفارت خانہ چھوٹا پاکستان ہوا نا؟''

''بالکل .....''

''تو میرے مرنے کے بعد ..... میری لاش ..... پاکستانی سفارت ..... خانے میں ..... پھینکوا دینا!'' اور یہ کہنے کے دوسرے دن ہی پُتلی بی مر گئی!

ہم نے اس کی وصیت پر عمل کیا اور لاش کو نہلا دھلا کر کفن وغیرہ پہنانے کے بعد پاکستانی سفارت خانے کے احاطے میں رکھ دیا۔ سفارت خانے کا ایک آفیسر ہم پر برس پڑا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی؟ ایک لاش کو یوں بے آبرو کر رہے ہو؟ اسے دفناؤ!''

''بے آبرو کہاں؟ وہ تو آبرومند ہو گئی۔'' میں نے کہا ''وہ پاکستان پہنچ گئی ہے نا!!''

پُتلی بی کی روح پاکستان پہنچ گئی تھی۔ ہم نے اس کے جسم کو پاکستانی سفارت خانے سے اٹھایا اور نیپال کے ایک دُور افتادہ قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا۔

◆◆◆

آزادی ایک نعمت

ہمارا وطن پاکستان جہاں ہم رہتے ہیں وہ وطن نہیں جو وراثت میں اس کے بننے والوں کو ملا بلکہ پاکستان کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہڈیاں اینٹوں کی جگہ اور خون پانی کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اتنی گراں قدر تخلیق کا اندازہ صرف وہی لگا سکتا ہے جس نے تعمیرِ پاکستان میں اپنا من دھن، بھائی، عزیز و اقارب قربان کیے۔ حصولِ پاکستان کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ کتنی ماؤں کے سامنے ان کے بچے قتل کر دیے گئے۔ کتنی پاکدامنوں نے نہروں اور کنوؤں میں ڈوب پاکستان کی قیمت ادا کی۔ کئی بچے یتیم ہوئے جو ساری زندگی والدین کی شفقت کے لیے ترستے رہے۔ 14 اگست 1947ء وہ مبارک وقت تھا جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ مسلمانوں کے اتفاق اور قائداعظمؒ کے خلوص کی وجہ سے یہ عظیم سلطنت وجود میں آئی، ہندوؤں نے طرح طرح کی مکاریوں سے پاکستان کے مخالفت کی انگریزوں نے بھی طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں، ہمیں ہر قسم کی آزادی اور سامان اور آسائش و آرائش مہیا ہے مگر یہ کبھی نہ بھولیں کہ اس میں ٹیپو سلطان کا خون، سرسید کی نگاہ دوربین، اقبالؒ کے افکار، قائداعظمؒ کی جدوجہد اور دوسرے اکابرین کا ایثار شامل ہے۔ اے میرے وطن! بیشک آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی قدر کرو یہ وطن تمہارے بزرگوں نے بہت مصیبتوں اور مشکلات سے حاصل کیا ہے۔

اے میرے ہم وطنو! یہ جو تم آزادی سے رہ رہے ہو۔ یہ بڑی مہنگی اور قیمتی ہے۔ ہم وطنو آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔''

(مراسلہ، کاشرہ کرم)

فسانۂ ہجرت

فاطمہ زہرہ

اُنیس اگست

قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی قربانیوں کے لاتعداد واقعات پڑھے اور سنے بھی۔ ایک شخصیت ایسی ملی جن سے ملاقات ہوئے تیس برس ہو چکے مگر ہر سال اگست کا مہینہ آتا ہے تو وہ میرے تصور میں بار بار آ کھڑی ہوتی ہیں۔

1989ء کی بات ہے۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کے لیے میانوالی گئی۔ میرے ساتھ میرا تین سالہ بیٹا عدیل بھی تھا۔ جنوری کی رات، ٹرین کا سفر، شدید سردی تھی۔ بہاولپور سے میانوالی تک کا سفر تھا۔ صبح پانچ بجے ہم لوگ میانوالی پہنچے۔ گرم کپڑوں میں ملبوس ہونے کے باوجود ایسا لگتا تھا کہ سردی جسم کے ہر مسام سے اندر گھسی جا رہی ہے۔ جب ہم شادی والے گھر میں داخل ہوئے تو صبح کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے مگر ابھی تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میزبانوں نے مجھے آرام کی خاطر جس کمرے میں پہنچایا وہاں بستر پر ایک بزرگ خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے خاصی پروقار خاتون لگیں۔ میں نے جب انھیں سلام کیا تو وعلیکم السلام کے ساتھ ایک دعائیہ جملہ انھوں نے اس طرح ادا کیا جیسے وہ سلام کے جواب کا ہی اگلا حصہ ہو۔

''اللہ تمھیں اولاد کا دکھ کبھی نہ دکھائے۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے سوتے ہوئے عدیل کو میری گود سے لے کر اسے خود سے چمٹا کر لحاف میں کر لیا۔ عدیل کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے خود کو بھاری بھرکم کوٹ کی قید سے آزاد کیا اور کئی گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد سکون کی سانس لی۔

وہ خاتون تھوڑی تھوڑی دیر بعد بے ساختہ کبھی عدیل کا سر چومتیں کبھی پیشانی۔ وہ بھی ممتا کی گرمائش پا کر ان کی گود میں سکون سے سو رہا تھا۔ چائے آنے تک ہمارے درمیان رسمی گفتگو ہوتی رہی۔

''بیٹی کہاں سے آئی ہو؟'' انھوں نے بہت محبت سے پوچھا:

''جی بہاولپور سے۔'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کیا کہہ کر مخاطب کروں۔ میری الجھن انھوں نے فوراً ہی دُور کر دی۔ جیسے انھوں نے میرا چہرہ پڑھ لیا ہو۔

''بیٹی یہاں مجھے سب خالہ کہتے ہیں اور تمہارا نام کیا ہے؟''

''فاطمہ۔'' نام بتاتے ہوئے نہ جانے کیوں میرا انھیں خالہ کہہ کر پکارنے کو جی چاہا۔

''خالہ آپ بھی شادی میں شرکت کے لیے آئی ہیں نا.....؟ کہاں سے آئی ہیں؟''

''میں تو یہیں رہتی ہوں۔ یہی میرا گھر ہے۔''

''اچھا.....؟'' میں حیران یوں ہوئی کہ وہ بہت صاف اُردو بول رہی تھیں گویا اہل زبان ہوں۔ ہمارے میزبان میرے دُور کے سسرالی تھے۔ شادی کے بعد میں چونکہ یہاں پہلی بار آئی تھی اس لیے گھر کے تمام افراد کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ ہمارے میزبان تو میانوالی کے رہنے

ایسی باحوصلہ خاتون کی کہانی جس کا صبر اپنی مثال آپ تھا

والے تھے۔ وہ وہی مقامی زبان بولتے تھے اور وہی لب و لہجہ۔

میرے اور خالہ کے درمیان یہی باتیں ہوتی رہیں کہ سفر کیسا گزرا؟ کتنے گھنٹے لگے بہاولپور سے میانوالی تک؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟ گھر والوں سے کیا رشتہ ہے وغیرہ۔ چائے ختم ہوئی تو میں نے عدیل کو ان کی گود سے لیا اور دوسرے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ تھکن کی وجہ سے نیند بھی فوراً ہی آ گئی۔ شادی کی تقریب دوپہر میں تھی لہٰذا صبح ناشتے کے بعد میں خالہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ جانے کیوں مجھے وہ بہت اچھی لگی تھیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے میرے ذہن میں کلبلاتا سوال زبان پر آ ہی گیا۔

''خالہ ایک بات پر حیرت ہو رہی ہے۔''

''کس بات پر بیٹی......؟'' وہ مسکرائیں۔

''خالہ آپ تو بڑی صاف اُردو بولتی ہیں اور یہ لوگ (میرا اشارہ باقی گھر والوں کی طرف تھا) تو خاص میانوالی کی زبان بولتے ہیں۔ لہجہ بھی وہی ہے۔ کیا رشتہ داری ہے آپ کی ان سے؟''

وہ ہنس پڑیں۔ ''ہمارا رشتہ انسانیت کا ہے...... اخلاق کا ہے۔'' ان کی آنکھوں میں پانی جھلملایا یا میرا وہم تھا۔ میں خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''میں سمجھی نہیں خالہ! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' وہ بالکل خاموش ہو گئیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ بولیں:

''یہ گھرانا جہاں میں رہ رہی، میرے بیٹے پوتوں سے بڑھ کر اپنا ہے۔ میں پچیس سال سے یہاں مقیم ہوں۔ جس کی آج شادی ہے، وہ میری ہی گود میں پل کر بڑا ہوا ہے۔ سب بچے مجھے اپنے لگتے ہیں۔ گھر کے ہر فرد کے دل میں میرے لیے عزت اور محبت ہے۔ جو احترام یہ مجھے دیتے

ہیں، اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔'' میرے سوال کا جواب اب بھی مجھے نہیں ملا تھا کہ خالہ یہاں کیوں ہیں؟ میرا تجسس دیکھ کر خالہ نے جو کہانی مجھے سنائی، وہ انھی کی زبانی سنیں:

☆☆☆

''میرا میکہ اور سسرال دونوں ہی لکھنؤ میں تھے۔ میاں ایک سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کا تبادلہ جالندھر ہو گیا۔ ہم دو سال سے جالندھر میں ہی رہائش پزیر تھے۔ میرے پانچ بیٹے تھے۔ سب سے بڑا چودہ سال کا اور سب سے چھوٹا ابھی دو سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ دن سے میں اپنے شوہر کو پریشان اور اُلجھا اُلجھا ہوا سا محسوس کر رہی تھی مگر وہ بتاتے کچھ نہیں تھے۔ ہاں جب دفتر کے لیے نکلتے تو یہ ہدایت کرنا نہ بھولتے کہ دروازہ بند رکھنا اور بچوں کو باہر مت جانے دینا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب روز وہ ایسا کیوں کہنے لگے ہیں؟

پھر قیامِ پاکستان کا اعلان ہوا۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ پھر کچھ اس تیزی سے ہنگامے شروع ہوئے کہ ہم لوگوں کو جالندھر سے اپنے گھر جانے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ نیا ملک بننے کی خوشی پر خوف و ہراس حاوی ہو گیا۔ پھر وہ دن آ گیا کہ لوگ اپنا کل اسباب سمیٹ کر قافلوں کی شکل میں چل پڑے۔ ہم بھی اپنے بچوں کے ساتھ ایک قافلے میں شامل ہو گئے۔ ابھی روانہ ہوئے شاید گھنٹہ بھر ہی ہوا تھا کہ پیدل چلنے سے ہم گھریلو پردہ دار عورتیں تھکن سے چور ہو گئیں۔ سفر اور گھر چھوڑنے کا غم تھا، ہونے کی وجہ سے برا حال تھا۔ مرد بھی غمزدہ اور فکرمند تھے مگر عورتوں کی ہمت بندھا رہے تھے۔ اچانک فضا ست سری اکال کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ یہ آوازیں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر فرد سہم کر رہ گیا تھا۔ پھر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ خوف سے لوگوں کی آنکھیں حلقوں سے باہر آ رہی تھیں۔ قافلے پر حملہ ہو چکا تھا۔

کم عمر لڑکیاں اور جوان عورتیں............ بس مت پوچھو بیٹی...... کیا ہو رہا تھا ان کے ساتھ؟ ایسی چیخیں کہ دل دہلا جا رہا تھا۔ دوسروں کی طرح میرے سب بچے بھی خوف سے کانپ رہے تھے۔ دونوں چھوٹے مجھ سے چمٹے ہوئے اور تینوں بڑے باپ کے ہاتھوں کے حصار میں تھے کہ اچانک ایک خوفناک صورت سکھ میری گود سے میرے سب سے چھوٹے بیٹے کو چھین کر لے گیا۔ میں چیختی رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے نیزہ کی انی بچے کے پیٹ میں ایسے چبھو دی گئی کہ وہ آر پار ہو گئی۔ بچہ ہوا میں نیزہ کی نوک پر تڑپ رہا تھا۔ وہ تکلیف سے لرز اور ہوا میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ خون دھار کی شکل میں گر رہا تھا۔ وہ ظالم قہقہے لگاتے رہے۔ بچہ چیخا یا نہیں، ان کے شور میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا اور پھر میرا بچہ ساکت ہو گیا۔ انھوں نے اسے جھٹکے سے نیزے سے الگ کر کے میرے قدموں میں ڈال دیا۔ یکدم ہی دوسرے آدمی نے میرے اس بیٹے کو، جو آنکھیں بند کیے مجھ سے بری طرح لپٹا ہوا تھا، میرے ہاتھوں سے چھینا اور بلم اس زور سے اس کے پیٹ میں مارا کہ پشت کی طرف سے باہر نکل آیا۔ میں چکرا کر گری۔ مجھے نہیں پتا کہ پھر اس کے ساتھ کیا ہوا؟ مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ باقی بچوں کے ساتھ کیا ہوا؟

ہوش آیا تو ہر طرف لاشیں تھیں۔ بلکتے ہوئے نڈھال کچھ بوڑھے لوگ تھے یا میرے شوہر جو دیوانوں کی طرح زمین پر کبھی انگلیوں سے لکیریں کھینچتے، کبھی مٹی کی ڈھیریاں بناتے اور کبھی مٹی ہوا میں اُڑانے لگتے۔ وہ پاگل ہو گئے تھے۔ اُن کا دماغ اُلٹ گیا تھا۔ میں ہی شاید سخت جان تھی کہ مجھے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ نہ میں مری، نہ پاگل ہوئی۔ دوسروں نے بتایا کہ میرے شوہر چیختے رہے۔

خدا کے واسطے دیے، گرد مانگ کے واسطے دیے، گرو نانک کے واسطے دیے کہ بچوں کو چھوڑ دو، ان کی ماں مر جائے گی۔ مجھے مار دو، میری جان لے لو مگر وہ قہقہے لگاتے رہے۔ ایک کے بعد ایک بچے کو بڑے ہی ظالمانہ طریقے سے اذیتیں دے کر قتل کرتے رہے اور ترتیب سے پانچوں کی لاشیں برابر رکھ کر چل پڑے۔ جاتے جاتے کہہ گئے کہ ماں باپ کو اس لیے چھوڑ دیا تاکہ ان سب کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیں۔

مارنے والے جا چکے تھے۔ زندہ رہ جانے والوں نے میتوں پر مٹی ڈالی اور روتے ہوئے لرزتے قدموں سے آدھے سے بھی کم رہ جانے والا قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔ ہم کسی نہ کسی طرح والٹن کیمپ پہنچ گئے۔ میرے شوہر کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا۔ انھیں کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ کسی نے کھانا کھلا دیا تو کھا لیا، پانی پلا دیا تو پی لیا۔ بس چپ چاپ زمین پر بیٹھے مٹی سے کھیلتے رہتے۔ انھیں دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص کبھی بڑے عہدے پر رہا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد وہ ان تمام غموں سے آزاد ہو گئے جن کی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچے تھے۔

سال بھر تو میں ہر آنے والے قافلوں میں اپنے شناسا چہرے ڈھونڈتی پھری اور آخر ایک روز میرے بڑے بھائی مجھے مل گئے۔ ہم دونوں مل کر جتنا رو سکتے تھے روئے۔ گزر بسر کے لیے روزگار کی فکر ہوئی۔ ماضی میں اچھا وقت دیکھا تھا۔ خوشحالی اور ہر چیز کی فراوانی تھی اور اب تو پیٹ بھر روٹی مل جانا ہی غنیمت لگتا۔

میرا نصیب کہ سگے بھائی کا ساتھ بھی بہت کم عرصہ رہا۔ وہ بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔ میں پھر اکیلی رہ گئی۔ ...
جان اور ڈھیٹ ہوں۔ دیکھو آ...
شمار دکھ سہہ کر بھی مجھے کچھ...
دیا۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ لوگ...
طور پر میں اس کے لیے تیار بھی...

چند روز میں ڈری ڈری رہی کہ اب وقت مجھے نہ جانے اور کیا دکھانے والا ہے مگر اس گھر میں انسان نہیں فرشتے رہتے ہیں۔ گھر کی مالکہ میزبان حلیمہ بی بی نے اپنے بچوں کو بتایا کہ یہ تمہاری خالہ اور میری بڑی بہن ہیں۔ میرے ساتھ ان کا رویہ اور سلوک ایسا تھا کہ میں بھی سچ مچ خود کو ان بچوں کی خالہ سمجھنے لگی۔

آج جس کی شادی ہے وہ میری گود میں پل کر جوان ہوا۔ میں اپنے پانچ بچوں کو کھو کر آئی تھی، آج بھی میرے پانچ ہی بچے ہیں۔ پیدا حلیمہ بی بی کے یہاں ہوئے مگر پلے میری گود میں۔ آج یوں لگتا ہے اللہ نے مجھے امتحان میں سُرخرو کر دیا۔ میری گود پھر سے بھر دی مگر..... مگر..... میں بے بس ہو جاتی ہوں فاطمہ بیٹی۔

میں 19/اگست کا دن بھلا نہیں پاتی۔ یہ دن مجھ پر قیامت بن کر گزرتا ہے۔ دعا کرنا اللہ پاک مجھے صبر دے اور میں بھول جاؤں وہ دن۔ پھر خالہ اس طرح پھوٹ کر روئیں جیسے ان کے بچے آج ہی ان سے جُدا ہوئے ہوں۔ ◆◆◆

ہماری غفلت، قوم کی ہلاکت

آزادی کا حصول یقیناً ایک بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اس میں خداوند تعالیٰ کی رحمت و راہنمائی و مدد حاصل تھی۔ جس نے آزادی جیسی نعمت سے نوازا۔ اس میں خداوند تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہوگا۔ کل حصول آزادی پاکستان کی جدوجہد تھی اور آج تعمیر وطن کی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ آج پھر ہمیں تحریکِ آزادی پاکستان جیسے جذبے کی ضرورت ہے۔ ہمیں قومیتوں سے پھر ایک قوم بننا ہوگا۔ کہ ہم نے آج تک جو دانستہ یا نادانستہ غلطیاں کوتاہیاں کی ہیں، ان کا ازالہ کیسے کرنا ہے۔

حکمران یہ جان لیں اور ان کو سوچنا ہوگا کہ کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔ آزادی کے بعد آج تک کے سفر کو دیکھیں تو لگتا ہے کہ ہم آگے نہیں پیچھے کی جانب گامزن ہیں۔ 72 سال ہم نے غفلت کی نذر کر دیے ہیں۔ یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں جس کا خواب دیکھا گیا تھا اور جسے حاصل کرنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے بے شمار قربانیاں دے کر اسے آخر حاصل کر ہی لیا تھا۔ خداوند تعالیٰ نے پاکستان کو وسائل سے مالا مال کر رکھا ہے لیکن ہم نے اِن کو بروئے کار لانے کی بجائے ملک کو قرضوں کی دلدل میں مبتلا کر رکھا ہے۔

کیا قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ نے ایسے پاکستان کا خواب دیکھا تھا؟ تحریک آزادی کے دنوں میں قائداعظمؒ سے جب بھی سوال پوچھا جاتا تو وہ فرمایا کرتے کہ ہمیں خداوند تعالیٰ نے چودہ سو سال قبل قرآن کی شکل میں آئین اور دستور عطا فرما دیا ہے۔ یہی پاکستان کا آئین اور دستور ہوگا۔ ہمیں کسی اور دستور کی ضرورت نہیں۔ جس ملک کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ 72 سال گزر جانے پر بھی اسلامی جمہوری پاکستان کہلوانے کے قابل نہیں۔ پاکستان حاصل کرنے کے لیے جنہوں نے قربانیاں دیں ان کی نسلوں کو دو وقت کی روٹی کی فکر لاحق ہے۔

فسانۂ ہجرت

فریدہ عظیم

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

1947ء ..... یہ کیسا سال تھا جس نے زندگی الٹ پلٹ کر دی۔ وہ ملک جہاں پوری ایک صدی مسلمانوں نے حکومت کی۔ مسلمان جو پیدا ہی حکمرانی کے لیے ہوا وہ غلام بن جائے۔ زمانے بھر کی پھٹکار اس پر کہ وہ اغیار کی چاکری کرے اور ہندوستان کا مسلمان بلکہ پوری دنیا کے مسلمان کسی نہ کسی درجے میں انگریزوں کے غلام تھے۔ کچھ ملکوں کو جنگ کے ذریعے زیر کیا گیا اور کچھ کمزور سمجھ کر دبا لیے گئے۔ محکوم قوموں نے جب اپنی حالتوں پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ ہم ہی راستہ بھٹک گئے تھے۔ جہاد اور اجتہاد سے واسطہ نہیں رہا تھا۔

اس وقت مسلمانوں کے اندر چار بڑی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ لادینیت، منافقت، نفس پرستی اور انتشار۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف نام کہ مسلمان رہ گئے۔ جب اس پر غور کیا گیا تو بہت سے لوگ اصلاح کے لیے اُٹھے اور یہ دو دن کی کہانی نہیں۔ برسوں کی جدوجہد کے بعد یہ خطۂ زمین ہمیں حاصل ہوا۔ اس کی خاک میں بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور بہنوں کی چیخیں شامل ہیں۔ یہ لہولہو دھرتی جو انسانوں کی جانی، مالی، عزت وعصمت کی قربانی کے بعد حاصل ہوئی۔ یہ دھرتی کتنی قابل قدر ہے کہ ہم نے اسے جس نام پر حاصل کیا تھا کاش ہم وہ کر بھی لیتے۔ مگر ہم انھی چار بیماریوں کے ساتھ یہاں داخل ہوئے اور اس نوزائیدہ ملک کو لوٹنے کھسوٹنے میں لگ گئے۔

نوزائیدہ کو تو نگہداشت، توجہ اور سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی پرورش اور بڑھوتی کے لیے، قوت، وقت، رات اور دن کی قربانی اور اس پر مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر ہم نے اس معصوم کے بال و پر نوچ نوچ کر ادھ موا کر دیا۔ یہ کیسے پنپے؟ کیسے سانس لے؟ وہ قوت کہاں سے لائے جس پر وہ اپنی پوری ہمت کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔ یہی وجہ کہ وہ نہایت کمزور اور ناتواں بڑا ہوا اور پھر اس کی نسل در نسل بھی اس سے بھی گئی گزری حیثیت سے سانس لے رہی ہے۔

کاش ہم جان پاتے کہ غلامی کیا ہوتی ہے؟ دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ غلامی میں رہنے والی اقوام کبھی سر اُٹھا کر نہیں جی پاتیں۔ انھیں ہر وقت ڈر، خوف، اذیت سے واسطہ رہتا ہے۔ ہم جتنا شکر کریں کم ہے کہ ہم آزاد ہیں۔ ہم زندگی اپنی مرضی کے مطابق جینے کے عادی پیدا ہوئے مگر لادینیت کا شکار ہونے کی وجہ سے ناانصافی، ظلم اور حقوق کی پامالی آج بھی جوں کی توں موجود ہے۔ آج بھی انسانیت سسک بلک رہی ہے۔ میں جب اپنے گردوپیش پر نظر ڈالوں تو لگتا ہے کہ ہر انسان کی آنکھ میں آنسو، چہرے پر کرب اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہے۔

☆☆☆

1947ء سے وابستہ ایک خاندان جب اس سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اُمید، آس، تمنائیں اور خوشیوں کا منتظر رہتا

کاش ہم اب بھی غلامی کے مفہوم کو سمجھنے اور اس سے بچنے کے اہل ہو جائیں

ہیں۔ یہ گھرانا داتا پور سے آیا جو لکھ پتی تھے اور آج تین بہنیں اور دو بھائی اپنے والد کے ساتھ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں تو سر چھپانے کا کوئی آسرا نہیں۔ وہ جو گاڑیوں میں سفر کرتے اور گھوڑوں پر دوڑتے تھے، آج پیدل چل چل کر پیروں میں چھالے پڑ چکے تھے۔ چچازاد بھائی کے ساتھ کرائے پر گھر لے لیا۔ دو کمروں کے گھر میں تیرہ خواتین اور دس مرد تھے۔ بس گزارہ کرنا تھا۔ کھانا کیا تھا پتلی سی دال اور اُبلے چاول۔ بس یہی میسر آجائے تو شکر ادا کیا جاتا۔ ان کے شہزادوں جیسے بھائی، دو چوکیداری کرنے لگے اور ایک سینما میں ٹکٹ سیلر بن گیا۔ گھر کا دال دلیا چلنے لگا۔ سب سے چھوٹی بہن رابعہ کو دن رات کھانسی رہنے لگی۔ ڈاکٹر کو دکھانے پر پتا چلا کہ ٹی بی ہو چکی۔ سرکاری اسپتالوں کی دوا پر گزارہ تھا۔ وہ کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جارہی تھی مگر کہاں سے لائیں غذا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ لے دیتے۔

اُن دنوں بڑے بھیا عبدالمعز تقریباً 18 سال کے ہوں گے۔ ان سے چھوٹے عبدالمحب 15 سال، پھر بہن تھی جن کا نام مہتاب اور پھر اس کے بعد، زریاب اور بھائی محمد معاذ اور منی سی فریال جو دن رات بیمار تھی۔ تینوں بھائی مل کر گھر چلا رہے تھے۔ والد جدی پشتی نواب تھے سو انھیں کوئی کام کرنا آتا ہی نہ تھا۔ دُکھ اور صدمے نے ان کی ساری دماغی صلاحیتوں کو کھا لیا تھا۔ اکثر وہ مزاروں پر پائے جاتے۔ پھر یوں ہوا کہ وہ لاپتا ہو گئے۔ نئی جگہ، نیا ملک، کہاں ڈھونڈیں؟ ذرائع بھی کم، سورو پیٹ، صبر کر کے بیٹھ گئے۔

بہت سوچ سمجھ کر بڑے بھیا کی ایک نیک سیرت لڑکی سے شادی کر دی گئی اور یوں وہ دو بیٹیوں کے باپ بن گئے۔

مہتاب کی شادی کی سب کو فکر تھی کہ کہاں اور کس سے کریں؟ جان نہ پہچان۔ اب ان کی عمر تقریباً 25 سال ہو چکی تھی اور اس زمانے میں پچیس کا ہو کے کنوارے رہنا بہت ہی معیوب بات تھی۔ ہر ایرا غیرا باتیں بناتا کہ غیر شادی شدہ بہنیں گھر بٹھا رکھی ہیں۔ چچازاد بھائی کی بیوی، تین بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں تو سب کی نظر مہتاب پر آ کر ٹکی اور بھائی بھی تقریباً راضی تھے۔ کوئی بڑا نہیں۔ کون ان کی سرپرستی کرے گا؟ بہن کو سمجھایا بجھایا کہ اپنے ہیں۔ بچوں کی سرپرستی کرو گی تو بہت اجر ملے گا۔

مہتاب کو لگا غلامی کے بعد آزادی ملی تھی، اب پھر غلامی ایک شوہر اور پانچ بچوں کی۔

شادی ہوئی تو مہتاب کے اندیشے دم توڑ گئے۔ شوہر بہت مددگار اور حقوق ادا کرنے والے تھے مگر بچے ایک آزمائش۔ مہتاب نے حوصلہ نہ ہارا۔ ان کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ سب سے چھوٹی بیٹی سمیحہ محض دو سال کی ہی تھی۔ اسے اچھا پہناتیں اوڑھاتیں تو وہ گڑیا سی لگتی۔ ہر جگہ ساتھ رکھتیں اور میری بیٹی کہہ کر متعارف کرواتیں۔ یوں کئی برس ذمہ داریاں نبھاتے گزر گئے۔ اللہ نے ایک بیٹی اور ایک بیٹے سے نوازا۔ وہ انھیں بہت پیار کرتی تھی۔ اچانک بچوں کی دادی بیمار ہوئیں تو گھر میں ایک ہلچل مچ گئی۔ انھیں فالج ہو گیا تھا۔ سات بچے اور بیمار ساس۔ کچھ کام بڑی بیٹی سارہ کو سکھا دیا۔ وہ ہاتھ بٹاتی اور چھوٹی سمیحہ کے ذمہ دادی کا کھانا پینا۔ دوا وغیرہ دینا اس کے ذمہ تھا۔ مہتاب باقی سارے کام ساس کے خود کرتیں۔ ساس تین سال بیمار رہ کر چل بسیں۔ بہت بڑی آزمائش تھی جو مہتاب نے بڑی حکمت عملی سے نبھائی۔ ابھی سانس بحال بھی نہیں ہوا تھا کہ سمیحہ کو بخار رہنے لگا۔ سانس اُکھڑ جاتا تو راتوں کو سو نہ پاتی۔ سمیحہ کی بیماری نے مہتاب کو ادھ موا کر دیا۔ بچی خود ہمت والی تھی۔ جب ذرا ٹھیک ہوتی تو کچھ نہ کچھ ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی۔

سمیحہ کا علاج فیملی ڈاکٹر سے ہوتا تھا۔ کبھی کبھار سمیحہ اکیلی

بھی چیک اپ کروانے چلی جاتی۔ ایسے ہی ایک دن وہ اس خیال سے کہ ماں مصروف ہیں سامنے ہی تو ڈاکٹر صاحب ہیں میں ابھی دوا لکھوا آتی ہوں، آج تو سانس قابو میں ہی نہیں، خود ہی چلی گئی۔

ڈاکٹر نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''گھر کے کام کرتی ہو؟''

''جی کرتی ہوں۔ جب ٹھیک ہوتی ہوں۔''

''تمھاری امی کو تمھارا خیال رکھنا چاہیے۔ تمھیں سانس کا مسئلہ ہے۔ اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔''

سمیحہ نے کہا: ''امی تو فوت ہو چکیں۔ آنٹی ہیں، وہ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔''

''آنٹی کون؟ سوتیلی امی؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی۔'' سمیحہ نے جواب دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''آپ شام کو اپنے ابو کو میرے پاس بھیجنا۔'' سمیحہ نے نا سمجھی میں 'جی ٹھیک ہے' کہہ دیا اور گھر آ گئی۔ وہ معصوم نہیں جانتی تھی کہ کیا طوفان آنے والا ہے۔

شام کو والد کو ڈاکٹر کے پاس بھیجا تو انھوں نے چھوٹتے ہی کہا:

''حد ہو گئی نظیر صاحب! آپ کو اپنے بچوں کا ذرا خیال نہیں۔ ماں تو سوتیلی ہے مگر آپ تو سگے باپ ہیں۔ بچی بیماری کی حالت میں بھی کام کرتی ہے۔ آپ کے پاس اتنا بھی وقت نہیں کہ اپنے بچوں کی خبر گیری کر لیں۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب! میری بیوی بہت اچھی ہے۔ وہ سب کا خیال رکھتی ہے۔''

''جائیے جائیے نظیر صاحب! دوسری بیوی کے چکر میں انسان اپنی ہی اولاد کے حقوق پورے نہیں کرتا۔''

ڈاکٹر کی لعنت ملامت نے نظیر صاحب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ''میں تو واقعی صبح کا گیا، شام کو آتا ہوں۔ مجھے کیا علم کہ گھر

میں کیا ہو رہا ہے؟ بچوں نے بھی کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔

کیا شکایت کرتے؟ کس سے کرتے؟

میرے پاس تو ان کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں کہ انھیں دوسری ماں سے کوئی شکوہ تو نہیں؟ بن ماں کے بچے تو ڈرے سہمے ہی رہتے ہیں۔''

راستے بھر ان کے دماغ میں سوال و جواب ہوتے رہے۔ واقعی سوتیلی ماں سگی ماں کیسے بن سکتی ہے؟ میری گلاب سی بیٹی کیسی مرجھا سی گئی۔ انھیں بیوی پر غصہ آنے لگا۔ حد ہو گئی بے انصافی کی۔ میں نے تو مہتاب کا ہر طرح خیال رکھا پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ گھر پہنچے تو بیوی لپکتی ہوئی قریب آئیں۔

''آپ آ گئے؟''

''ہاں آ گیا۔ حد ہو گئی مہتاب۔ سمیحہ اتنی شدید بیمار ہے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔ بس یہی کہتی رہیں کہ کھانسی، نزلہ کی وجہ سے سینہ جکڑ گیا ہے، دوا دلوا رہی ہوں۔ اُوپر سے گھر کا کام بھی لیتی رہیں۔ کیسی ظالم عورت ہو تم۔ آخر ہو نا سوتیلی ماں۔ تمھیں کیسے درد محسوس ہوتا کہ ممتا کیا ہوتی ہے؟''

مہتاب منہ کھولے حیران پریشان ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔ دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔

'ہو نا سوتیلی ماں...... ہو نا سوتیلی ماں۔'

اوہ خدایا! میں نے اپنی زندگی تج دی ان بچوں کے لیے۔ کہاں خطا ہوئی مجھ سے؟ کیا کیا ہے میں نے؟ دل میں اُٹھتے سوالوں کو وہ زبان پر لے آئیں۔

''سنیں! مجھے بتائیں تو صحیح مجھ سے کہاں چوک ہوئی؟''

وہ میاں کی طرف دوڑیں۔

''بس رک جاؤ۔ مجھ سے بات کرنا نہ ہمارا کوئی کام کرنا۔ جب کام ان بچوں نے ہی کرنا ہے تو تمھاری ضرورت نہیں ہمیں۔ اپنے لیے خود کھا پکا لینا۔'' نظیر صاحب دھاڑے۔

مہتاب کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا مگر اب بھی یہی سوچے جا رہی تھیں شاید کوئی بڑی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ غصہ کچھ کم ہو تو بات کروں گی۔ گھر میں سناٹا چھا گیا تھا۔ رات کے کھانے پر انھیں کوئی پوچھنے بھی نہ آیا تو صدمہ شدید ہونا شروع ہوگیا۔ دونوں بچوں نے تو بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر کھالیا تھا۔

صبح تک دماغ پھٹنے کے قریب ہوگیا۔ وہ اُٹھیں کہ چائے بنا کر پی لوں۔ باورچی خانے میں بڑی بیٹی سارہ ناشتہ بنا رہی تھی۔ بچی نے حال پوچھا اور نہ توجہ دی۔

''کیا بات ہے بیٹی؟ تم مجھ سے بول کیوں نہیں رہیں؟''

''ابو نے منع کیا ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ وہ ہکا بکا بچی کا منہ دیکھتی رہیں اور لرزتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف لوٹ آئی۔

''میرا خیال ہے کہ میں گھر جاؤں۔'' انھیں میکے کی یاد آئی۔ میکہ کچھ دور نہ تھا۔ آنا جانا لگا رہتا۔ گھر گئیں تو چائے بسکٹ سے تواضع ہوئی۔ دماغ کو کچھ سکون ملا۔ کل رات سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ اپنے دل کا حال دل میں ہی لیے واپس آ گئیں۔ بازار سے حلیم اور نان منگا کر کھا لیا۔ شاید ان بچوں میں سے کسی کو میرا خیال آ جائے سمجھ کو ہی۔ وہ تو دو سال کی تھی جب میں یہاں آئی تھی۔ اُسے بولنا، چلنا سب کچھ میں نے ہی تو سکھایا۔ راتوں کو جاگی۔ میں بھی کیا سوچنے لگی نیکی کی تھی اب جتانا کیسا؟ بچے ہیں، خیر ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔

میاں اپنا بوریہ بستر اُٹھا کر بچوں کے کمرے میں لے گئے تھے۔

''کیسے مناؤں؟ معافی مانگوں، ناکردہ گناہوں کی۔ نظر آئیں تو کچھ کہوں۔ نجانے کب آتے اور کب چلے جاتے ہیں۔ کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا۔ کیا شناسائی بھی ختم ہو چکی؟''

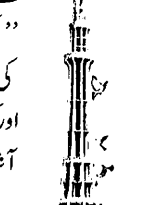

بازار کا کھانا کھا کر بلڈ پریشر انتہائی بلندی پر تھا مگر انھیں اپنی پروا کب تھی؟ بچی کا ہاتھ پکڑ کر میکے کی طرف دوڑیں کہ شاید کچھ دل بہل جائے۔ سب گھر والوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک بائیں طرف لڑھک گئیں۔ منہ ٹیڑھا ہوگیا، زبان تتلانے لگی۔ بھاگم بھاگ اسپتال پہنچے۔ اب جو تشخیص سامنے آئی وہ یہ کہ زبردست فالج کا اٹیک دماغ پر ہوا ہے۔ بے ہوشی ایسی طاری ہوئی کہ دوبارہ آنکھ نہ کھلی۔

مہتاب دنیا سے چلی گئیں۔ یوں وہ ایک بار پھر غلامی سے آزاد ہوگئیں۔ اس غلامی سے جس میں مشقت ہی مشقت تھی۔ اتنی خدمتوں پر بھی وہ غلام ہی رہیں۔ کوئی بھی ان کا نہ ہوا۔ کیا واقعی انسان آزاد پیدا ہوا ہے؟

نہیں وہ صرف اللہ کا غلام ہے۔ باقی تمام دنیا کے لیے وہ آزاد انسان ہے۔

ہاں! البتہ یہ معاشرہ آقاؤں کی کھیپ جنم دیتا رہتا ہے۔ کہیں باپ اور بھائی بن کر، کہیں شوہر اور بیٹا بن کر، کہیں سربراہ اور عوام بن کر، زمیندار اور کمی بن کر۔ آقاؤں اور غلاموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ آج بھی ظلم و ناانصافی اسی طرح موجود ہے جس طرح زمانہ جاہلیت میں تھی۔

افراد کے مجموعے کا نام قوم ہے اور قوموں کا زوال اور عروج ان کے اخلاق پر۔ ساری طاقتیں چاہے تھوڑی ہوں مگر اخلاق میں برتر لوگ ہی فتح یاب ہوتے ہیں۔

مہتاب کی خاموشی اور اس کے اخلاق نے شوہر اور بچوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ شوہر ہونے کا گھمنڈ خاک میں مل گیا۔ لوگوں کے طعنے اور باتیں جگر چھلنی کرتے ہیں۔ بداخلاق شوہر اور بچوں کا مقدمہ ضرور پیش ہوگا۔ عدالت میں انصاف کیا جائے گا۔ مہتاب سرخرو ہوگی اور باقی اپنا ٹھکانہ سوچ لیں کہ کیا ہوگا؟

◆◆◆

فسانۂ ہجرت

تحسین گُل

خطِ بے نشاں

پیارے بھیا ظفر! السلام علیکم۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ بھیا بہت لاچار ہو کر یہ خط تحریر کر رہی ہوں۔ جانتی ہوں تم بہت بڑے افسر ہو۔ بہت کام ہوتے ہوں گے مگر کیا کروں؟ اس مجبوری کے عالم میں اللہ کے بعد صرف تم ہی دِکھتے ہو۔ ہجرت کا دُکھ تو تم بھی جانتے ہو بھائی مگر میرے لیے تو آزمائش ہی آزمائش ہے۔ وہ عورت جس نے دلی میں آسمان اپنی چھت کے سوا کہیں نہ دیکھا ہو آج کھلے آسمان تلے پڑی ہے۔ اپنی تو گزر رہی چکی مگر بھائی دو جوان لڑکیوں کا ساتھ ہے۔ بے شک اپنا وطن اپنے لوگ ہیں اور بہت اچھے لوگ ہیں مگر عورت تو چھپانے کی چیز ہے نا۔ میں ان لڑکیوں کو لے کر ایک جھگی میں کھلے آسمان تلے پڑی ہوں۔

تم بڑے افسر ہو۔ کہیں سے کہہ سن کر ایک کمرے کا مکان دلا دو۔ تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔ میرے پاس دلی والی حویلی کے کلیم کے کاغذات ہیں۔ ان کے بدلے مکان دلا دو۔ بے شک ایک کمرے کا ہو مگر رات کو جس کا کواڑ بند کر کے اطمینان سے سو سکوں۔ رات ان بچیوں کی پہرہ داری میں گزرتی ہے۔ ہوا کے کھٹکے سے بھی ڈر جاتی ہوں۔ ان کا باپ زندہ ہوتا تو تمہیں کبھی تکلیف نہ دیتی بھائی۔ تمہارا خون، تمہاری چچازاد بہن ہوں۔ اپنی بہن کی آبرو رکھ لینا۔

تمہاری بہن ماجدہ۔

۱۸ اگست ۱۹۵۶ء

محلہ امر پورہ، راولپنڈی، پاکستان۔

☆☆☆

جس کی منزل نہ گھر تھا نہ کوئی انساں، آخر وہ وہیں پہنچا جہاں اُسے جانا تھا

یہ خط پڑھ کر میں گم صم رہ گیا۔ نجانے وہ عورت کون تھی؟ کتنی لاچار تھی؟ اور ظفر صاحب کون تھے؟ ان تمام سوالات کے جوابات دادا جان کو ہی پتہ ہوں گے۔ قصہ یوں تھا کہ بی اے کے امتحانات کے بعد آج کل فراغت تھی۔ دادا جان کی لائبریری میں وقت گزارنے کے لیے کتابیں تلاش کر رہا تھا کہ قدرت اللہ شہاب کی شہاب نامہ ہاتھ میں آ گئی۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک بوسیدہ سا کاغذ ہاتھ میں آیا جو پلاسٹک کے کور میں لپٹا ہوا تھا۔ یہ کسی ماجدہ نامی خاتون کا خط تھا جو ظفر صاحب کے نام تھا۔ یہ کیا معمہ تھا؟ راولپنڈی سے لکھا خط لاہور میں کیا کر رہا تھا؟ ان تمام باتوں کا جواب دادا جان سے ہی مل سکتا تھا۔ شام کو دسترخوان پر دادا جان سے ملاقات ہوئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ وقت لائبریری میں گزارتے تھے۔ میں بھی ان کے پاس لائبریری چلا گیا۔

''ہاں برخوردار! آج کون سی کتاب پڑھی؟'' دادا جان نے سوال کیا:

''میں نے شہاب نامہ ان کے سامنے کر دیا۔ دیکھ کر مسکرائے اور بولے، ''ہاں بہت اعلیٰ کتاب ہے مگر شرط ہے کہ اس کو اوّل تا آخر پڑھنا۔''

میں نے کتاب کھول کر خط ان کے سامنے کیا اور پوچھا:

''دادا جان یہ کیا ہے؟'' خط دیکھ کر دادا جان چونک اُٹھے۔ میرے ہاتھ سے خط لیا اور بولے، ''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟'' میں نے کتاب ان کے سامنے کر دی اور بولا:

''اس کتاب میں تھا۔'' دادا جان نے ایک گہری سانس لی اور کرسی سے ٹیک لگا لی۔ میں نے پوچھا:

''دادا جان یہ کیا قصہ ہے؟ یہ خاتون کون تھیں؟ اور ظفر صاحب کون تھے یا ہیں؟'' دادا جان بولے:

''بیٹا راحیل! یہ ایک لمبی اور عجیب سی داستان ہے۔ ظفر صاحب میرے افسر تھے۔ جب پاکستان بنا تو میں نوجوان تھا۔ ظفر صاحب انھی دِنوں دلی سے تبادلہ ہو کر لاہور ٹرانسفر ہوئے تھے۔ جو مہاجرین اپنی جائیدادیں ہندوستان چھوڑ کر آئے تھے، ان کے بدلے یہاں ان کو مکانات الاٹ کرتے تھے۔ میں ان کا پی اے تھا، قاصد بھی اور معاون بھی۔ بے سروسامانی کا عالم تھا مگر قائداعظمؒ کے قول کے مطابق کام کام اور کام پر برابر عمل ہو رہا تھا۔ ایک ایک شخص نے دو، دو تین تین ڈیوٹیاں سنبھالی تھیں۔ دن رات ایک ہی دھن تھی کہ اپنے نوزائیدہ ملک کو پاؤں پر کھڑا کرنا ہے۔

مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ سب سے گمبھیر تھا۔ دن رات کا ہوش نہ تھا۔ مہاجرین کی کہانیاں سُن کر افسر دھاڑیں مار مار کر روتے۔ تمہاری دادی جان کا میکہ راولپنڈی کے محلہ امر پورہ میں تھا۔ وہ وہاں کے مقامی رہائشی تھے۔ انھیں ہجرت کے دنوں میں ہی میں نے راولپنڈی ان کے والدین کے پاس بھجوا دیا تھا اور خود لاہور میں ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔

قریباً ایک برس تو میں اپنے کام میں بے پناہ مصروف رہا۔ تمہاری دادی جان سے خط و کتابت ہوتی رہی مگر ان کے پاس نہ جا سکا۔ ایک برس بعد ظفر صاحب نے زبردستی کچھ دن کی چھٹی دی اور میں راولپنڈی چلا گیا۔ اپنے بیوی بچوں سے مِلا۔ تمہاری دادی کے والدین نے کہا کہ ابھی ان کی بیٹی کو ان کے پاس ہی رہنے دوں۔ حالات بہتر ہوتے ہی مکان کا بندوبست کر لوں تو پھر انھیں لے جاؤں۔ میں نے بھی یہی بہتر خیال کیا۔ بہرحال چھٹی کے بعد لاہور جا کر میں نے مکان تلاش کیا اور بیوی بچوں کو پاس بلا لیا۔ تمہاری دادی جان کا سال دو سال میں ایک چکر راولپنڈی کا ضرور لگتا تھا۔ اسی وجہ

سے میری بھی راولپنڈی سے کافی شناسائی ہو چکی تھی۔

یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ گرمیوں میں تمہاری دادی جان راولپنڈی گئیں۔ دو ماہ بعد میں انھیں لینے گیا تو انھوں نے مجھ سے انھی ماجدہ نامی خاتون کا ذکر کیا۔ وہ تمہاری دادی کے والدین کے گھر اُوپر کے کام کاج کیا کرتی تھیں۔ یہ خاتون ہجرت کر کے آئی تھیں۔ دلی میں بہت اچھے حالوں میں تھیں۔ مگر یہاں بے سروسامانی کی حالت تھی۔ میاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک جھونپڑی میں دو لڑکیوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کے ایک چچازاد بھائی ظفر صاحب بڑے افسر تھے جو لاہور میں تھے اور مہاجرین کو مکان الاٹ کراتے تھے۔ تمہاری دادی جان کے ساتھ باتوں باتوں میں ذکر ہوا تو پتا چلا کہ میں انھی ظفر صاحب کا پی اے ہوں تو انھوں نے میری بیگم سے سفارش کی اور یہ خط تحریر کر کے دیا کہ میں ظفر صاحب کو دے دوں پر خط لے کر میں لاہور واپس آ گیا۔ لاہور کے دوسرے دن ایک بہت بڑا حادثہ رُونما ہو گیا۔

وہ کیا؟ میں نے ساختہ پوچھا:

دادا جان نے دُکھ بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور گھٹی ہوئی آواز میں بولے:

''ظفر صاحب کا انتقال ہو گیا۔'' ظفر صاحب کا انتقال ہو گیا؟ کیسے میں نے کرسی سے اُچھلتے ہوئے پوچھا؟

''رات کو نماز پڑھ کر سوئے۔ صبح وقت پر نہ اُٹھے۔ گھر والوں نے جگانا چاہا تو پتا چلا کہ رات کے آخری پہر نیند میں ہی وفات پا چکے تھے۔''

''اوہ!'' میں گہری سانس لی۔ ''پھر اس خط کا کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا بیٹا۔'' دادا جان بولے۔ ''نیا آنے والا افسر بہت سخت اور بدزبان تھا اور ماجدہ خاتون کا بھائی بھی نہ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے دبے لفظوں میں اتنا کہا کہ میری ایک دور (پار کی جاننے) والی ہیں اور ظفر صاحب کی بہن ہیں۔ ان کا یہ

مسئلہ ہے۔ لاٹ صاحب بولے، ''نجانے کہاں کہاں سے اُٹھ کر آ جاتے ہیں کہ مکان الاٹ کروا دو۔ ویسے بھی میں یہاں کام کرتا ہوں۔ راولپنڈی سے میرا کیا واسطہ؟'' ان کا جواب سن کر میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا مگر کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

اگلے برس تمہاری دادی جان راولپنڈی گئیں تو ایک (اندوہناک) خبر لائیں۔ ان خاتون کی جھگی میں آگ لگ گئی تھی۔ اس آگ میں وہ خاتون خود اور ان کی ایک لڑکی جاں بحق ہو گئی۔ دوسری لڑکی نجانے کہاں چلی گئی۔ یہ خط میں پھینک نہ سکا اور اسے محفوظ کر کے رکھ لیا۔ کبھی کبھی نکال کر پڑھتا ہوں تو دل پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔ اللہ جانے ان خاتون کی آزمائش تھی؟ یا اللہ نے مجھے اس نیکی سے محروم رکھنا تھا؟ کبھی کبھی سوچتا ہوں ایسا کیوں ہوا؟ اگر میں ان خاتون کے کام نہ آ سکا تو اللہ نے یہ خط میرے پاس کیوں بھجوایا؟ میں یہ خط ضائع کیوں نہ کر سکا۔ نجانے ان کی لڑکی اب کہاں اور کس حال میں ہو گی۔ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ کبھی کبھی میری روح تڑپ جاتی ہے۔ میں کیا کروں؟ خط نکال کر پڑھ لیتا ہوں اور اپنی لاچاری پر کفِ افسوس ملتا ہوں؟ دادا جان کی باتیں سن کر میرا دل بھی اداس ہو گیا اور میں چپ چاپ اُٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

اگلے دن صبح ناشتے پر دادا جان سے میں نے پھر اس خط کی بات کی۔ دادا جان مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے:

''کیوں راحیل میاں! تم اتنے بے چین کیوں ہو؟'' میں نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔ چائے کا گھونٹ بھر کر پیالی میز پر رکھی اور سوچتے ہوئے بولا! ''دادا جان امانت کا بوجھ بہت بڑا ہوتا ہے۔ آپ بچپن سے مجھے یہ بات کہتے تھے۔ مجھ پر اللہ کا شکر ہے کہ کبھی اتنا بڑا بوجھ پڑا تو نہیں مگر آپ کے الفاظ میرے لاشعور میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ میں کوشش

کرتا ہوں کہ کبھی کسی امانت کا پاسدار نہ بنوں کیونکہ مجھے اس بوجھ سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ میری ساری رات یہی سوچتے گزری کہ آپ نے اتنے برسوں اس امانت کا بوجھ کیسے اُٹھایا ہوگا؟ کیا آپ کا یہ بوجھ اُتار نہ دیا جائے؟''

''کیا مطلب؟'' دادا جان بولے:

''میرا مطلب یہ ہے دادا جان ہم راولپنڈی جا کر ان خاتون کی بیٹی کو تلاش کرتے ہیں اور اگر وہ کسی مدد کی طلب گار ہیں تو ان کی مدد کر دیں اور آپ اپنے بوجھ سے آزاد ہو سکے گے۔''

میری بات سن کر دادا جان اُداس سی ہنسی ہنس دیے اور بولے:

''بیٹا میں جب ملازمت کرتا تھا تو راولپنڈی جا کر ان کو تلاش کرنے کی کافی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اب ان بوڑھی ہڈیوں کو کہاں گھسیٹوں گا؟''

''ارے دادا جان آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں نے دادا جان کے گھٹنے دباتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ میں آپ کی مدد کروں گا۔ ویسے بھی میں یہاں بے کار پڑا رہتا ہوں۔ اسی بہانے راولپنڈی کی سیر بھی ہو جائے گی اور شاید نیکی بھی۔'' دادا جان نے سوچتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولے:

''بیٹا اس بڑھاپے میں، مَیں اپنے دل پر مزید بوجھ نہیں لادنا چاہتا۔ اگر میں بھی ناکام ہوا تو بہت (برداشتہ) ہوں گا۔''

''ارے نہیں دادا جان! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ارادے اگر نیک ہوں تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔'' میری بات سن کر دادا جان بولے:

''چلو ایک امتحان اور سہی۔ تم جانے کہاں بندوبست کرو۔ دیکھو اللہ کیا کرتا ہے۔''

چار دن بعد ہم نے راولپنڈی کا قصد کیا۔ دادی جان کے دُور پار کے رشتہ دار ابھی بھی اسی علاقے میں رہائش پزیر تھے لہٰذا ہمیں رہائش کا مسئلہ ہرگز نہ تھا۔ راولپنڈی جانے کے ایک دو دن تو ہم نے رشتہ داروں سے ملاقاتوں میں گزارے۔ تیسرے دن میں ایک جگہ کا پتا لے کر نکل گیا۔ گلیوں گلیوں گھومتا رہا۔ شام کو گھر گیا۔ دادا جان سے ملاقات ہوئی تو انھیں بتایا کہ جس جگہ جھگی تھی وہاں پر اب مکانات تعمیر ہیں۔ آپ کل میرے ساتھ چلیے گا، شاید کوئی پرانا محلہ دار ہو تو ان سے ملاقات ہو سکے۔

اگلے دن ناشتے کے بعد ہم اس جگہ پہنچے۔ دادا جان نے وہاں ایک پرانے سے گھر پر دستک دی۔ ایک جواں سال لڑکا باہر نکلا۔ دادا جان نے اس سے پوچھا: ''یہاں حاجی محمد علی صاحب ہوتے تھے جو مسجد کے پیش امام تھے۔ لڑکا بولا:

''جی ہاں وہ میرے دادا جان تھے۔''

''دادا جان 'تھے'؟ مطلب؟''

لڑکا بولا: ''جی دو برس قبل ان کا انتقال ہو چکا۔''

''اوہ بہت افسوس ہوا۔ بیٹا دراصل میں ان کا دوست ہوں۔ لاہور میں ہوتا ہوں، ان سے ملنے آیا تھا۔ لڑکا بولا:

''آپ اندر آیئے۔ میرے والد صاحب گھر پر ہیں۔ وہ آپ کو جانتے ہوں گے۔ آپ تشریف لایئے۔ وہ ہمیں اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ ایک پچاس پچپن سالہ شخص اندر آیا۔ دادا جان نے اُسے بتایا کہ وہ محمد علی صاحب کے دوست ہیں۔ وہ شخص بولا: ''معذرت میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔''

دادا جان نے انھیں دادی اماں کے رشتہ داروں کا حوالہ دیا تو وہ فوراً بولا:

''جی جی میں انھیں جانتا ہوں۔ کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

دادا جان نے انھیں ماجدہ نامی خاتون کے بارے میں بتایا اور سوال کیا کہ آپ انھیں جانتے تھے؟ وہ شخص بولا: ''جی

ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہم چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان کی جھگی میں بہت بری طرح آگ لگی تھی۔ ان کی ایک صاحبزادی محفوظ رہ گئی تھیں۔ انھیں دارالامان والے لے گئے تھے۔''

''دارالامان؟'' دادجان بے چینی سے بولے:

''جی ہاں! دراصل جب یہ حادثہ ہوا تو کچھ عرصہ تک محلے کے لوگوں نے اس لڑکی کو پناہ دی اور ایک غریب سا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کر دی مگر بدقسمتی سے سال بعد وہ عورت بیوہ ہوگئی۔ اولاد تھی نہیں۔ مکان بھی کرائے کا تھا، بے چاری عورت بے گھر ہوگئی۔ پھر سنا کہ یہاں ایک بچوں کا ادارہ ہے وہ وہاں کام کرنے لگیں اور اِدھر ہی ادارے والوں نے رہائش دے دی۔ اب کہاں ہیں جانے کیا خبر؟''

دادا جان نے پوچھا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ ادارہ کہاں ہے؟ اب ہے بھی یا نہیں؟

''جی جی بالکل! وہ ادارہ بالکل ہے۔ آپ کوہاٹی بازار چلے جائیں۔ وہاں آپ کو قندیل نام کا ادارہ ملے گا۔ وہاں سے آپ کو معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ میرا بیٹا آپ کے ساتھ چلا جائے گا۔''

دادا جان ایک دم سے اُٹھے اور بولے:

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ہم ابھی جانا چاہیں گے۔''

ان صاحب نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ لڑکے نے گاڑی نکالی اور ہمیں لے کر کوہاٹی بازار کی طرف روانہ ہوا۔ دادا جان اور میں بالکل خاموش تھے۔ بار بار دادا جان میری طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میرا دل بھی دھک دھک کر رہا تھا۔ نجانے قسمت اپنی پٹاری سے کیا نکالے؟ ہم دونوں بات کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ دادا جان کا تو پتہ نہیں مگر مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں پُل صراط پر چل رہا ہوں۔ نجانے منزل کہاں لے جائے؟ دل ہی دل میں التجا رب سے کر رہا تھا کہ یارب سرخرو کر دینا۔

بہرحال ہم ادارے کے دفتر میں داخل ہوئے تو صدارت کی کرسی پر ایک ستر سالہ شخص کو براجمان دیکھا۔ بسم اللہ تو اچھی ہو گئی۔ میں نے دل میں کہا۔ یہ شخص اتنی عمر کے ہیں، یقیناً علم رکھتے ہوں گے۔ اندر داخل ہونے کے بعد ہم دونوں نے اپنا تعارف کروایا اور انھیں تمام تفصیل بتائی کہ قریباً چالیس برس پہلے ایک خاتون ان حالوں میں آپ تک آئیں تھیں۔ شومئ قسمت ہم ان کا نام نہ جانتے تھے۔ چیئرمین صاحب بولے:

''ارے جناب آپ جو واقعات بتا رہے ہیں وہ سو فیصد حالات آپا سعیدہ کے ہیں۔''

''آپا سعیدہ۔'' دادا جان مدھم سی آواز میں بولے۔

''جی صاحب! وہ بے چاری بالکل اکیلی تھیں۔ والدہ اور بہن پہلے ہی حادثے میں انتقال کر گئیں۔ بیوہ ہونے کے بعد انھوں نے ساری عمر ہمارے ادارے میں گزار دی۔''

دادا جان بولے، ''آپ ہماری ان سے ملاقات کروا سکتے ہیں؟''

وہ صاحب بولے، ''دراصل کل رات آپا سعیدہ کو فالج کا حملہ ہوگیا اور وہ اسپتال داخل ہیں۔ میں آپ کو اسپتال لے جا سکتا ہوں، مگر آپ یہ فرمائیے کہ آپ ان کے لگتے کیا ہیں؟''

دادا جان بولے: ''آپ مجھے ان کے پاس لے جائیں۔ میں آپ کو سب بتا دوں گا۔ میں انھیں چالیس برس سے تلاش کر رہا ہوں۔ براہ مہربانی آپ میری ان سے ملاقات کروا دیں۔ مجھے ان کا عزیز ہی سمجھیے۔''

''چلیے صاحب میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں۔'' ابھی ہم اُٹھنے کا قصد کر ہی رہے تھے کہ ایک ٹیلی فون آیا۔ چیئرمین صاحب نے رسیور اُٹھایا..... اناللہ وانا الیہ راجعون کہہ کر چونگا رکھ دیا۔ دکھ بھری نظروں سے دادا جان کو دیکھا اور بولے: ''سعدیہ آپا کا انتقال ہوگیا۔''

ان کی بات سن کر دادا جان آہستہ سے بولے:

''سارا سفر رائیگاں گیا۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ ایک دم میں نے دادا جان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور چیئرمین صاحب سے کہا:

''جناب آپا سعیدہ کی قبر اور کفن کا تمام انتظام ہم کریں گے۔ ہمیں اس کی اجازت ہوگی؟ وہ بولے جی ہاں اگر آپ ان کے عزیز ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر ایک رسمی کاغذی کارروائی بھی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے جناب ہم قبر کا انتظام کرتے ہیں۔'' دادا جان کو وہیں بٹھا کر میں قبر کا انتظام کروانے چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد واپسی ہوئی پھر میت کو اسپتال سے لایا گیا اور غسل دلوایا۔ اس کام میں شام کے چار بج گئے۔ قبرستان میں میت جب دفن کی جانے لگی تو دادا جان نے کہا:

''بیٹا وہ خط بھی قبر میں ڈال دینا۔''

'وہ کیوں دادا جان؟'' میں نے دادا جان سے پوچھا:

دادا جان بولے: چالیس سال پرانا سوال حل ہو گیا۔ آج مجھے میری خلش سے نجات مل گئی۔ میں سوچتا تھا کہ یہ خط میرے پاس کیوں آیا؟ ظفر صاحب تک کیوں نہ پہنچ سکا؟ میری ساری عمر اسی سوال کو کھوجتی رہی۔ اس کا جواب میرے پاس ہی تھا۔ خط تو اپنی منزل تک پہنچ چکا تھا مگر میں انجان ساری عمر اسی دکھ میں مبتلا رہا کہ خط اپنی منزل نہ پا سکا۔ بے چاری ماجدہ ایک مکان کے لیے عمر بھر سرگرداں رہی۔ وہ اینٹ سیمنٹ مٹی کا بنا مکان نہ تھا۔ اصل مکان تو یہ قبر ہے۔ آج خط اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ میں دراصل امانتدار تھا اور حکم یہی تھا کہ اُس مکان کے مکین کو اس تک پہنچا دوں۔ دادا جان نے قبر کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ راحیل بیٹا تمہارا بھی شکریہ۔ تمہاری وجہ سے میں آج اس خلش سے آزاد ہو گیا۔ چالیس سال تک نہ پہنچنے والا خط اپنے مکتوب الیہ کے ساتھ اصل منزل کو پہنچ گیا۔ دادا جان نے گہری سانس لی اور ہم دونوں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ ♦♦♦

مسلمان......خود اپنے دشمن

برصغیر پاک و ہند پر مسلمانوں نے ایک ہزار سال حکمرانی کی۔ نہایت با احسن طریقے سے وسیع سلطنت کو فلاحی بنانے میں کامیاب ہوئے، اس کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حکمران ملک میں قرآن وسنت کے نظام پر عمل کرتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے سب سے غلط راستہ کا انتخاب کیا۔ انھوں نے ہندومت اور اسلام کے اصولوں کو یکجا کر کے دین الٰہی کا ڈھونگ رچایا جہاں لوگوں کے اخلاق پست ہو گئے یوں ایک مسلم معاشرے میں ہندوانہ رنگ نظر آنے لگا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے ساتھ وہی کچھ ہوا جس کا اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے جب تک مسلمانوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ملک وقوم پر ان کی حکمرانی تھی لیکن جہاں یہ لوگ دین اسلام سے منحرف ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اقتدار چھین لیا اور عذاب کی صورت میں ان پر انگریز مسلط کر دیے، جنہوں نے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے تعلیم مال اور اسباب سے محروم کر دیا۔ ہندوؤں اور انگریزوں نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں پست اور رسوا کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے خود ملک وقوم سے غداری نہیں کی انھیں کوئی شکست سے دو چار نہیں کر سکتا۔

فسانہ ہجرت

سجاد حسین راجہ

داستانِ آزادی کا شمشیر بکف باب

14/اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر پاکستان اُبھرا، تو ہندو کے دل و دماغ میں مسلمان دشمنی کی صدیوں کی مسخ شدہ لکیریں اُبھر آئیں۔ اُس نے سرزمینِ ہند سے مسلمانوں کی سینکڑوں برس کی حکمرانی کے نشانات مٹانے شروع کر دیے۔ بربریت اور چنگیزیت کا مظاہرہ کیا، عصمتوں کے گوہر آبدار بے آب ہوئے، معصوم بچوں کی چیخیں فضاؤں میں بلند ہو کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئیں۔ بوڑھے باپوں نے اپنی نوجوان بیٹیوں کا گلا اپنے کانپتے ہاتھوں سے گھونٹ دیا۔ نوجوانوں نے سینے پر وار سہے۔ وہ دَاماں چاک اور سینہ فگار لے کر پاکستان پہنچے، لیکن اکبر پور بروٹہ نے ہندو حملہ آوروں کو ناکوں چنے چبوائے۔

اکبر پور بروٹہ، ضلع رہتک کا مشہور قصبہ اور تحصیل سونی پت سے سات میل اور دِلّی سے تقریباً گیارہ میل شمال کی سمت آباد ہے۔ بروٹہ کا گاؤں قلعہ نما فصیل کے اندر تھا۔ فصیل کے اندر کی جانب چھوٹے چھوٹے رہائشی کمرے بنے ہوئے تھے۔ فصیل کے چاروں کونوں پر محل نما مکان تھے۔ گاؤں میں آمد و رفت کے لیے مشرق اور مغرب میں دو بڑے آہنی پھاٹک تھے۔

پٹھانوں کے بارہ گھرانوں کے علاوہ ساری آبادی مغل قبیلے پر مشتمل تھی۔ فصیل کی تعمیر کا انداز اور مغل آبادی کی کثرت اِس امر کی غمّاز تھی کہ یہ قصبہ اکبر بادشاہ کے دورِ حکومت میں آباد ہوا۔ غالباً اکبر بادشاہ، شکار کی غرض سے اپنے امرا اور عمائدین کے ساتھ یہاں پڑاؤ ڈالتا تھا۔ پٹھان قبیلے کے سارے افراد محنت کش، سخت جاں اور شکار کے دِلدادہ تھے۔ رائفل اُن کی زندگی کا سنگھار تھی، تو برچھی، بھالے زیور۔ اکبر پور بروٹہ کے قرب و جوار کے تقریباً سارے دیہات ہندو آبادی کا مسکن تھے۔ پٹھان جوان شکار کھیلنے کے لیے دُور دراز کے علاقوں میں نکل جاتے۔ بسا اوقات مارے ہوئے شکار پر ہندو جاٹوں سے جھگڑا ہو جاتا، لیکن پلّہ ہمیشہ پٹھانوں کا بھاری رہتا۔

قیامِ پاکستان کے اعلان سے پہلے ہی سارے ملک پر کشیدگی کے تاریک سائے منڈلا رہے تھے۔ افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ اُدھر تقسیم کا اعلان ہوگا، اِدھر ہندو، مسلمان آبادیوں پر حملہ کر دیں گے۔ بروٹہ کے پٹھان تقریباً دو مہینوں سے بارود بناتے اور خالی کھوکھوں میں بھر کر رکھ دیتے تھے۔ اُنھیں فلیتہ بردار توپ بنانے کا تجربہ بھی تھا، چنانچہ اُنھوں نے

صرف 21 جوان اپنی بستی کو ہندوؤں کے مسلح حملوں سے بچانے کے لیے آگے بڑھے
ایک طرف عورتوں کی عصمتوں اور بچوں کے معصوم چہروں کا خیال اور دوسری طرف
دشمن کی ٹڈی دل یلغار... اور پھر ایک ایک قدم پر معرکہ ہوا

ایسی دو توپیں تیار کر لیں۔ عموماً ایسی خودساختہ توپوں کو درخت یا بیل گاڑی کے ساتھ باندھ کر توپچی کے لیے مورچہ بنا لیتے تھے۔ بارود بھر کر فلیتہ دکھاتے، تو بیرل ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف آتی۔ توپچی فلیتہ دکھانے کے بعد مورچے میں بیٹھ کر اپنی حفاظت کرتا۔

15 اگست 1947ء کا دن مسلمانوں کے لیے قیامت کا دن تھا۔ مسلمان آبادیوں پر ہندوؤں نے حملے شروع کر دیے۔ بروٹہ تباہ کرنے کے لیے قرب و جوار کے 45 گاؤں کے ہندو جاٹ جمع ہو گئے۔ بروٹہ کو بھی خبر مل گئی۔ اُنھوں نے محل نما ڈیوڑھیوں پر چڑھ کر حملہ آوروں کا جائزہ لیا۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بروٹہ کو جوشِ انتقام کی لہروں میں بہا لے جانا چاہتا تھا۔ گاؤں بھر کے نوجوان جمع ہوئے۔ سولہ پٹھان تھے اور پانچ مغل۔

21 جوانوں کی نفری، ہندوؤں کے سیلِ بے پناہ کے مقابلے میں بظاہر تنکے کے برابر تھی۔ کمانڈر، خان محمد کو مقرر کیا گیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا بارُعب پٹھان اور ماہر نشانچی تھا۔ علاقے بھر میں اُس کی جرأت اور دلیری کا چرچا تھا۔ مشکل سے مشکل لمحات میں بھی گھبراہٹ اور پریشانی کو قریب نہ پھٹکنے دیتا۔ اُس نے خان حمید خان اور خان رشید کو اپنا نائب مقرر کیا۔ خان رشید بہادر اور سجیلا جوان تھا۔ خطرات سے نبرد آزما ہونا، اُس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ خان حمید فوجی نوجوان تھا اور چھٹی پر آیا ہوا تھا۔

منصوبے کے مطابق دونوں صدر دَروازوں پر خودساختہ توپیں نصب کر دی گئیں اور جوان فصیل کے ساتھ والی چھتوں پر مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ ہندوؤں نے مشرقی دروازے سے حملہ کیا۔ وہ لاٹھیاں، برچھیاں، بھالے اور کرپانیں لیے غیر منظم طریقے سے بڑھے چلے آتے تھے۔ جونہی توپ کی زد میں آئے، توپچی نے فائر کر دیا۔ ادھر مورچہ بند نوجوانوں نے اپنی اپنی رائفلوں کی باڑھ ماری۔ ہندوؤں کے لیے ایسا استقبال قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ ایک دوسرے کو کچلتے پیچھے کی طرف بھاگے۔ کچھ بارود سے اور کچھ بھگدڑ میں پاؤں تلے آ کر مر گئے، لیکن پچھلی صفوں نے بھاگنے والوں کو فرار کا راستہ نہ دیا اور اُنھیں پھر آگے دھکیل دیا۔ ان کا بڑھتا ہوا ریلا ایک بار پھر پھاٹک تک پہنچا، تو دوبارہ باڑھ پڑی۔ ایک بڑی تعداد گولیوں کا نشانہ بن گئی، تو سارا ہجوم بھاگ کھڑا ہوا۔ خان محمد نے اپنے جوانوں کو باہر نکل کر لڑنے کا حکم دیا۔ بھاگتے ہوئے آدمی کے قدم مشکل ہی سے جمتے ہیں۔ بروٹہ کے نوجوان ہندوؤں کے تعاقب میں دور تک چلے گئے۔ میدان لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔

ہندوؤں نے ریڑھے (ٹیلے کا نام) کے عقب میں جا کر دم لیا۔ مسلمان نوجوان واپس آ گئے۔ ظہر کے وقت ہندو جھتے غربی دراوزے کی طرف بڑھنے لگے۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ہندو بغیر کسی منصوبے کے لڑ رہے تھے۔ وہ باری باری صدر دَروازوں پر حملہ کرتے اور لاشوں کا ڈھیر چھوڑ کر پسپا ہو جاتے۔ بروٹہ پر مغرب سے حملہ ہوا، تو چند نوجوانوں کا ایک دستہ اُس طرف مورچہ بند ہو گیا۔ یہاں بھی ہندوؤں کا وہی حشر ہوا جو مشرقی دروازے پر ہوا تھا۔ خان محمد کے دستے نے دشمن کی نقل و حرکت دیکھ کر غربی دروازے کے دائیں بائیں چھتوں پر پوزیشن لے لی تھی۔ دشمن کا ریلا اتنا زوردار تھا کہ دروازہ ڈھائے دیتا تھا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی خودساختہ توپ کام آئی۔ دشمن کی صفوں میں اُس نے تباہی مچا دی۔ پھر مسلمانوں نے خان محمد کے منع کرنے کے باوجود فرطِ جوش میں گیٹ کھول دیا اور ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ ہندو بھاگ کھڑے ہوئے۔ غروبِ آفتاب سے پہلے مسلمان تعاقب سے پلٹے۔ ان کا ذرا بھی نقصان نہ ہوا تھا۔

ہندوؤں نے بھی دور جا کر کچھ نفری اکٹھی کی اور کمک

کے لیے مختلف مقامات پر آدمی بھیج دیے۔

دوسرے روز دشمن اِکّا دُکّا حملے کرتا رہا۔ شاید اُسے مطلوبہ کمک نہ پہنچی تھی۔ مسلمان اگرچہ پورے جوش و خروش سے نبرد آزما تھے، لیکن خطرے کی سنگینی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا اور سب چھوٹے بڑے گاؤں کے دفاع میں شریک ہو گئے تھے۔ تیسرے دن ہندوؤں نے میر عابد کی ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف سے حملہ کیا۔ میر صاحب نے یہ دروازہ فصیل میں سے آمد و رفت کی آسانی کے لیے خود نکلوایا تھا۔ یہ حملہ غیر متوقع اور زوردار تھا۔ توپیں لا کر یہاں نصب کرنے کا وقت نہ رہا تھا۔ خان محمد نے اپنے جوانوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹا اور اُن کا کمانڈر حمید خان، خان رشید، محبوب بیگ کو مقرر کر دیا۔ ہندوؤں کی اگلی صفیں پیچھے والوں کے دباؤ سے میر صاحب کے دروازے سے ٹکرائیں، تو فصیل کی دیواروں میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔ حملہ آوروں نے دروازہ توڑ دیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ خان محمد اپنے جانبازوں کے ساتھ اُن کے استقبال کے لیے پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ دروازہ تنگ تھا۔ ہندو داخل ہونے کی کوشش کرتے، تو مسلمانوں کی تلواریں چشمِ زدن میں اُن کی گردنیں کاٹ دیتیں۔ فصیل پر مورچہ بند مسلمان، اینٹ، پتھر اور گولیاں برسا رہے تھے۔ دشمن نے جو یوں موت کی گرم بازاری دیکھی، تو دہشت زدہ ہو گیا اور اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ خان محمد نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ کسے ہوش تھا کہ مٹھی بھر سپاہ کا اندازہ کرتا۔ ہندو، گڑھی اور شفیع آباد کی طرف سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ کئی گرتے اور گر گر کر اُٹھتے۔ بہت سوں میں گر کر اُٹھنے کی ہمت نہ رہتی اور مارے جاتے۔ بہت سے ہاتھ جوڑنے لگتے۔ ہندوؤں کو مارتے مارتے مسلمانوں کے بازو شل ہو گئے۔ آخر خان محمد نے واپسی کا حکم دیا۔

گڑھی ہندوؤں کا گاؤں تھا۔ مکان موجود تھے، لیکن خوف

و دہشت سے مکین بھاگ گئے تھے۔ بہاری لعل بنیا جو اِس علاقے کا امیر کبیر آدمی تھا، اپنی حویلی پولیس کے دستے کے حوالے کر گیا تھا تاکہ بروقت بلوائیوں کو مدد دی جا سکے۔

حویلی میں 26 جاٹ اور 13 پولیس کے آدمی تھے۔ اِس تعداد کا پتہ مسلمانوں کو معرکہ سر کرنے کے بعد چلا۔ خان محمد اور اُس کے ساتھی لوٹ رہے تھے کہ بہاری لعل کی کوٹھی سے فائر ہوا۔ سارے لوگ دیوار کی آڑ میں ہو گئے۔ خان محمد کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ اُس نے خان حمید کو حویلی کا جائزہ لینے کی ہدایت کی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا دُوسری سمت نکل گیا۔ وہاں سے اُس نے جونہی سر اونچا کر کے اندر جھانکا، پولیس اور جاٹوں نے اُسے دیکھ لیا اور خان حمید پر فائرنگ شروع کر دی۔ خان حمید بھی موقع پر اِکّا دُکّا گولی چلاتا رہا۔ تھانیدار صاحب سنگھ کوٹھی کے پچھواڑے کا جائزہ لینے باہر نکلا۔ خان محمد اُس کی تاک میں تھا۔ اُس کی رائفل نے آگ اُگلی۔ تھانیدار بھاگتے ہوئے ڈھیر ہو گیا۔ صاحب سنگھ کی چیخ سن کر ہری سنگھ حوالدار باہر لپکا۔ وہ بھی خان محمد کے ایک ساتھی کا نشانہ بن گیا۔ کچھ جاٹوں نے دہشت زدہ ہو کر عقبی دیوار پھاندنے کی کوشش کی، لیکن خان حمید اور محبوب بیگ کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ آخر کار اُنھوں نے بھاگ کر کمرے میں پناہ لی اور دَروازے بند کر لیے۔ اُن کا قصہ چکائے بغیر لَوٹ جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ خان محمد نے محبوب بیگ کو ہدایت کی کہ وہ پڑوس کے مکان کی چھت پر چڑھ جائے۔ گاہے گاہے مکان کی کھڑکیوں اور دَروازوں پر گولیاں چلاتا رہے تاکہ ہندو سر نہ اُٹھا سکیں۔ محبوب بیگ کی مسلسل فائرنگ سے ہندو جاٹ اور پولیس کے چند سپاہی ایک کونے میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے۔ اب خان محمد حویلی میں داخل ہوا اور سیڑھیاں پھلانگتا چھت پر چڑھ گیا۔ خان حمید بھی اُس کے پیچھے پیچھے پہنچ گیا۔ اُنھوں نے چھت اکھیڑ کر آگ لگانے کی کوشش کی، لیکن بے سُود۔ لوہا اور اینٹیں کب آگ پکڑتی ہیں۔ خان محمد

اور خان حمید نے قریبی مکانوں سے کوڑا کرکٹ اکٹھا کیا، اُسے آگ لگائی اور مکان میں پھینکنے لگے۔ آگ تو کیا لگتی، سارا مکان دھوئیں سے بھر گیا۔ دو ایک خوف زدہ ہو کر باہر بھاگے۔ حمید بیگ اور محبوب بیگ نے اُنھیں ڈھیر کر دیا۔ اِسی افراتفری میں خان محمد کو محبوب بیگ کے پستول کے چھرّے لگے، تاہم زخم خطرناک نہ تھے۔

شام ڈھلے خان محمد کو خبر ملی، ہندو پھر بروٹہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اُس نے خان حمید، محبوب بیگ اور حمید بیگ کو آپریشن مکمل کرنے کے لیے وہیں چھوڑا اور خود کمان سنبھالنے بروٹہ پہنچ گیا۔ خان حمید ہر قیمت پر پولیس والوں کا اسلحہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چھت سے نیچے اُترا اور بلند آواز سے پکارا:

''جان کی خیر چاہتے ہو، تو جو ہتھیار بھی تمہارے پاس ہیں، اُنھیں برآمدے میں رکھ دو اور ہاتھ اوپر اُٹھا کر گیٹ پر آجاؤ، ورنہ مٹی کا تیل منگوا لیا ہے، اسے چھڑک کر آگ لگا دیں گے اور تم لوگ اندر ہی بھسم ہو جاؤ گے۔''

اِس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا، سب سے پہلے پریم ناتھ، بہاری لعل کا بھانجا اندر سے نکلا۔ پھر ایک ایک کر کے نو آدمی اور باہر آئے اور سب نے اپنے آپ کو خان حمید کے حوالے کر دیا۔ حمید بیگ نے اپنی پگڑیوں سے اُن کی مشکیں کسیں، ہانک کر بروٹے لے آیا جہاں اُنھیں قتل کر دیا گیا۔ اندھیرا پھیل چلا تھا، اندیشہ تھا دشمن کا کوئی آدمی چھپا نہ بیٹھا ہو اور بے خبری میں حملہ نہ کر دے۔ اِس لیے حویلی کی تلاشی نہ لی اور صرف تین رائفلیں، چند برچھیاں اور بارود کے بنڈولیر ہاتھ لگیں۔

بروٹہ میں خان حمید کے قتل کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ سارے گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ خان زندہ سلامت آ پہنچا، تو ہر طرف اطمینان اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

تین دن کے تھکے ہارے کھانے کے چند نوالے حلق سے اُتار کر گہری نیند سو جانا چاہتے تھے کہ خبر پھیل گئی فوج بروٹہ کا محاصرہ کرنے آ رہی ہے۔ پنچایت بیٹھی اور گاؤں خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ وہ رات اکبر پور بروٹہ میں قیامت کی رات تھی۔ وہ عورتیں جنھوں نے ساری زندگی دہلیز سے باہر قدم نہ رکھا تھا، ننگے پاؤں، ننگے سر بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ نفسانفسی کا عالم تھا۔ ہر ایک کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ایسے خوف و ہراس کے سے کون کسی کی سنتا ہے۔ جس کے جدھر سینگ سمائے، چلا گیا۔ پٹھان گھرانہ خان محمد کی رہنمائی میں پورے نظم و ضبط کے ساتھ بیل گاڑیوں اور اُونٹوں پر اپنی ضرورت کا سامان لاد رہا تھا۔ وہ چیز اُٹھائی جو آسانی سے اُٹھائی جا سکتی تھی۔ ہر چیز کو جُوں کا تُوں چھوڑا۔ برسوں کے آباد مسکن، کھلے پٹ چھوڑے اور منزلِ مراد..... پاکستان کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔

بروٹہ سے پانچ میل دور سونی پت تھا جہاں اہلِ قافلہ کے کچھ رشتے دار آباد تھے۔ شام ہی سے کالی گھٹائیں چھا گئی تھیں اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا تھا۔ ایک ایک قدم اُٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ میل ڈیڑھ میل جا چکے تھے کہ امیرِ قافلہ کو رپوٹ ملی، خان حمید کی سات سالہ بھانجی چمنیا کہیں بروٹہ ہی میں رہ گئی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب بڑی بڑی قیمتی جانیں ضائع ہو رہی تھیں۔ حالات کے پیشِ نظر سات سال کی بچی کا قافلے سے بچھڑ جانا کوئی بڑا سانحہ نہ تھا، لیکن خان حمید کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ اپنی بھانجی کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے..... وہ اُلٹے پاؤں بھاگا۔ لاشیں پھلانگتا شرقی دروازے سے گاؤں میں داخل ہوا۔ ایک دیوار کے ساتھ اسے گٹھڑی سی پڑی نظر آئی۔ وہ آگے بڑھ گیا، لیکن پھر کچھ خیال آیا۔ واپس آیا۔ بجلی چمکی، تو دیکھا ایک بچی دیوار کے ساتھ لگی سو رہی ہے۔ ماچس جلائی، تو پہچان لیا، وہ چمنیا تھی۔ اُس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں اِس بات کی شاہد

تھیں کہ چنیا اپنے قافلے سے کھو کر روتے روتے سو گئی ہے۔ خان حمید نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا اور قافلے سے جا ملا۔

بارش تھم گئی۔ مطلع صاف ہو گیا، لیکن سونی پت اب بھی کالے کوسوں دُور لگ رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر خان محمد کا اونٹ خطرے کا احساس کر کے رک گیا۔ اُس نے بھی خطرے کی بُو پالی، قافلے کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ خود گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ دو تین فرلانگ آگے میدان میں ہندوؤں کا جمِ غفیر پڑا سو رہا تھا۔ غالباً اس ٹڈی دل کو صبح بروٹہ پر حملہ کرنا تھا۔ دشمن سے نبرد آزمائی کا وقت نہ تھا۔ خان محمد واپس آیا اور قافلے کو چپ چاپ مڑنے کا حکم دیا۔ قافلہ خاصا لمبا چکر کاٹ کر صبح سویرے سونی پت کے قریب پہنچا۔ سونی پت ہندو جتھوں کے نرغے میں تھا۔ قافلہ رک گیا۔ تھوڑی دیر غور خوص ہوتا رہا۔ کوٹ (سیّدوں کا محلہ) کی سمت محفوظ نظر آئی۔ قافلے نے ایک بار پھر رُخ بدلا اور کیچڑ میں لت پت ماموں بھانجا شہید کی درگاہ کے راستے سونی پت کے محلہ کوٹ میں داخل ہو گیا۔

ٹھیک اسی وقت ہندوؤں نے سونی پت پر یلغار کر دی۔ خان محمد کے دستے نے اپنے اونٹ ایک جگہ بٹھا دیے اور عورتوں کو اپنے عزیزوں کے ہاں بھیج دیا۔ سونی پت کی آدھی آبادی ہندو جاٹوں اور بنیوں پر مشتمل تھی۔ وہ بھی محلہ آوروں کے ساتھ مل گئے تھے۔ حملے کا زور محلہ گوسیاں اور جٹ والہ پر تھا۔ خان محمد اور اس کے جواں سال ساتھی سونی پت کی مسلمان آبادی کے لیے ایک غیبی مدد ثابت ہوئے۔ خان محمد نے یہاں بھی منصوبہ بندی سے ہندوؤں کا حملہ روکا۔ اس نے ساری آبادی کے نوجوانوں کو اہم مقامات کی چھتوں پر تعینات کر دیا۔ ہندو بڑے جوش و خروش سے بار بار حملہ کرتے۔ ان کی کوشش تھی مسلمانوں کے محلوں میں داخل ہو کر مکانات کو آگ لگا دیں، لیکن مسلمانوں نے ان کے حملوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ گلیوں میں دست بدست لڑائی بھی ہوئی۔ مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا۔

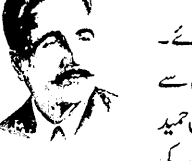

محلہ جٹ والہ کے کچھ مسلمان شہید ہوئے۔

ایک سکھ پختہ چوبارے میں بیٹھا رائفل سے آگ برسا رہا تھا۔ خان رشید اور خان حمید نتائج کی پروا کیے بغیر مکانوں کی منڈیروں پر سے رینگتے ہوئے چوبارے کے قریب جا پہنچے اور دو مختلف سمتوں میں پوزیشن لے لی۔ خان رشید نے خان حمید کو سامنے والی کھڑکی پر فائر کرنے کا حکم دیا اور خود چوبارے کے عقب میں جا پہنچا۔ اتفاق سے سکھ نے اپنا عقب محفوظ سمجھ کر کھڑکی کھلی چھوڑ دی تھی۔ خان رشید نے نشانہ باندھا۔ گولی رائفل سے نکلی، ایک چیخ بلند ہوئی اور سکھ ڈھیر ہو گیا۔ خان رشید دوڑ کر چوبارے میں داخل ہوا، سکھ کی رائفل پر قبضہ کیا اور پھر وہ دونوں اپنے مورچوں میں واپس آ گئے۔

دوپہر کے بعد دشمن کے حملے کا زور ٹوٹ گیا اور اس کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ خان محمد اور اس کے ساتھی کھلے میدان میں نکل آئے۔ یہ دیکھ کر ہندو بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے کچھ دور تک تعاقب کیا۔ باقی لوگ تو واپس آ گئے، لیکن خان حمید اور گھنور (ضلع کرنال) کے لطیف آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ کوئی پچاس ہندوؤں کا ایک جتھا تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک ٹیلے کے دامن میں بیٹھا ستا رہا تھا۔ یہ اچانک اس کے سر پر جا پہنچے اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ہندوؤں میں افراتفری پھیل گئی۔ کئی گولیوں کا نشانہ بن گئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ دونوں جیالے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپتے چھپاتے آگے بڑھے اور حاجی بندو کے باغ میں پہنچ گئے۔ یہاں ہندو حملہ آوروں نے باقاعدہ کیمپ لگا رکھا تھا۔ کچھ آرام کر رہے تھے، کچھ تاش کھیل رہے تھے، کچھ درختوں پر چڑھے پھل کھا رہے تھے۔ کچھ سونی پت کی پسپائی کا بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ باغ کے سامنے والے کنارے پر ایک خود ساختہ فلیتے دار توپ نصب کر رکھی تھی اور توپچی اس میں بارود بھر رہا تھا۔

خان حمید نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس پر فائر کر دیا۔ تو پٹی کی چیخ فضا میں بلند ہوئی، وہ زمین پر گرا اور تڑپ کر مر گیا۔ ہندوؤں نے خیال کیا اچانک دھاڑ پڑ گئی۔ دہشت زدہ ہو کر بھاگے۔ افراتفری میں بہت سے درختوں سے ٹکرا کر اور بہت سے آپس ہی میں اُلجھ کر زخمی ہو گئے۔ وہ ایسے بدحواس تھے کہ اُنھوں نے مڑ کر یہ تک نہ دیکھا کہ حملہ آور ہیں کتنے۔

یہ ایک غیبی تائید تھی، ورنہ سینکڑوں ہندوؤں کے مقابلے میں دو مسلمان کب تک لڑ سکتے تھے؟ خان حمید اور لطیف سونی پت پہنچ گئے۔ اِس کامیابی سے سونی پت کے جوانوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ سارے جوان جائے معرکہ پر پہنچے اور بہت سے ہتھیار اور دو خود ساختہ فلیتہ وار توپیں ان کے ہاتھ لگیں۔

تیسرے دن ایک فوجی دستہ حفاظت کی غرض سے آ پہنچا جس کا کمانڈر ایک ہندو میجر تھا۔ علاقے بھر کے ہندو بروٹہ اور سونی پت کی شکست کے زخم چاٹ رہے تھے۔ ہندو اپنی ناکامی کا بڑا سبب خان محمد کو سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے ہندو میجر کو اپنی مظلومیت اور خان محمد کی قاتلانہ سرگرمیوں کی داستان سنائی اور خان محمد کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا۔ مسلمانوں کو اِس سازش کا قبل از وقت علم ہو گیا۔ اُنھوں نے خان محمد کو عورتوں والے کپڑے اور برقع پہنایا اور عورتوں میں بٹھا دیا۔ میجر نے گھر گھر کی تلاشی لی، لیکن خان محمد ہاتھ نہ آیا۔ آخر میجر نے مصالحانہ انداز میں خان محمد سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مسلمانوں نے مشہور کر دیا کہ خان محمد تو بروٹہ ہی میں شہید ہو گیا تھا۔ میجر ابھی کوئی اور اقدام نہ کر پایا تھا کہ اس کا تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ ایک انگریز کرنل پٹ نے لے لی۔

ہندو، میجر کے تبادلے سے جل بُھن گئے۔ اُن کے جتھے چاروں طرف سے جمع ہونے لگے اور پھر ایک بہت بڑا لشکر سونی پت کی طرف بڑھا۔ کرنل پٹ نے ہندوؤں کو سمجھانے اور قتل و غارت سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر وہ کسی صورت ٹلتے نظر نہ آتے۔ آخر کرنل نے ایک کیپٹن کو حکم دیا کہ لاؤڈ سپیکر پر اعلان کر دو ہندو پندرہ منٹ کے اندر اندر منتشر ہو جائیں، ورنہ گولی چلا دی جائے گی، مگر اُنھوں نے سنی اَن سنی کر کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ کرنل نے فوجی دستے کو فائر کھولنے کا حکم دیا جس سے کئی ہندو مارے گئے، بہت سے زخمی ہوئے اور باقی رفو چکر ہو گئے۔ فائرنگ کی خبر ئی دہلی میں پنڈت نہرو کو ملی، تو کرنل پٹ کو فوراً واپس بلا لیا گیا اور اُس کی جگہ ایک سکھ آ گیا۔ بلاشبہ وہ ایک شریف اور فرض شناس انسان تھا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

سونی پت میں تقریباً تین مہینے ٹھہرنا پڑا۔ پھر ایک سپیشل گاڑی مسلمانوں کو پاکستان پہنچانے کے لیے پہنچ گئی۔ خان محمد اور اس کے ساتھی رائفلوں کے بغیر سفر کرنے کو غیر محفوظ سمجھتے تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ اسلحہ پاس رکھتے، تو پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ فوج اور پولیس ہر دم تلاشی لے رہی تھی۔ آخر خان محمد کو ایک تدبیر سوجھی۔ وہ لوگ جس حویلی میں مقیم تھے، وہ ذوالفقار نامی ایک جاگیردار کی تھی۔ ذوالفقار خود اہل و عیال سمیت اعلانِ آزادی سے پہلے ہی ہوائی جہاز سے پاکستان چلا گیا تھا۔ یہاں ایک بڑا سا بکس پڑا تھا۔ خان محمد نے اس بکس میں رائفلیں اور پستول رکھے اور اوپر لکڑی کا تختہ جڑ دیا اور بالائی خانے میں گرہستی کا سامان بھر دیا۔ دو جوان صندوق گاڑی تک لے گئے۔ فوجی سپاہیوں نے حسبِ دستور تلاشی لی۔ بکس میں کھانے پینے کے برتن بھرے دیکھ کر لے جانے کی اجازت دے دی۔ صندوق گاڑی میں رکھ دیا گیا، لیکن راستے میں کہیں بھی رائفلوں اور بندوقوں کی ضرورت نہ پڑی۔ یہ مہاجرین کا واحد قافلہ تھا جس نے سینکڑوں ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اُتارا، مگر خود ذرا برابر نقصان اُٹھائے بغیر صحیح سلامت پاکستان پہنچ گیا۔ ◆◆◆

سفرنامہ

ثریا حفیظ الرحمٰن

واہگہ بارڈر سے امرتسر اڑتیس کلومیٹر دُور ہے۔ پاکستان سے بھارت جانے والوں اور بھارت سے واہگہ بارڈر تک پہنچنے کے لیے امرتسر سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ شروع شروع میں ٹیکسی میں واہگہ سے امرتسر تک کا کرایہ چالیس روپے سے ساٹھ روپے تک تھا جو بتدریج بڑھتے بڑھتے سو روپے تک پہنچ گیا۔ تب تک امرتسر کے سارے راستے کھلے تھے۔

واہگہ سرحد عبور کرنے والے اکثر لوگ ایک رات کے لیے امرتسر میں رُک جاتے۔ شہر میں داخل ہونے کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ صرف وقت کا خیال رکھنا پڑتا کہ ویزے سے زیادہ مدت نہ ٹھہرا جائے۔ مسلمان مسافر کشمیریوں کے ڈھابوں سے کھانا کھاتے یا کسی ہوٹل میں ٹھہر کر سبزیوں سے بنے کھانوں سے پیٹ بھرتے، سستی شاپنگ کرتے اور آگے روانہ ہو جاتے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب امرتسر میں چیزیں، دہلی سے نسبتاً سستی مل جاتیں۔ بھارتی مصنوعات، جعلی کشمیری شالیں اور سلک کی ساڑھیاں، کشمیری لیبل کے ساتھ عام

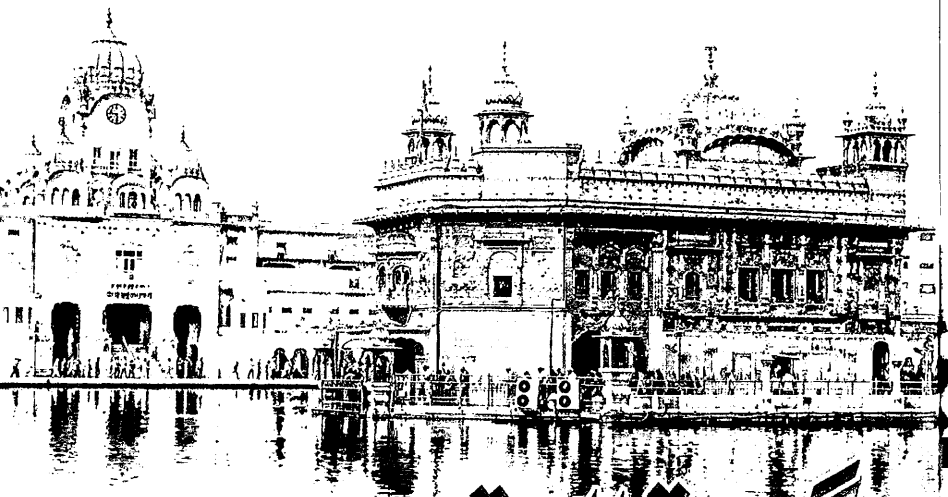

ایک تھا امرتسر

سکھوں کے سب سے پوتر شہر کا نرالا سفرنامہ

جس میں حقیقتوں کے نوع بہ نوع مشاہدات اور تاریخ سامنے آتے ہیں

دستیاب تھیں۔ امرتسر میں کشمیری مسلمان گنتی کے تھے جو یا تو جموں، سری نگر سے مزدوری کرنے کے لیے آتے اور زیادہ تر سامان ڈھونے کا کام کرتے۔ عرفِ عام میں انھیں ''ہاتو'' کہا جاتا، یا کچھ کشمیری مسلمان چھوٹا موٹا کاروبار چلا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر کشمیری اپنے چھوٹے چھوٹے کرائے کے ڈھابے چلاتے تھے جہاں سے پاکستان آنے جانے والوں کو پکا ہوا حلال گوشت اور دال، سبزی، کلیجہ وغیرہ مل جاتا۔ ورنہ واہگہ سے لے کر پنجاب، ہریانہ اور دہلی کے قرب و جوار تک حلال گوشت ناپید تھا۔ بھارتی پنجاب کو تو سکھوں اور ہندوؤں نے 1947ء ہی میں ملیچھ مسلمانوں سے 'پوتر' کر دیا تھا۔ ہزاروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور باقیوں کو بے سروسامان بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ البتہ اسّی ہزار کے قریب مسلمان خواتین اور بچیاں اپنی ملکیت میں رکھ لیں۔

سکھ بھی گوشت کھاتے ہیں، لیکن وہ جھٹکا کرتے ہیں۔ آج کل ہندوؤں، سکھوں کا نوجوان طبقہ زیادہ گوشت خور ہو گیا ہے۔ یہ لوگ سؤر کا گوشت بھی بکثرت کھاتے ہیں، نیز سؤر کی چربی کا استعمال بھی عام ہے۔

امرتسر کے لوگ امرتسر کو 'امبرسر' کہتے ہیں۔ امرت کے معنی آبِ حیات اور سر کے معنی تالاب کے ہیں۔ یہ تالاب ہر مندر (گولڈن ٹیمپل) میں واقع ہے جس کا پانی امرت کہلاتا ہے۔ امرتسر میرے پُرکھوں کا شہر ہے۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا، اُس وقت اگرچہ ہم لوگ امرتسر میں نہیں تھے، لیکن مجھے اپنی دادی ماں کا گھر خوب یاد تھا۔ لاہور سے چلے، تو آپی جان نے کہا: ''ٹھنڈا تالاب، کالی ماتا کا مندر پوچھ لینا۔ بازار ٹوکریاں والا ہے اور اگر دُوسری سمت سے جاؤ، تو کٹڑہ سفید سے جانا۔ ٹوکریوں والے بازار میں، موڑ پر چاچا سیلو کی پھلوں کی دکان ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ گلی اندر

جاتی ہے جہاں لوہے کے دو چھوٹے چھوٹے گارڈر لگے ہیں۔ اندر جا کر بائیں ہاتھ کو پہلی سے دوسری گلی ہے۔ پتہ نہیں چاچا سیلو زندہ بھی ہے یا نہیں اور مجھے یہ بھی تو علم نہیں کہ وہ ہندو تھا یا مسلمان۔ عیدگاہ کے پچھلی طرف تایا ابو کا گھر بھی دیکھ کر آنا۔ تمھیں تو کچھ یاد بھی نہ ہوگا۔ خیر دادی ماں کے گھر کا تجھے ضرور پتہ چل جائے گا۔ گھر کی پچھلی دیوار مسجد کے ساتھ لگی ہے۔ گھر نہ پہچان سکو، تو مسجد سے سمجھ جانا۔ گلی کے آگے بڑا سا پختہ ٹائلوں والا میدان ہے۔ امرتسر میں ہاتھی دروازہ بھی ہے جہاں بابا کے بہت سے رشتے دار رہتے تھے۔ بگھیاں والا کٹڑہ بھی ہے۔ فخراں کی گلی بھی ہے جہاں سب ہمارے اپنے ہی لوگ رہتے تھے۔''

سائیکل رکشا پر انسانی بوجھ

ہمارے ہم سفر دہلی میں ہمارے علاقے کے ایک موٹے سردار جی اور اُن کی پتنی تھے۔ وہ لوگ پاکستان میں پنجہ صاحب کی یاترا کے لیے گئے تھے اور ہمارے ساتھ ہی واپس آئے تھے۔ امرتسر میں سائیکل رکشا دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ اگرچہ دہلی میں سائیکل رکشا دیکھ چکے تھے۔ پتلی ٹانگوں والے کمزور و ناتواں آدمی سائیکل رکشا کھینچتے ہوئے سانس لینے کے لیے بالکل جانور کی طرح پورا منہ کھول لیتے ہیں۔ رکشے پر بیٹھنے کے خیال ہی سے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ گلیوں اور بازاروں میں زرتار ساڑھیوں کے پلو اُڑاتی خوبصورت کھترانیاں سائیکل رکشاؤں میں بیٹھی پاس سے گزرتی جا رہی تھیں۔ بڑی توندوں والے لالہ جی اپنی توندیں سنبھالے، صحت مند سردارنیاں اوڑھنیوں سے سر ڈھانپے اور پگڑیوں والے سردار جی رکشاؤں میں آ جا رہے تھے۔

مائی سیواں کا بازار، سیوا سمتی، سنگِ مرمر کے سفید میناروں والی مسجد..... اور مسجد کے ساتھ دادی اماں کا گھر..... چھت پر کھلنے والا روشن دان .....! میرے ذہن میں ہر چیز

گڈمڈ ہو رہی تھی کہ اتنے میں ہمارے ہم سفر نے تین عدد سائیکل رکشا رکوا لیے۔ چھوٹا بیٹا تو اپنے ابو کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گیا اور بڑا بیٹا دوسرے رکشے میں میرے ساتھ ..... میں نے ایک ہاتھ سے رکشے کی کمانی کا سہارا لیا اور دُوسرے ہاتھ سے اپنے بیٹے کا کندھا تھامے رکھا۔ ہر آدھے منٹ پر میں سیٹ سے کھسک کر نیچے گرنے والی ہو جاتی اور ساتھ ہی میرا بیٹا بھی۔ بمشکل ہم دونوں اپنے آپ کو سنبھالتے۔ بازاروں اور گلیوں سے گزرے، تو بچپن کی ایک بھولی بسری باس نے گھیر لیا۔ یہ ناگوار باس بچپن کے کسی گوشے سے انگڑائی لے کر اُٹھی اور چاروں طرف پھیل گئی۔ کسی بازار میں زیادہ ہو جاتی اور کسی میں کم۔ یہ ہینگ اور ہلدی کی ملی جلی باس تھی جو امرتسر کے بازاروں میں سے گزرتے ہوئے مشامِ جان کو معطر کر رہی تھی۔ ایک پُرہجوم بازار سے گزرتے ہوئے گلہاٹی صاحب نے بتایا:

''یہ مائی سیواں کا بازار ہے۔'' تھوڑی دور جا کر ایک دکان کے آگے رکشے رک گئے۔ سارے لوگ اُترے۔ دکان کے باہر لکڑی کے بینچ بچھے تھے۔ گلہاٹی صاحب نے ہمیں وہاں بٹھایا اور خود اندر جا کر ٹھنڈا مشروب لے آئے۔ گولی والی بوتلیں تھیں، پینے میں نہایت بدمزہ۔ اندر سے مشین چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ بوتلیں بھرنے کی مشین لگی ہوئی ہے۔ گویا یہ ہول سیل ڈیلر کی دکان تھی۔ دکاندار گلہاٹی صاحب کا جان پہچان والا تھا۔ بازار میں خاصے ہجوم کے باوجود اُداسی چھائی تھی اور کوئی رونق نہ تھی۔ سپاٹ چہروں والے لوگ اپنے کاموں میں یوں مصروف تھے جیسے نیند میں کام کر رہے ہوں۔

''یہ سیوا سمتی کیا ہوتی ہے؟'' میں نے مسز گلہاٹی سے پوچھا۔ مائی سیواں کا بازار تو دیکھ چکے تھے، میں نے سوچا، لگے ہاتھوں سیوا سمتی سے بھی جان کاری ہو جائے۔

''یہ ایک سبھا ہے۔ اس کے ماتحت بہت سے ادارے چلتے ہیں۔ ہسپتال، سکول، اناتھ گھر، پاٹ شالائیں وغیرہ، دھنوان پیسہ دان کرتے ہیں، ان سے یہ سمتی سارے ادارے چلاتی ہے۔ سیوا کا شوق رکھنے والے کرم چاری ان اداروں میں مفت سیوا کرتے ہیں۔

زخم خوردہ قافلے

وہاں سے ہم لوگ دوبارہ رکشا میں بیٹھ کر کالی ماتا کے مندر پہنچے۔ کئی گلیوں میں جھانکا۔ ایک دو گلیوں کے داخلی راستے پر لوہے کے گارڈر نصب تھے۔ دو عدد راستے ناپ کر، ہم لوگ تیسرے راستے کے فولادی ڈنڈوں کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھے، تو ایک چھوٹے سے پختہ میدان میں نکل آئے۔ واپس مڑ کر بائیں طرف کی گلیاں گنیں۔ بس ایک ہی تنگ و تاریک سی گلی کے آگے سے گزرے تھے۔ دوسری کے دہانے پر پہنچے جو پہلی والی سے تھوڑی کشادہ تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو گلی کے پہلے نکڑ پر ایک مکان کی بند چوبی گیلری نے جھک کر سرگوشی کی کہ یہ مسلمانوں کی گلی ہے۔ بند گیلری کے سامنے والا تین چار منزلہ مکان ایسے زمین بوس تھا جیسے زلزلے نے تباہ کر دیا ہو۔ چوباروں کی آدھی آدھی چھتیں کرم خوردہ ٹوٹی پھوٹی اندرونی الماریوں، کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے پٹ بھیانک منہ کھولے کھڑے تھے۔

آگے بڑھے تو ایک چھوٹا سا بوسیدہ مکان ثابت کھڑا تھا۔ اس کے سامنے والے دو مکان بھی بوسیدہ، مگر صحیح سالم تھے۔ آگے پھر تیسری منزل تک ملبے کا ڈھیر لگا تھا اور آگے بڑی بڑی نوساختہ عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دو تین مکانوں کے بعد گلی ختم ہو کر کھلا میدان بن گئی۔ واپس مڑے، چھوٹے مکان کے باہر والے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ جھانک کر دیکھا، تو ایک بزرگ سے آدمی کھاٹ پر بیٹھے تھے۔ ہمیں اجنبی جان کر باہر نکلے۔ گلہاٹی صاحب نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا

اور ہمارا تعارف کرواتے ہوئے، ہمارا بتایا ہوا پتا پوچھا۔

''آپ بالکل صحیح پتے پر کھڑے ہیں، بالکل ٹھیک جگہ پر۔'' بزرگوار نے خوش دلی سے بتایا..... دُور دُور تک دیکھا، کسی مسجد کا کوئی منار یا کوئی گنبد نظر آیا نہ کسی مسجد کی چھت پر کسی مکان کا روزن کھلتا دیکھا۔ میں دو تین مرتبہ آگے کی طرف گئی، پھر پیچھے لوٹی ..... لیکن بے سُود۔ کھنڈروں کی ایک دنیا آباد تھی جس کے درمیان ایک سال خوردہ انسان ہمیں راستہ بتا رہا تھا۔ جہاں سے ہمارے آباؤ اجداد کے زخم خوردہ قافلے گزر چکے تھے۔ کوئی ملال کوئی تاسف نہ ہوا..... کہ مسلمان اللہ کی زمین پر جہاں آباد ہو جائے، وہی اس کی عارضی رہائش گاہ ہے۔

''سب کچھ اللہ ہی کا ہے جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے اور ہم نے اُسی کی طرف لَوٹ جانا ہے۔'' ہاں اِتنا افسوس ضرور ہوا کہ ''یہ کیسی قوم ہے جو اِتنے سال بیت جانے کے بعد بھی اجڑے ہوئے دیار بسا نہیں سکی، لیکن دہلی تو اٹا ٹوٹ آباد ہے۔ ضرور کوئی گھپلا ہے۔''

مجھے یاد آیا یہ شہر تو سعادت حسن منٹو کا شہر ہے جو میرے بابا کے کلاس فیلو تھے اور بعد میں میرے چچا کے ساتھ پڑھتے رہے۔ منٹو جنہوں نے سکول کے زمانہ ہی میں روسی زبان کی کتابوں کے ترجمے کرنے شروع کر دیے تھے۔ میرے بابا کہتے تھے منٹو انگلش کے پرچے میں ننانوے فی صد مارکس لیتے، لیکن حساب میں دس بارہ نمبروں سے کبھی آگے نہ بڑھے۔ انگریزی زبان ان کے کسی کام نہ آئی، وہ بیچارے ساری زندگی حساب کتاب کے چکر میں ہی پس گئے۔ پیسے کی ہمسائیگی میں منٹو جانے کیوں حساب میں کمزور رہے، لیکن وقت نے بتایا ہے کہ امبرسر والے تو ہمیشہ ہی سے حساب کتاب میں پستے رہے۔

1947ء میں سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کا حساب چکایا..... ایسا چکایا کہ قصہ ہی پاک کر دیا اور اب ہندو، سکھوں کا حساب کتاب چکا رہے ہیں اور سکھ ہندوؤں کا..... اس میں بے چارے منٹو کا کیا قصور..... یہ تو سارا فساد امبرسر کا ہے۔

میرے بابا کے ایک اور کلاس فیلو ڈاکٹر سراج الدین بھی امبرسر کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر (سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے والد) بھی امبرسریئے تھے۔ امبرسر اے۔ حمید (معروف ادیب) کا بھی شہر تھا جو گلوں کی باتیں کرتے، خوشبوؤں کی باتیں، پشمینے کی شالوں کے دھاگوں جیسے نرم الفاظ سے کہانیاں بُنتے اور نمکین چائے کے ساداروں سے محفلیں سجاتے۔ امبرسر میں ناریاں اب بھی سندر ہیں۔ سیبوں جیسی سرخی و سفیدی ذرا کم ہے، لیکن دِل رُبائی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

دربار صاحب کی یاترا

ہم لوگ رام باغ کی ایک ماڈرن کالونی میں ایک سردار جی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ بنگلہ خوبصورت تھا، مگر ابھی بن رہا تھا۔ رہائشی کمرے اور لاؤنج بن کر فرنیشڈ ہو چکے تھے۔ گلہاٹی صاحب نے صبح ہی کہہ دیا تھا کہ آج دوپہر کے بعد دربار صاحب جانا ہے۔ اُنھوں نے وہاں ماتھا ٹیکنا اور ہولی ڈِپ یا پوتر غوطہ بھی لینا تھا۔ ہمیں بھی گولڈن ٹیمپل دیکھنے کا شوق تھا۔ موسم ابھی خنک تھا۔ غسلخانے میں اِدھر اُدھر دیکھا، گیزر کہیں نظر نہ آیا۔

اچانک نل کے ساتھ اُوپر کو نظر پڑی۔ ایک چھوٹا سا اِنسٹنٹ گیزر لگا تھا۔ ہم لوگوں نے ایسا گیزر پہلے کبھی استعمال نہ کیا تھا۔ اِدھر اُدھر سے معائنہ کیا، آف آن کر کے دیکھا، نل کو چلایا تو گرم پانی بالٹی میں گرنے لگا۔ سوئچ بند کیا اور پھر نل چلایا، تو پانی ٹھنڈا یخ۔ واہ نہ بجلی کا ضیاع نہ پانی کا۔ کفایت کا

یہ آلہ بڑا پسند آیا۔ کفایت شعاری کنجوسی کی حد تک ہندوؤں میں پائی جاتی ہے۔ وہ سکھ فیملی بھی خاصی کفایت شعار محسوس ہوئی۔

انڈیا نے بجلی کی مصنوعات میں خاصی ترقی کر لی ہے۔ تقریباً ساری ہی چیزیں خود بناتے ہیں، لیکن بہت مہنگی۔ کار ہی لے لیں، موریس کار، جس کا نام ایمبیسڈر ہے، تب ایک لاکھ روپے میں ملتی تھی جبکہ جاپانی ٹیوٹا چالیس پچاس ہزار میں مل جاتی تھی۔ خیر ہم تیار ہوئے اور سائیکل رکشا پر سوار ہو کر گولڈن ٹیمپل پہنچے۔ اب سائیکل رکشے پر بیٹھنے کے کچھ کچھ آداب آ گئے تھے۔

ٹیمپل کی بارہ راہداریوں میں لوہے کے لمبے لمبے پائپ لگا کر ایک راستہ بنایا گیا تھا جہاں کھڑے ہو کر جوتے رکھوائے جاتے۔ لڑکے بالے، جوان اَور بوڑھے سکھ لوگوں کی جوتیاں صاف کرنے میں لگے تھے۔ معلوم ہوا کہ مفت سیوا ہے۔ لوگ گردآلود میلی جوتیاں رکھوا کر جاتے، واپسی پر انھیں صاف اور پالش شدہ جوتیاں ملتیں۔ ایک طرف نل لگے تھے، نیچے حوضیاں بنی تھیں۔ لوگ ہاتھ دھوتے، کلّی کرتے اور سر پر رومال باندھ لیتے۔ بیبیاں دوپٹوں سے اچھی طرح سر ڈھانپ لیتیں اور سب ننگے پاؤں سنگِ مرمر کے زینے چڑھ کر برآمدوں میں پہنچتے۔ وہاں سے چاروں اطراف سے زینے نیچے کو اُترتے تھے۔

عورتیں، مرد زینوں اور فرشوں کی صفائی میں لگے تھے جو یاتریوں کی راہ میں ذرا بھی مزاحم نہ ہوتے۔ سیوا کرنے میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ ہر کوئی اپنی خوشی سے سیوا میں جُتا ہوا تھا۔ کوئی سردارنی اپنی اوڑھنی سے زینہ پونچھ رہی تھی، تو کوئی صاف ستھرے تنکوں کی نئی نکور جھاڑو سے کام لے رہی تھی۔ ایک جوان ناری سر کے اُوپر بڑا سا رومال رکھے اپنے لمبے بال کھولے اُن سے جھاڑو کا کام لے رہی تھی۔ ایک بچہ اپنی نئی قمیص سے فرش دھو دھو کر پانی نچوڑ رہا تھا۔ سچی عقیدت اور لگن کے نظارے دیکھنے والے تھے۔

برآمدے اور زینے سب سنگِ مرمر کے بنے تھے۔ زینہ اُتر کر دُور تک سنگِ سفید کا فرش بچھا تھا۔ چاروں طرف سفید دھواں سا اُٹھتا نظر آ رہا تھا۔ درمیان میں ایک بڑا پانی کا سروور (تالاب) تھا جو لبالب گدلے پانی سے بھرا تھا۔ ٹھہرے ہوئے پانی کی ناگوار باس ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ تالاب کے چاروں اطراف پوتر غوطہ لینے والوں کی سہولت کے لیے بےشمار لوہے کے کنڈے آویزاں تھے۔ گلہاٹی صاحب تو فوراً کپڑے اُتار کر کنڈے کے سہارے پانی میں اتر گئے۔ چُلّو میں پانی لے کر پہلے تو امرت چکھا اور پھر پانی میں غوطہ لگا کر اُبھرے۔

امرت چکھنا اِندرا گاندھی کا

حفیظ اور دونوں بچے قریب کے مرمریں بینچ پر بیٹھ گئے اور مسز گلہاٹی میرا ہاتھ پکڑے بائیں طرف زنانہ حماموں کی طرف لے گئیں۔ مرد و زن کا بےپناہ ہجوم تھا۔ ایک حمام کے کھلے در میں سے بیبیاں لائن میں باری باری اندر جا رہی تھیں اور دُوسرے در سے اسی تسلسل سے واپس نکل رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ عورتوں کے امرت چکھنے کی جگہ ہے۔ اندر حمام کی لمبائی میں ایک زینے کی سیڑھی بنی تھی اور حمام کا حوض پانی سے بھرا تھا۔ پانی حوض کی ایک دیوار کے نیچے سے باہر کے بڑے سروور میں سے براہِ راست اندر کی طرف تیر رہا تھا۔ عورتیں زینے پر کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ کے چُلّو میں پانی لیتیں اور ناک تک لے جا کر منہ میں ڈال لیتیں۔ اسے امرت چکھنا کہتے ہیں۔

مسز گلہاٹی نے مارے عقیدت کے ایک چلو بھر کر میرے دائیں ہاتھ پر بھی ڈال دیا اور کہا کہ یہ امرت ہے۔ اسے چکھنے سے بڑا ثباب (ثواب) ملتا ہے اور سو بیماریاں دور

ہوتی ہیں۔

میں نے مسز اِندرا گاندھی کو فلم میں گولڈن ٹیمپل میں امرت چکھتے دیکھا تھا۔ میں بھی مسز گلہاٹی کا دل رکھنے کے لیے چُلّو ناک تک لے گئی اور پھر بے اختیار اسے اِس طرح حرکت دی کہ کچھ پانی نیچے زینے پر گر گیا اور کچھ میرے ڈوپٹے پر پڑا۔ مجھے یوں لگا جیسے ناک کے نزدیک سے سڑی ہوئی مچھلیوں کا ٹوکرا گزار دیا گیا ہو۔ بُو نے سارے وجود کو ہلا دیا، پتہ اچھل کر منہ کو آنے لگا۔ میں نے منہ اور ناک کو ڈوپٹے سے دبایا اور بھاگ کر تعفن زدہ حمام کے دوسرے دروازے سے باہر آ گئی۔ مسز گلہاٹی بھی میرے ساتھ ہی باہر نکل آئیں۔ ادھیڑ عمر، جہاں دیدہ مسز گلہاٹی سمجھ گئیں اور بڑی ملائمت سے فرمایا کہ سرووَر مدت سے صاف نہیں کیا گیا۔ اب صفائی کا انتظام ہو رہا ہے۔ پر آپ جانیں ہمارے دھرم میں، اس پوتر جل کو چکھنے سے پاپ جھڑتے ہیں اور وَاہ گورو کی کرپا سے بڑی شانتی ملتی ہے۔ باہر سرووَر میں سینکڑوں سردار اَور بچے ہولی ڈپ لے رہے تھے۔

میں واپس آ کر حفیظ اور بچوں کے پاس بیٹھ گئی۔ دو ایک ابکائیاں آ ہی گئیں۔ تیزی سے میں نے پرس کھولا اور میٹھی سونف اور چار پانچ الائچیاں اٹھی ہی پھانک لیں۔ مسز گلہاٹی دوسرے حمام میں اشنان کرنے جا چکی تھیں۔ زنانہ حماموں میں نہانے کے لیے جو حوض بنے تھے، ان میں بھی باہر والے سرووَر ہی کا پانی رواں تھا۔ تالاب کی طرف حماموں کی دیواریں نیچے سے کھلی تھیں اور تالاب کے پانی کے اُوپر پُل کی طرح بنائی گئی تھیں تاکہ سرووَر کا پانی براہِ راست اندر آتا جاتا رہے۔ جہاں ہم لوگ بیٹھے تھے قریب ہی لوگوں کے ٹھٹھ گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔

جھانک کر دیکھا سرووَر کے کنارے ایک درخت کا خشک ٹھنٹھ تھا۔ معلوم ہوا کہ اسے ''دکھ بھنجنی بیری'' کہتے ہیں، دکھ دور کرنے والا بیر کا درخت۔ سکھوں کا عقیدہ ہے کہ اِس بیری کے پھل، پتے اور چھال میں سے کچھ بھی کھانے سے ہر مرض دُور ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ کوڑھ کا مرض بھی۔ دو ایک ٹہنیوں کے ساتھ درخت بالکل خشک تھا لیکن لوگ مارے عقیدت کے ہاتھ لگا لگا کر چوم رہے تھے۔

ہمارے ہم سفر ہولی ڈپ سے فارغ ہو کر آ گئے تھے۔ سبھی عورتوں نے ڈوپٹوں سے سر پوری طرح ڈھانپے ہوئے تھے اور آدمیوں نے سروں پر رومال باندھ رکھے تھے۔ گلہاٹی صاحب نے دربار صاحب کے باہر ہی حفیظ اور بچوں کے سروں پر رومال بندھوا دیے تھے۔

دربار صاحب میں داخلے کے کچھ آداب اور ضابطے ہیں۔ سیاح لوگ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے دفتر سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ جوتے، استعمال شدہ موزے، چھتری، چھڑی، اسلحہ، منشیات اور تمباکو وغیرہ کی ممانعت ہے۔ اسلحہ رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دربار صاحب کے بارہ پربندھک کمیٹی کے دفتر میں ایک رجسٹر پر اسلحہ کی تفصیل درج کروا کر اسلحہ دفتر میں جمع کروا دیں اور لَوٹتے ہوئے اسے واپس لے لیں۔

سونے کی پلنگڑی پر گرنتھ

اب گلہاٹی صاحب نے ہمیں ٹیمپل کا اصل حصہ جو باہر سے سارا سونے کا بنا ہے، دکھانے لے چلے۔ انھوں نے خود انھی گرنتھ صاحب کے درشن کرنے اور ماتھا ٹیکنا تھا۔

تالاب کے اُوپر پُل عبور کر کے ہم سب لوگ بڑی مشکل سے اندر دَاخل ہوئے۔ بھیڑ اِس قدر زیادہ تھی کہ اندر پہنچنا دشوار نظر آتا تھا۔ گولڈن ٹیمپل کا یہ حصہ ہرمندر کہلاتا ہے۔ عمارت کے باہر چاروں طرف سونے کے سنہرے پترے چڑھے ہیں۔ عمارت کے اوپر بڑا سا کلس بھی سونے کا ہے۔

کئی گیلریاں عبور کر کے ایک گیلری میں پہنچے۔ سونے کی ریلنگ کے اندر کی طرف ایک چوکور کٹہرے کے اندر سونے کے پائیوں والی ایک پلنگڑی کے اوپر گرنتھ صاحب کا نسخہ رکھا تھا۔ نسخہ بہت بڑے صندوق کی طرح تھا۔ اس کے اُوپر ساٹن کا گوٹے والا رومال اسے پوری طرح ڈھانپے ہوئے تھا۔ دو گرنتھی، دائیں بائیں، مور چھل کر رہے تھے۔ فرش رودُودھیا سفید چادریں بچھی تھیں۔ ایک طرف کیرتن پارٹی بیٹھی تھیں۔ پاس ہی ہیڈ گرنتھی آنکھیں موندھے بیٹھے تھے۔

گرنتھ صاحب کی پلنگڑی کے پاس سفید چادر پر سکّوں اور نوٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹہرے کے باہر گیلریوں میں بھی دودھیا چادریں بچھی تھیں۔ سارے ستون اور گیلریاں سنگِ سفید سے بنی تھیں۔ ایک طرف عورتیں سر جھکائے عقیدت سے بیٹھی تھیں اور ایک طرف مرد ہاتھ جوڑے عاجزی سے سر جھکائے ہوئے تھے۔ ماحول نہایت پُرتقدس، عاجزانہ اور پُرسکون تھا۔ ہلکے سُروں میں دل میں اُتر جانے والی دھیمی موسیقی کی سریلی آواز میں گوروبانی کا پاٹ ہو رہا تھا۔ کیرتن کی آواز کے سوا کسی کے سانس لینے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں صرف چند لمحوں کے لیے کیرتن کی آواز بند ہوتی ہے، وہ بھی جب کیرتن پارٹی بدلتی ہے۔

گولڈن ٹیمپل کی بنیاد ایک مسلمان ولی میاں میر صاحب نے رکھی تھی، بلکہ سکھوں کے ایک گورو نے خود درخواست کر کے اُن سے گولڈن ٹیمپل کی بنیاد رکھوائی تھی۔ دراصل بابا گورونانک نے تو واحدانیت کا ہی سبق دیا تھا۔ گرنتھ صاحب کے زیادہ تر اشلوک اور دوہے بابا فرید گنج شکرؒ کے کلام پر مشتمل ہیں۔ ہندوؤں نے بڑی کوشش کی کہ گرنتھ صاحب سے بابا فریدؒ کا کلام نکلوا دیا جائے، لیکن سکھوں نے ان کی یہ کوششیں کامیاب نہیں ہونے دیں۔

لوگ ننگے پاؤں بے آواز قدموں سے آ رہے تھے۔ گرنتھ صاحب کو ماتھا ٹیکتے اور حسبِ توفیق سکّے اور نوٹ دان کرتے۔ نوٹوں اور سکّوں کے دو الگ الگ ڈھیر خاصے اُونچے تھے، سفید چادر پر الگ پڑے تھے۔ گرنتھی لوگ انھیں ہاتھوں سے ایک طرف ہٹا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ نوٹ اور سکّے الگ کرتے جاتے۔ گوردواروں میں روزانہ ہزاروں کی آمدن ہوتی ہے، لیکن گولڈن ٹیمپل میں تو آمدنی کا کوئی حساب ہی نہیں۔ بڑے سے لے کے بچے تک روپیہ پیسہ دان کرتے ہیں۔ یہ سارا پیسہ پھر سکھوں کے لیے رفاہی کاموں پر خرچ ہوتا ہے۔ مدتوں تک ہندو براہمن گوردواروں کا سرپرست بن کر سارا دھن سمیٹتا رہا۔ اَب بھی ہندو گورنمنٹ ہر گوردوارے سے اپنا حصہ وصول کرتی ہے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھ کر ہم لوگ باہر نکلے۔ تالاب کے پُل پر سیوا میں جُتے لڑکے، جوان اَور بوڑھے سکھ کڑاہ پرشادوالے تھال اُٹھائے کھڑے تھے اور ہر گزرنے والے کو حلوے کا ایک دونا (پتوں سے بنا پیالہ) پکڑا دیتے۔ گرم گرم حلوے سے نچڑتا گھی انگلیوں سے چاٹتے اور دھکم پیل کرتے یاتری گزر رہے تھے۔ اُن کے سروں کے اُوپر سے خالی تھال تیزی سے واپس ہوتے اور بھرے ہوئے مزید آ جاتے۔ وہ اِتنی پھرتی سے کام کر رہے تھے کہ ایک بچے کو بھی خالی ہاتھ نہ جانے دیتے۔

اب ہم کھلے صحن میں آ گئے۔ یہاں ایک طرف پینے کے لیے ٹھنڈے پانی کی سبیلوں کی قطار لگی تھی جن کے نزدیک میز پر صاف ستھری چم چم کرتی کانسی کی کٹوریاں رکھی تھیں۔ یاتری حماموں سے پانی بھر کر پیتے اور کٹوریاں دوسری طرف فرش پر ڈھیر کرتے جاتے۔ نیچے پیڑھیوں پر معزز بیبیاں بیٹھی ریت سے جھوٹی کٹوریاں صاف کر کے میز پر لگائے جاتیں۔ پانی صاف و شفاف اور ٹھنڈا تھا۔ سامنے ہی ایک تین منزلہ

عمارت تھی جو اکال تخت کہلاتی ہے۔ آپریشن بلیو اسٹار سے پہلے سنت جرنیل سنگھ بھنڈراں والا اکال تخت کی تیسری منزل پر رہتے تھے۔ دوسری منزل پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے کی اشیاء رکھی تھیں۔ ایک کمرے میں متبرک اشیاء سجی تھیں، دروازے پر تالہ پڑا تھا۔ ہفتے میں ایک مقررہ دن پر تالہ کھلتا ہے اور لوگ گوروؤں کی متبرک اشیاء کے درشن کرتے ہیں۔ گولڈن ٹیمپل کے متعدد دَروازے مختلف بازاروں میں کھلتے ہیں۔ داخلے کا بڑا دروازہ گھنٹہ گھر کی طرف سے ہے۔ اسی طرف سامنے گوردوارہ بابا ٹل ہے۔

دربار صاحب سے جب واپس باہر نکلے، تو جوتے پہن کر ٹیمپل کے ساتھ ساتھ ایک بازار میں جا نکلے۔ ہر طرف روشنیاں پھیلی تھیں۔ کھلے ہوئے چہرے اور دھنک کے رنگ بکھرے تھے۔ دکانیں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ جھلملاتی ریشمی چوڑیوں کے ڈھیر، رنگ برنگی چُنیاں، چمکیلے نگینوں والے زیورات، بازار کی چکاچوند سے آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ زندگی سے بھرپور قہقہے تھے، کھنکھناتی آوازیں تھیں۔ دکانیں سنہرے چمکیلے سامان سے بھری ہوئی تھیں۔ کھلے ہاتھ پاؤں اور چوڑے چہروں والی سردارنیاں، خوش رو جوان سردار، صاف رنگت والے بچے اور بچیاں، جن کے چہروں سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔ سارے بازار میں خریداری ہو رہی تھی۔ بازار گولڈن ٹیمپل کے ایک اور دَروازے تک سجا ہوا تھا۔

جلیانوالہ باغ بھی دیکھنے گئے۔ باغ کیا ہے، ایک چھوٹا سا پارک ہے جسے تاریخی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے۔

پارک کے چاروں طرف، لوہے کی ریلنگ لگی ہے۔ چھوٹے چھوٹے سبز گھاس کے قطعے۔ ایک آدھ فوارہ، کچھ پھولوں کی جھاڑیاں اور بیٹھنے کے لیے ایک دو چبوترے! وہ کنواں بھی دیکھا، جو جلیانوالہ سانحہ کے وقت لاشوں سے پٹ گیا تھا۔

گردونواح کے قدیم مکانوں کی نانک شاہی اینٹوں میں گولیوں کے نشانات محفوظ کر لیے گئے تھے۔ باغ کے نواح کے رہنے والے بچے ٹولیوں میں باغ میں کھیل کود رہے تھے۔ ایک طرف ایک بڑا بورڈ لگا تھا جس پر سانحہ جلیانوالہ باغ کا سنِ عیسوی اور کچھ واقعات گورمکھی اور انگریزی میں لکھے تھے۔

امرتسر کا باڑہ، پاکستانی مال

ریلوے اسٹیشن کے پیچھے امرتسر کی باڑہ مارکیٹ واقع ہے جہاں پاکستانی مصنوعات کھلے عام بکتی ہیں۔ کپڑا، کولر، ہاٹ پاٹ، تھرماس، کراکری، پلاسٹک کے برتن، الیکٹرک گڈز، گھی آئل وغیرہ۔ یہاں کرنسی کا کاروبار بھی ہوتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر اندر، باہر پاکستانیوں، سکھوں اور ہندوؤں کی بھیڑ رہتی ہے۔ بھارتی مسلمان، پاکستانی مسلمان اور آگے پیچھے 'جی مہاراج'..... جی مہاراج کرتے ہوئے دھیمے مزاج والے ہندو اور گرم جوش سردار جی!

امرتسر میں منوچاجی بھی رہتے تھے، سردار منوچاجی جو بالکل مسلمانوں کی طرح کھلے دل سے ملتے۔ امرتسر سے گزرتے ہوئے وہ ہمیشہ ہی اپنے ہاں بلاتے۔ پلنگوں پر سفید چادریں بچھا کر ان پر بٹھاتے۔ نئے نکور سفید اور کالے دھاگے سے بنے ہوئے کھیس بچھا کر دسترخوان لگواتے اور خالص دیجیٹیرین کھانا کھلاتے۔ چمچماتے کانسی کے کٹوروں میں لسی پلاتے۔ دیش کی بنی ہوئی پیالیوں میں سونف ملی چائے پیش کرتے۔

ہمارے امرتسر پہنچنے پر خود اسٹیشن پر ہمارا استقبال کرتے اور بڑے چاؤ سے گھر لے جاتے۔ اُن کے بیٹے، بیٹیاں، اُن کی پتنی بڑھ بڑھ کر سواگت کرتیں۔ اپنے دُکھ سُکھ اور امرتسر سے گزرنے والے پاکستانیوں کی باتیں کرتے۔ پاکستان ٹی وی کے پروگراموں پر تنقید اور تعریف و توصیف کھلے دل سے

کرتے۔ پاکستان ٹی وی کا ایک ایک اشتہار اُن کی فیملی کو ازبر تھا۔ اُنھیں پاکستانی ٹی وی کے دھارمک (مذہبی) پروگرام سب سے زیادہ پسند تھے۔ قرآنِ کریم کی تلاوت ہو رہی ہو یا بچوں کو قرآنِ پاک کی آیات سکھائی جا رہی ہوں، وہ لوگ سارے پروگرام دیکھتے۔

درسِ قرآن کے سکھ شیدائی

ان کی بیٹی روزی ایم اے کی طالبہ تھی۔ ہر وقت سر پر ململ کا موٹا دوپٹہ اوڑھے رکھتی۔ بڑے چاؤ سے ملتی۔ اس نے ایک مرتبہ مجھ سے بڑے غصہ میں کہا: ''آنٹی جی! اگر آپ کی عورتیں پاکستان ٹی وی پر مولانا اسرار احمد کو برداشت نہیں کر سکتیں، تو ٹی وی مت دیکھا کریں۔ لیکن انھیں دوسروں کا تو خیال رکھنا چاہیے۔ کیا آپ ہمارا یہ سندیسہ مولانا اور ٹی وی کے بڑے کرمچاریوں تک پہنچا سکتی ہیں کہ ہم لوگ مولانا کا پروگرام بہت پسند کرتے، دیکھنا چاہتے اور ان کی باتوں کو سمجھنا اور اپنانا چاہتے ہیں۔''

روزی کا بھائی جو اُن ہی دنوں انجینئرنگ کا کورس مکمل کر کے اپنے گھر آیا تھا، اُس نے بھی بڑے جوش و خروش سے انگریزی میں کہا:

''مذہب اور اخلاقیات صرف مسلمانوں کی میراث نہیں، یہ ورثہ سب انسانوں میں بانٹنا چاہیے۔ آپ مسلمان تو مساوات کے علمبردار بنتے ہیں۔''

''پاکستان والے یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ پڑوس کا ملک، ان کے سنتوں عالموں سے کچھ حاصل کر لے۔'' روزی نے پھر غصے اور اپنائیت سے لقمہ دیا۔

مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ہمارے دہلی کے قیام کے دنوں میں پاکستان ٹیلی ویژن پر مولانا ڈاکٹر اسرار احمد کا پروگرام ہوا کرتا تھا جس سے ہماری پاکستانی ماڈرن بیبیاں الرجک تھیں اور مولانا کی پاکستان ٹی وی سے چھٹی کروانے کا غلغلہ تھا جس کا شور پاکستان کے ہمسایہ ملک کے سرحدی علاقوں میں بھی سنا گیا اور جسے وہاں کے لوگوں نے بالکل پسند نہ کیا۔ بات عجیب تھی کہ مولانا اپنے ملک میں تو تنقید کی زد میں تھے اور بھارتی پنجاب اور کشمیر میں بے حد مقبول۔

ایک سردار جی نے کہا: ''آپ لوگوں نے یہ اچھا نہیں کیا کہ مولانا کا پروگرام بند کروا دیا۔ جس دن مولانا اسرار احمد کا پروگرام ہوتا، تو ہماری بہو بیٹیاں، ہمارے جوان، بوڑھے سبھی جلد جلد کام نمٹا کر سرِ شام ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتے۔ ہماری مُنّیوں نے تو باقاعدہ چُنّیاں لینی شروع کر دی ہیں اور اپنے بالوں کو ڈھانپنا شروع کر دیا ہے۔ دھرم کوئی بھی ہو۔ اچھی باتیں سب کے لیے ایک جیسی ہوتی ہیں۔''

ایک سردارنی نے فرمایا: ''مولانا کی باتیں دل موہ لیتی ہیں، من کو شانتی دیتی ہیں۔ اُنھوں نے تو ہمارے من ہی بدل دیے ہیں۔ پرماتما کی دیا سے ایک اچھے مہاتما کی باتیں سننے کو ملتی تھیں اور ہم پوری کوشش کرتے کہ اُن کی اچھی اچھی باتوں پر عمل کر کے ثواب (ثواب) لیں۔''

ایک جوان لڑکے نے کہا: ''ہم تو پاکستانیوں کو اپنا آئیڈیل مانتے ہیں۔ مولانا ہمیں سچی روشنی دکھاتے ہیں۔''

اور ایک سکھ لڑکی نے امرتسر میں مجھ سے بڑے تاسف سے کہا:

''افسوس آپ کی بیبیاں کچھ زیادہ ہی ماڈرن بننے کے چکر میں ہیں۔ ہمیں آپ لوگ کافر کہتے ہیں۔ کافر تو آپ کی بیبیاں ہیں جو بال کٹوا کر ننگے سر ننگے منہ سارے بازار میں گھومتی ہیں۔ آپ کی بیبیوں نے مولانا کا پروگرام بند کروا کے ہم لوگوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ ہم تو سچی روشنی، سچی لگن کی تلاش میں ہیں۔ من کی شانتی چاہتے ہیں، دلوں کا کھوٹ دور کرنا چاہتے ہیں۔ بے حیائی سے بچنا چاہتے ہیں۔''

میز بانی ہندوؤں کی

امرتسر کلب میں بھی جانا ہوا۔ امرتسر میں ہماری ایک

دوست ہندو فیملی رہتی تھی، یش اور کرن اَروڑا۔ ایک مرتبہ ہم پاکستان جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک اور پاکستانی فیملی بھی سفر کر رہی تھی۔ مسز راس مسعود اور اُن کے تین عدد بچے۔ راس مسعود بھی دہلی میں تعینات تھے۔ ٹرین میں ساتھ کے کیبن میں یش فیملی بھی اپنے دو بچوں کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ اُنھوں نے سب سے پہلے میرے چھوٹے بیٹے کے ساتھ دوستی بڑھائی اور ساری معلومات حاصل کیں، اور پھر عائشہ (مسز راس مسعود) سے اپنا تعارف کروایا، مگر عائشہ نے کچھ التفات نہ کیا اور میرے کان میں کہا کہ یہ سب ویزے کا چکر ہے۔ آپ بھی بات آگے نہ بڑھنے دیں، لیکن مسز کرن ایش اُٹھ کر ہمارے کیبن میں آ گئیں اور اپنا تعارف کروا کر ہمارے پاس بیٹھ گئیں۔

امرتسر اسٹیشن پر اُترے، تو تیز بارش ہو رہی تھی۔ صبح سات بجے کا ٹائم تھا اور ہمارا اسٹیشن ہی پر ناشتہ کرنے کا پروگرام تھا۔ امرتسر سے واہگہ تک ٹیکسی ایک گھنٹے میں آسانی سے پہنچا دیتی۔ یش فیملی کی کار اُنھیں لینے آئی ہوئی تھی۔ ہمیں پوچھے بغیر ہی اُنھوں نے ٹیلی فون کر کے اپنے گھر سے ایک عدد مزید گاڑی منگوا لی۔ یش اور کرن ہمارے سر ہو گئے کہ ناشتا ہمارے گھر چل کر کریں۔ اُنھوں نے اِتنا اصرار کیا کہ ہمیں مجبوراً جانا پڑا۔

یش نے کرن اور ہم دونوں عورتوں اور بچوں کو کار میں بٹھا کر پہلے روانہ کر دیا اور خود دُوسری گاڑی کے انتظار میں رک گئے۔ شہر سے خاصا دُور اُن کے بنگلے کے آگے کار رُکی۔

ہم برآمدے ہی تک پہنچے تھے کہ یش ہمارے دونوں بیٹوں اور حفیظ کو لے کر پہنچ گئے۔ کرن مجھے، عائشہ اور اس کے بچوں کو سیدھا اپنے کمرے میں لے گئیں۔ حفیظ اور بیٹوں کو یش نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ کرن نے جلد جلد اپنے چھوٹے بچے کی آیا کو کچھ ہدایات دیں اور خود ڈرائی فروٹ وغیرہ سے ہماری خاطر مدارت میں لگ گئی۔ سب کے ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہونے تک ڈائننگ روم میں ناشتہ لگ گیا۔

امرتسر پر گھٹا خوب چھائی تھی۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ موسلا دھار بارش راستے میں شروع ہو گئی تھی۔ گھر پہنچنے تک چھاجوں مینہ برسنے لگا۔ امرتسر کی بارش تو مشہور ہے۔ اِتنے میں بجلی بھی چلی گئی۔ دسمبر یا غالباً جنوری کا مہینہ تھا۔ سخت سردی میں خنک کمرے، بجلی کا ہیٹر لائٹ کے ساتھ ہی بند ہو گیا تھا۔ آیا نے کمرے میں موم بتیاں جلائیں۔ میں اور عائشہ، کرن کو اپنے ہاں کی سوئی گیس سے متعارف کرانے لگیں۔ اور دِل میں سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنی نعمتوں سے نواز رکھا ہے، لیکن ہم ناشکرے پاکستانی، بے پناہ نعمتوں کے باوجود ناآسودہ، اپنے حال پر گلے شکوے کرنے والے، اپنے وطن کو برا بھلا کہنے والے اور اَغیار کو سہلانے والی قوم بن چکے۔

آدھ گھنٹہ بجلی کے آنے کا انتظار کیا، لیکن بے سُود۔ ناچار اندھیرے ہی میں موم بتیوں کی روشنی میں ناشتہ کیا۔ کالے بادلوں کی وجہ سے گھٹا ٹوپ اندھیرا رات کا سماں پیش کر رہا تھا۔ اُوپر سے کڑاکے کی سردی۔ کرن کا پنڈت رسویا، بارش کو کوسنے دیتا، گرم گرم پوریاں، بھاگ بھاگ کر میز پر پہنچا رہا تھا۔ دو تین قسم کا حلوہ، مٹھائی اور کیک، میز پوری بھری تھی۔ ہم لوگوں نے گرم گرم پوریاں اور کچوریاں کھائیں۔ حلوے کا ایک آدھ چمچ لیا اور گرم گرم کافی معدے میں اُنڈیلی، مگر ٹھنڈ دُور ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

پُرتکلف ناشتہ کرنے کے بعد ہم لوگ برآمدے میں نکل آئے۔ اُوپر کی منزل سے کرن کے جیٹھ اور جیٹھانی بھی پشمینے کی شالوں میں لپٹے اُتر آئے۔ سارے لوگ اکٹھے ہوئے، تو

پاکستان پر باتیں ہونے لگیں۔ معلوم ہوا کہ یش کے بھائی اور بھابھی چند دن پہلے پاکستان کی یاترا سے واپس آئے تھے اور پنڈی باڑہ میں اُنھوں نے جی بھر کر شاپنگ کی تھی۔

یش برادران کی امرتسر میں سوپ فیکٹری تھی۔ کرن بھی دہلی کے فرشتہ سوپ فیکٹری والوں کی بیٹی تھی جو ہر روز ایک نئی پشمینہ کی شال اوڑھتی اور وہائٹ گولڈ سے لدی پھندی رہتی۔ اس کا باپ سورگ باش ہو چکا تھا اور وِدھوا ممی فیکٹری کا کاروبار سنبھالے تھی۔ اس کی جیٹھانی بڑے پُرغرور انداز میں باتیں کر رہی تھی اور جیٹھ رام راجیہ کے سپنے میں لیٹا اور مہا بھارت کا ارجن بنا اپدیش دے رہا تھا: ''دھرتی کے سب باسی ایک ہیں۔''

موسلا دھار بارش رکنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ یش صاحب حفیظ اور دونوں بیٹوں کو لے کر سوپ فیکٹری دکھانے چلے گئے جس میں چاول کی بھوسی سے تیل نکال کر صابن بنایا جاتا تھا۔ میں اور مسز مسعود اَب پریشان ہونے لگیں۔ لاہور میں ہم لوگوں نے اپنے پہنچنے کی اطلاع کی ہوئی تھی۔ خیر تیز بارش ہی میں ہم لوگ واہگہ کے لیے روانہ ہوئے۔ کرن اور یش نے ہماری واپسی کے ٹکٹ رکھوا لیے اور وعدہ لیا کہ ہم لوگ واپسی پر بھی ان لوگوں سے مل کر جائیں گے۔

میرا اَور حفیظ کا دل نہ چاہا کہ ان سے بے اعتنائی کی جائے۔ واپسی پر میں بادام اور کینو کی کچھ پیٹیاں دہلی میں اپنے پڑوسیوں اور ملنے جلنے والوں کے لیے لے کر آئی تھی۔ سوچا کہ ایک پیٹی کرن اور یش کو بھی دیتے چلیں۔ اسی رات ہمیں بذریعہ ٹرین دہلی بھی پہنچنا تھا۔ یش اور کرن شدت سے ہمارے آنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ سہ پہر کو ہم لوگ پہنچے۔ شام کو یش اور کرن ہمیں امرتسر کلب لے گئے۔ گپ شپ ہوتی رہی۔ وہ دونوں پاکستان کے متعلق معلومات لیتے رہے۔ لاہور دیکھنے کے وہ بڑے مشتاق تھے۔ رات کا کھانا کلب سے سنیک وغیرہ لے کر پورا کیا۔ ڈرتے ڈرتے صرف مچھلی ہی منگوائی اور سبزی کا سوپ پیا۔ ان لوگوں نے بڑا اِصرار کیا کہ مٹن کا بنا ہوا کچھ کھائیں۔

دراصل نان ویج ہندو ہر قسم کا گوشت کھا لیتے ہیں۔ چاہے وہ سؤر کا ہو، بکرے کا یا گائے کا، انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم لوگ صرف حلال گوشت کھاتے ہیں۔ انھیں حلال وحرام کا فرق بتایا، تو وہ کچھ حیران ہوئے۔

مسلمان عورتوں کی سگھڑ اولاد

''دہلی میں میری ممی کے ہاں جو گوشت پکتا ہے، وہ بڑے مزے دار ہوتا ہے۔ ویسا مزے دار گوشت امرتسر میں نہیں ملتا۔ ممی شاید مسلمانوں کی دکان سے منگواتی ہیں اور یہاں تو سکھ لوگ بیچتے ہیں جو نہایت گندے ہوتے ہیں۔ تبھی ان کے ہاں کا گوشت اچھا نہیں ہوتا۔'' کرن نے ناک سکیڑتے ہوئے بتایا۔ وہ حلال وحرام کو بالکل سمجھ نہیں پائی تھی۔

پھر سکھوں کی باتیں ہونے لگیں۔ ''یہ نہایت گندی اور جنگلی قوم ہے۔ انھوں نے سارے ملک کو گندا کیا ہوا ہے۔ بالکل لٹیرے، چور اَور ڈاکو ہیں۔'' دونوں نے بڑی نفرت کا اظہار کیا: ''ہم تو انھیں بالکل منہ نہیں لگاتے۔''

''ہم نے تو سنا تھا کہ سکھ لوگ بڑے چوڑے چکلے، لامبے اور بڑے رف قسم کے جانگلی ہوتے ہیں، لیکن آج کل کا نوجوان سکھ تو خوش شکل اور دَھان پان سا ہے۔ اگر ڈاڑھی نہ رکھیں، تو بڑے وجیہہ نظر آئیں۔'' میں نے باتوں ہی باتوں میں کرن سے کہا۔

وہ ایک دم چونکی۔ ''یہ تو مسلمانیوں (مسلمان عورتوں) کی اولادیں ہیں۔ دیکھا نہیں سکھنیاں کتنی سندر ہیں۔ آپ جانیں، مسلمانیاں تو بڑی کومل اور سندر ہوتی ہیں۔ ان جانگلیوں نے 1947ء میں مسلمانوں کی ہزاروں لاکھوں

عورتیں اور سپتریاں چھین کر اپنے گھروں میں ڈال لی تھیں۔'' کرن نے میرے کان میں سرگوشی کی ''یہ سب ان کے پتر، پتریاں ہیں۔''

یہ بات میں پہلے بھی دہلی میں اکثر ہندو عورتوں سے سن چکی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ہماری امی ہمیں سنایا کرتی تھیں کہ 1947ء سے پہلے ہمارے والد صاحب پنجاب میں کہیں تعینات تھے۔ جس علاقے میں انھیں گھر ملا، وہاں زیادہ تر سکھوں کے مکان اور حویلیاں تھیں۔ کرائے کا مکان بھی ایک سکھ کی ملکیت تھا۔

اتفاق سے پڑوس میں جو حویلی تھی، وہاں ایک وڈیرے سردار کی بیوی مسلمان تھی جس نے میری امی کے ساتھ دوستی کرنی چاہی تھی لیکن امی اس سکھ کی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ نفرت سے تھوک دیتیں اور کہتیں کہ وہ عورت ضرور بدچلن ہوگی جو سکھ کی بیوی بنی بیٹھی تھی۔ وہ بتاتی تھیں کہ سکھوں کے اکثر گھروں میں ایک بھائی بیاہ کر دلہن لے آتا ہے اور وہ باقی سب بھائیوں کی مشترکہ دلہن ہوتی۔ اکثر سکھ کنوارے ہی بوڑھے ہوجاتے یا گیانی بن جاتے تھے۔

کلب میں بھی زیادہ تعداد سکھ نوجوانوں کی تھی۔ بہت سے لوگوں کے باوجود کلب میں ذرا رونق نہ تھی۔ در و دیوار سے نحوست ٹپک رہی تھی۔ لوگ مدھم روشنی میں مے نوشی میں مشغول تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے والی دیوار کا رنگ بھی بالکل سیاہ تھا اور اس پر کسی دیوی کا ڈراؤنا سر سجا تھا۔ کالے چہرے پر سفید آنکھیں تھیں۔

ہمیں دہلی پہنچے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک سہ پہر تین بجے کے قریب کسی خاتون کا ٹیلی فون آیا:

''نمستے بہن جی، میں کرن کی ممی بول رہی ہوں، امرتسر والی کرن کی۔ ویش اور کرن آج کل یہاں دہلی میں آئے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ آپ کے ہاں آنا چاہتے ہیں۔''

''ویلکم'' میں نے کہا۔ ''آج شام آجایئے۔''

شام کو کرن، اس کی ممی اور ایک آنٹی آئیں۔ میں نے ویش کا پوچھا، تو انھوں نے بتایا کہ ویش ہمارے ہی کام کے لیے گئے ہوئے ہیں، اس لیے ساتھ نہیں آسکے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پاکستان جانا چاہتی ہیں۔ ہمیں یہ بات پہلے سے معلوم تھی۔ کرن نے پاکستان دیکھنے کا ذکر امرتسر ہی میں کر دیا تھا۔ اس کی جیٹھانی پاکستان یاترا کر آئی تھی۔ بھلا کرن پیچھے کیوں رہ جاتی؟ لیکن قصہ صرف کرن اور ویش کے جانے کا نہیں تھا۔ وہ تو سارا خاندان جس میں بارہ تیرہ لوگ تھے، سب اکٹھے جانا چاہتے تھے اور وہ بھی لاہور.....

اُن دنوں ہندوؤں کے لیے دھرم استھانوں کی یاترا کے لیے بھی ویزے جاری نہیں ہوتے تھے۔ ادھر ویش فیملی کے کوئی رشتہ دار بھی لاہور میں نہیں رہ رہے تھے جو اُن سے ملنے کے بہانے ہی ویزہ جاری ہوجاتا۔ ان کی قسمت.....!

ہندو اَور لاہور کی سندرتا

انھی دنوں لاہور میں کرکٹ میچ ہونے والا تھا۔ ایمبیسی سے دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ لوگوں کی پُرزور اپیل پر ایک آدھ روز پہلے ہی پاکستانی حکومت کی طرف سے ویزہ جاری کرنے کی عام اجازت مل چکی ہے۔ حفیظ نے دوسرے دن پاکستانی سفارت خانے سے ان سب کو ویزے دلوا دیے۔ کچھ دنوں کے بعد امرتسر سے ہمیں شکریے کا خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا:

''ہم نے جی بھر کے لاہور کی سیر کی۔ امرتسر سے صرف اڑتیس کلومیٹر دُور ایک نئی دنیا دیکھ کر آئے ہیں۔ بڑی حسین ..... بڑی خوبصورت، بڑی ہی سندر دُنیا۔ اس کی سندرتا دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ہم سے اِتنے تھوڑے فاصلے پر ایک نئی دنیا

آباد ہے۔"

اور یہی نئی دنیا ہم ہندوؤں کو دکھانا چاہتے تھے۔ خاص طور پر پنجابی ہندوؤں کو، جن کا خیال تھا کہ مسلمان ایک دن بھی پاکستان کو سنبھال نہ سکے گا۔ وہ پاکستان جس میں کاغذ، قلم اور دَوات تک نہ تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ اپنی آنکھوں سے پھلے پھولے، خوشحال پاکستان کو دیکھیں، صحت مند اور رَوشن چہروں والے لوگوں سے ملیں۔ ان بے یار و مددگار لُٹے قافلوں کے آبلہ پا خستہ و درماندہ مسافروں اور ان کی اولادوں کو دیکھیں کہ وہ اب کن جنتوں میں رہتے ہیں۔

آپریشن بلیو اسٹار پر ہندوؤں کی خوشی

بعد میں یش فیملی سے خاصی دوستی بڑھ گئی۔ کرن جب دہلی آتی، ضرور ملتی۔ اس نے دہلی میں اپنے ایک کزن کی شادی پر بھی ہمیں مدعو کیا۔ آپریشن بلیو اسٹار پر وہ بہت خوش تھے۔ خاص طور پر کرن۔ وہ ہمارے ہاں آئی، تو اس نے کہا:

"دیکھا ہم نے سکھوں کو کیسا مزہ چکھایا؟ خالصتان مانگتے تھے۔ آئے دن یہ جانگلو وحشی ہمیں یعنی ہندوؤں کو دھمکاتے، آنکھیں دکھاتے، ہمارے معصوم و بے گناہ لوگوں کو قتل کرتے، گولیوں سے بھونتے، ہمارے گھروں میں ڈاکے ڈالتے، ہماری حکومت کا پیسہ لُوٹتے۔ ہمیں کہتے کہ پنجاب چھوڑ دو۔ دیکھا ہم نے اُن کا کیسا حساب چکایا ہے؟ وہ تو ہمیں پنجاب سے نکالتے تھے، ہم نے انھیں جگ سے ہی نکال باہر کیا اور ساتھ ہی ان کے نیتا جی بھنڈرانوالا کو سیدھا پرلوک بھجوا دیا۔"

کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ کرن پھر دہلی آئی۔ تب جو ہمارے ہاں آئی، تو کچھ روہانسی تھی، کچھ پریشان..... معلوم ہوا کہ امرتسر کے حالات اِتنے مخدوش ہو چکے کہ کرن کو اپنا بڑا بیٹا کرن، نانی کے ہاں دہلی میں چھوڑنا پڑا اور خود اَپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ، ماری ماری کبھی دہلی اور کبھی امرتسر کے چکر کاٹتی۔ امرتسر میں بھرا پرا گھر بڑے بیٹے کے بغیر کاٹنے کو

دوڑتا اور پھر گھر لُٹنے کا بھی خدشہ رہتا۔ وہ اپنا سارا کاروبار سمیٹ کر دہلی میں مستقل آباد ہونے کا سوچ رہی تھی۔ یش بھی دہلی کے کئی پھیرے لگا چکے تھے اور اَپنے کاروبار کے متعلق نہایت فکرمند تھے۔ بے چاری یش فیملی، دیکھیں امرتسر کا حساب کتاب کب چکاتی ہے۔

پھر دیکھتے دیکھتے بھارت میں پنجاب پر البلم نے پنجاب کا راستہ غیر ملکیوں کے لیے بند کر دیا۔ آپریشن بلیو اسٹار نے سب کچھ تہ و بالا کر دیا۔ امرتسر خون میں نہا گیا۔ ہندوؤں نے سکھوں کو گولڈن ٹیمپل میں ان کے اپنے ہی خون میں ہولی ڈپ دے دیا تھا۔ توپوں کے دہانوں نے اتنی آگ اگلی کہ اس کے دھوئیں میں سارا شہر تاریک ہو گیا۔ گھبرو جوانوں کا شہر، بھوتوں کا شہر بن گیا تھا۔ گولیوں کی بارش نے سکھ مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں کے سینے چھلنی کر دیے۔ فوجی گاڑیاں اور ٹینک امرتسر کا سینہ کوٹنے لگے۔

ہر طرف فوج کا راج تھا اور مشین گنوں کا راج..... وہ دھنک رنگ جگمگ کرتی دکانیں، جھلملاتی چوڑیاں، رنگ برنگی چُنیاں اور پگڑیاں، چمکیلے نگوں کے ڈھیر، سب اندھیاروں میں ڈوب گئے۔ تاریکیاں پھیل گئیں، وحشت بڑھ گئی۔ بہیمیت نے پنجے گاڑ دیے۔

ہندو کہتا ہے سکھ مقابلے میں مارے گئے اور اِتنے سکھوں نے خودکشی کر لی۔ وہ کبھی نہیں بتائے گا کہ اس نے کتنے ہزار جوان اور سندر بالک، اپنی ناگن مہارانی اندرا براہمن دیوی کی بھینٹ چڑھا دیے۔ براہمن دیوی کی موت کے بعد سکھوں نے ہندوؤں سے روٹی بیٹی کا ناتا توڑ لیا۔ اب شاید کبھی ان کی یکجائی نہ ہو۔ سکھوں نے اپنا ناتا مرکز سے بھی توڑ لیا۔ اور وہ اپنے ہی غم کی آندھیوں میں نڈھال ع

پتہ ٹوٹا ڈال سے پون اُڑائے جائے

1947ء کے خوں آشام دور پر پنجاب کی ایک سکھ بیٹی

امرتا پریتم نے پنجاب کا نوحہ لکھا تھا۔

چھتیس سال بعد امرتا پریتم کی اپنی دھرتی کی ناگن نے اس کے بھائیوں کو ڈس لیا۔ اس کے بیٹوں کی رگوں میں زہر اُتار دِیا جس کو ان نرم و نازم کونپلوں، ان کومل کلیوں کو شاخوں سے نوچ لیا تھا۔ ان سوہنیوں کو ٹھنڈے پانیوں کے کناروں سے اُٹھا کر اپنی کچھاروں میں لے جا کر بند کر دیا تھا۔ وہ سکھ بیٹوں کی مسلمان

ہندوستان میں پہلا یوم آزادی کیسے منایا گیا؟

موقر اخبار انقلاب کے سینئر صحافی فضیل جعفری بتاتے ہیں کہ 'ہر طرف صرف خوشی کا سماں تھا۔ 1947 میں آزادی کی خوشی میں جہاں بہت کچھ ہوا وہاں یہ بھی ہوا کہ جو بچے کسی جماعت میں فیل ہو گئے تھے انھیں پاس کر دیا گیا تھا۔ میں ساتویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا اور مجھے آٹھویں جماعت میں بھیج دیا گیا۔ میں پہلا یوم آزادی کبھی نہیں بھول سکتا کیونکہ اس کے بعد میں کبھی فیل نہیں ہوا۔'

☆☆☆

معروف نقاد اور ادیب شمس الرحمن فاروقی کے بقول پہلے یوم آزادی کا جشن ان کے ہندوستانی ہونے کے پہلے احساس کی یاد دلاتا ہے۔ 'ہمارے اسکول میں یوم آزادی کو ایک جلسہ ہوا تھا۔ اور اس جلسے میں ہمارے اسکول کے منیجر جو آسٹریلین تھے آئے اور انھوں نے ہمارے جھنڈے کے سامنے اپنی ٹوپی جھکائی۔ میرے والد صاحب نے کہا کہ کل تک جو لوگ ہمارے جھنڈے کو پیروں تلے روندتے تھے وہ اسے سلام کر رہے ہیں۔ اس وقت میں نے بڑا فخر محسوس کیا۔'

☆☆☆

اس کے آباء نے اپنی دھرتی کی مہارانی بنایا تھا۔ اس کے بھائیوں نے مہارانی کے پریوار کو راج سنگھاسن پر بٹھایا تھا۔

''اے بی بی امرتا پریتم! تیرے دیش واسیوں نے تیرے بیٹوں کو موت کی ناؤ میں بٹھا کر فنا کے گھاٹ اُتارنا شروع کر دیا۔ تیرے بیٹوں کو ہی نہیں بلکہ ان بدنصیب مسلمان ماؤں کے سکھ بیٹوں کو بھی نرک کے گھور اندھیاروں میں دھکیلنا شروع کر دیا جن کو تیرے بھائیوں نے 1947ء کی خون آشام دوپہروں میں ان کے پیاروں سے چھین لیا تھا۔

مائیں۔ کیا ان ماؤں کی وہ المناک سزائیں کم تھیں.....؟

جیون نے جو قطرہ قطرہ زہر ان کی سانسوں، ان کے رگ و پے میں ٹپکایا، کیا وہ زہر، وہ نوکیلے برچھوں کی انیاں ناکافی تھیں؟

آؤ امرتا پریتم، اب ایک نیا گیت لکھو، موت کا گیت۔ اپنے بھائیوں کی موت کا گیت، اپنے بیٹوں کی موت کا گیت، ایک نیا نوحہ لکھو۔ آنسوؤں سے بھرا نوحہ ع

ایک نیا بین لکھو، لہو بھرے پنجاب کا''

◆◆◆

ڈاکٹر جاوید اقبال

برساتی بیماریاں

برسات کی آمد آمد ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برسات کا موسم انسان کے اندر کچھ ولولے اور رعنائیاں بھی لے آتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی مہینے میں چند ایسے عوارض بھی آگھیرتے ہیں جن کی طرف سے لاپروائی برتی جائے تو یہ جان لیوا ثابت ہوسکتے ہیں۔ ان امراض کی فہرست بنائی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ انتہائی عام سے امراض ہیں لیکن ذرا سی بے احتیاطی انھیں بڑھا دیتی ہے۔ ان امراض کی مختصراً فہرست بنائی جائے تو درج ذیل ہے:

ناصاف پانی پینے کے سبب لاحق امراض:

پانی جسم انسانی کی بناوٹ اور اس کی مشینری کے اندر انجام پانے والے مختلف قسم کے افعال میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی یا کمی کی صورت میں انسانی جسم اپنے افعال میں ناکامی سے دوچار ہوجاتا ہے۔ گندا اور غلاظت بھرا پانی انسانی جسم میں بے شمار امراض جنم دینے کا سبب ہے۔ برسات کے موسم میں جہاں اور بہت سے امراض آن گھیرتے وہیں پر گندے پانی کی بھی بہتات ہوتی ہے اور اس پانی کے استعمال سے درج ذیل امراض لاحق ہو سکتے ہیں جو بگڑ جانے کی صورت میں جان لیوا ہو سکتے ہیں۔

☆ ہیضہ:

اس کے ذمہ دار بیکٹیریا عموماً جراثیم سے آلودہ غذا، پانی، کچی سبزی یا پھل وغیرہ کے ذریعے انہضام کے اعضاء میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناصاف برتن یا گندے ہاتھ جن پر جراثیم لگے ہوں، بیماری کی چھوت لگنے کا سبب بنتے ہیں۔ بیکٹیریا کی معدے میں آمد پر معدے کا تیزابی مادہ اسے راس نہیں آتا جس کی وجہ سے بیکٹیریا کی اکثریت مرجاتی ہے لیکن باقی رہ جانے والے جراثیم چھوٹی

بعض اوقات معمولی سا مرض بھی بڑھ کر چھوت اور جان لیوا بن جاتا ہے

آنت تک پہنچ کر مناسب ماحول اور غذا کی فراوانی کے سبب اپنی تعداد میں سُرعت سے اضافہ کرتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچتی ہے۔

چھوٹی آنت میں بیکٹیریا کی کثرت زہریلے مادے ٹوکسن کا سبب بنتی ہے جو چھوٹی آنت کی اندرونی دیوار کو راس نہیں آتا اور وہ متاثر ہونے لگتی ہے۔ آنت کی اندرونی سطح کے خلیے چھٹنے لگتے ہیں۔ (بالکل ایسے ہی جیسے سردیوں کے موسم میں جلد سے خشکی نکلتی ہے)۔

بعدازاں یہ بیکٹیریا چھوٹی آنت میں پانی اور نمکیات کے انجذاب کو روکتے اور نمکیات خارج کرتے ہیں۔ اس طرح جسم سے بہت سا پانی خارج ہوجاتا ہے اور مریض پانی کی کمی Dehyderation کا شکار ہوجاتا ہے۔ عام ہیضہ میں قے اور دست کے ساتھ پیٹ میں سخت مروڑ کی کیفیت لیکن بند ہیضہ میں دست اور قے بالکل نہیں ہوتے صرف مروڑ کے ساتھ پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے۔ مریض کو گھبراہٹ محسوس ہوتی اور وہ انتہائی کمزور اور لاغر ہوجاتا ہے۔

یہ شدید اور متعدی بیماری ہے جو ایک شخص سے دوسرے کو لگ سکتی ہے۔ اس لیے اسے وبائی بیماری بھی کہہ سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ بیماری برسات کے موسم میں ہی پھیلتی ہے۔ اس بیماری کا زمانہ حضانت (Incubation Period) دو سے لے کر پانچ ایام تک ہوتا ہے۔ مرض کی شدت مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے۔ بعض اوقات مرض اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ مریض بستر میں بآرام لیٹنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور بعض اوقات یہ مرض اتنا شدید اور خطرناک ہوتا ہے کہ مریض ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر موت کی آغوش میں جاسکتا ہے۔ اس مرض سے بچاؤ کے لیے درج ذیل تدابیر پر عمل ضروری ہے:

۱۔ پانی اُبال کر ٹھنڈا کر کے استعمال کریں۔
۲۔ تازہ اور صاف ستھرے پھل اور سبزیاں اچھی طرح دھو کر استعمال کریں۔
۳۔ کھانے پینے کی اشیاء کو مکھیوں سے بچا کر رکھیں۔
۴۔ ہیضہ کے مریض کے پاخانہ اور اُلٹی وغیرہ پر جراثیم کش ادویہ ڈال دیں یا گڑھا کھود کر دبا دیا جائے۔
۵۔ جسم کی حدت برقرار رکھنے کے لیے مریض کی گرم بوتل کے ذریعے مالش کرتے رہنا چاہیے۔
۶۔ کچی پیاز کا زیادہ استعمال ہیضہ سے بچاؤ کا مؤثر ذریعہ ہے۔
۷۔ ہیضہ طفلی میں بچے کو تازہ ہوا بکثرت ملنی چاہیے اور اگر موسم اجازت دے تو بچے کو باہر کھلی جگہ رکھنا بہتر ہوتا ہے۔
۸۔ نیم گرم پانی سے کپڑا بھگو کر مریض کا جسم صاف کرتے رہیں۔
۹۔ مریض کی غذا سیال اور مقوی ہونی چاہیے۔
۱۰۔ مریض کے آرام کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

☆ ٹائی فائیڈ بخار:

ٹائیفائیڈ آنتوں کے انفیکشن کو کہتے ہیں۔ ٹائیفائیڈ کے جراثیم آلودہ پانی اور غذا کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ ترقی پزیر ممالک میں صحتِ عامہ کی سہولتوں کا فقدان اور گندے پانی کی نکاسی کا ناقص نظام اس بیماری کی بلند شرح کا باعث ہے۔ یہ ایک متعدی مرض ہے جو ''سالمونیلا ٹائی فی'' (Salmonella typhi) نامی جرثومے سے پھیلتا ہے۔ یہ بیکٹیریا صرف انسانی جسم کے اندر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ ٹائیفائیڈ کے مریضوں میں یہ بیکٹیریا خون اور آنتوں میں پایا جاتا ہے۔ سالمونیلا نامی جرثومے کی کئی اقسام ہیں جو انسانی آنتوں کو نشانہ بناتی ہیں۔ ان کی وجہ سے جو بخار ہوتا ہے اسے امعائی یعنی آنتوں کا بخار کہتے ہیں۔

اس جراثیم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف انسانوں میں پھلتا پھولتا اور ایک انسان سے دوسرے انسان کو لگتا ہے۔ جنہیں کبھی یہ بخار ہوا ہو، ان میں صحتیابی کے بعد بھی یہ جراثیم کم از کم ایک سال تک موجود رہتے ہیں۔ ایسے افراد کو طبّی زبان میں کیریئرز (Carriers) کہتے ہیں۔ ٹائیفائیڈ کا بیکٹیریا بیمار اور کیریئرز، دونوں میں فضلے کے ذریعے خارج ہوتا رہتا ہے۔

یاد رہے کہ ٹائیفائیڈ کا خطرہ علامات غائب ہوجانے کے باوجود برقرار رہتا ہے۔ ایسی صورت میں بیماری دوبارہ نمودار ہوسکتی یا آپ انجانے میں یہ مرض دوسروں کو بھی منتقل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ ٹائیفائیڈ سے حالیہ متاثر ہیں یا ماضی میں اس کا شکار رہ چکے اور ایسی جگہ ملازمت کرتے ہیں جہاں آپ کھانے پینے کی اشیاء یا چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال پر مامور ہیں تو اس وقت تک اپنی ملازمت پر نہ جائیں جب تک آپ کا معالج اس بات کی حتمی تصدیق نہ کردے کہ آپ مکمل طور پر صحتمند ہو چکے۔ بیماری کے مکمل خاتمے کا اطمینان فضلہ کے ٹیسٹ (Stool Culture) کے بعد ہی ہوتا ہے۔ آپ کے جسم میں اگر ٹائیفائیڈ کے جراثیم بالکل موجود نہیں تو فضلہ میں سالمونیلا ٹائیفائی نہیں ملے گا۔ اس عارضے سے بچاؤ کے لیے چند باتیں یاد رکھیں:

☆.....قیمہ:

قیمہ اور اس سے بننے والی اشیاء بشمول کباب اور برگر وغیرہ میں یہ جراثیم بڑی تیزی سے پروان چڑھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہونے والے کسی بھی طرح کے انفیکشن سے بچنے کے لیے قیمے کو اچھی طرح پکانا چاہیے۔ کچے گوشت اور قیمہ والے برتن، وہ جگہ جہاں اسے رکھا گیا ہو اور اپنے ہاتھوں کو گرم پانی اور صابن سے اچھی طرح دھولینا چاہیے۔

☆.....چکن:

کچی یا نیم پکی ہوئی مرغی کا گوشت ٹائیفائیڈ اور کھانے کے ذریعے پھیلنے والی بیماری (فوڈ پوائزننگ) والے جراثیم کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مرغی کے کچے گوشت سے ٹپکے ہوئے خون یا خون آلود پانی کو پکے ہوئے اور تیار شدہ کھانے پر نہ گرنے دیں۔ پولٹری کی تمام اشیاء کو اچھی طرح 180 درجہ سینٹی گریڈ پر پکائیں۔ اس درجہ تک پکنے کے بعد گوشت اندر سے گلابی رنگ کا دکھائی نہیں دیتا۔ نیم گرم درجۂ حرارت ٹائیفائیڈ کے جراثیم کی افزائش کے لیے موزوں ہے۔ اس لیے مرغی کے گوشت سے بنے تمام کھانے گرم گرم استعمال کر لینے چاہئیں اور جو بچ جائیں انھیں فوراً فریج میں رکھ دینا چاہیے۔

☆.....انڈے:

انڈوں کو خوب اچھی طرح پکا کر استعمال کریں۔ کچے انڈے فریج میں یا ٹھنڈی جگہ رکھیں۔ انڈہ پکانے کے فوراً بعد استعمال کرلیں۔ کچے انڈے سمیٹنے کے بعد ہاتھ ہمیشہ گرم پانی اور صابن سے دھوئیں۔

☆.....سبزیاں اور پھل:

سبزیاں اور پھل ہمیشہ تازہ تازہ استعمال کریں۔ استعمال سے پہلے انھیں خوب اچھی طرح دھولیں۔

☆.....پانی یا مشروب:

پینے کا پانی اُبال کر استعمال کریں۔ اس میں یا مشروبات میں ایسی برف استعمال نہ کریں جو آلودہ پانی سے تیار کی گئی ہو۔

☆ہیپاٹائٹس اے:

ہیپاٹائٹس اے کا وائرس ٹائیفائیڈ کی طرح ہی پھیلتا ہے۔ یہ ایک متعدی کیفیت اور ایک خاص قسم کا وائرس ہے جس کا نام HAV ہے۔ اس کے جسم میں سرایت کر جانے سے جگر متاثر ہونے لگتا ہے۔ یہ عمومی طور پر ترقی پزیر ممالک

میں عام اور چھوٹے بچوں میں عموماً بچپن کے یرقان کا باعث بنتا ہے۔ عموماً لوگ اس وائرس کو زیادہ خطرناک نہیں سمجھتے، اس لیے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔

یہ درست ہے کہ اس سے متاثرہ افراد بڑی اور سی کی نسبت کم خطرے میں ہوتے اور عموماً پوری طرح صحت یاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن یہ امکان رَد نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے متاثرہ افراد بھی بہت سی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وائرس اے کے پھیلاؤ کے اسباب بھی برسات کے موسم میں عام ہوتے ہیں جیسے، صاف پانی کی عدم دستیابی، استعمال شدہ پانی یا گٹر کی پانی کی نکاسی کا ناقص انتظام، شہری آبادی میں بے ہنگم اضافہ اور گندگی کا اضافہ وغیرہ۔

یاد رہے کہ ہیپاٹائٹس اے کا وائرس مریض کی انتڑیوں میں سے پاخانے کے راستے خارج ہوتا ہے۔ مکھیوں کا کھانے پینے کی چیزوں پر بیٹھنا، ہاتھوں کو رفع حاجت کے بعد اچھی طرح نہ دھونا اور کھانے پینے کی اُن چیزوں کو ہاتھ لگانا جنہیں دیگر تندرست افراد بھی استعمال کریں، ان اسباب سے ہیپاٹائٹس اے پھیلنے کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔

عموماً اس مرض سے متاثرہ مریض کا کھانا پینا بند کر دیا جاتا ہے مگر واضح ہو کہ اس مرض کے لیے پرہیز بھی کوئی خاص نہیں، ہاں اتنا خیال رکھیں کہ مریض کو بہت زیادہ چکنائی نہ دیں (جو ویسے بھی زیادہ مناسب نہیں) دیگر اشیاء جیسے دُودھ، دہی، دال، چاول، روٹی، سالن (گھر کا پکا ہوا)، پھل و سبزیاں وغیرہ تمام اشیاء استعمال کروائی جا سکتی ہیں۔

مشروبات کا استعمال زیادہ کرائیں اور مریض کو زیادہ محنت والے کام نہ کرنے دیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ آرام کر سکے۔

☆اسہال:

برسات کے موسم میں لاحق ہونے والا عام عارضہ اسہال بھی ہے۔ بار بار پتلا اور نرم پاخانہ خارج ہو تو اسے اسہال کا نام دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ کوئی بیماری نہیں بلکہ بیماری کی علامت ہے۔ اصل مرض انتڑیوں اور معدہ کی مخاطی جھلی کی سوزش ہے۔ اس کی وجہ سے ہاضمہ کا نظام خراب یا کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس مرض میں عام طور پر پیچش کی طرح مروڑ نہیں پڑتے اور زور بھی نہیں لگانا پڑتا۔ پانچ سال سے کم عمر بچوں کی ہونے والی اموات میں ایک تہائی کا سبب اسہال ہی ہے۔ یہ مرض پیدا کرنے والے جراثیم مختلف علاقوں میں مختلف ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ مختلف موسموں میں مختلف قسم کے جراثیم حملہ آور ہوتے ہیں لیکن برسات کا موسم ان جراثیموں کا پسندیدہ موسم ہے کیونکہ اس سیزن میں یہ اپنی نمو بہت زیادہ کرتے ہیں۔ اسہال کے تقریباً ایک تہائی کیسز وائرس کے ذریعہ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں ''روٹا'' نامی وائرس زیادہ عام ہے۔ باقی ماندہ مریض بیکٹیریا یا مختلف قسم کے جراثیم کا شکار ہوتے ہیں۔ بچے عموماً غذائی بے احتیاطی کی وجہ سے اسہال کا شکار ہوتے ہیں۔ اسہال سے متاثرہ بیشتر بچوں کو دوا سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کے جسم میں پانی کی شدید کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں او آر ایس (Oral Rehyderation Solution) یا نمکین پانی مفید رہتا ہے۔ او آر ایس میں گلوکوز (Glucose)، سوڈیم کلورائیڈ (Sodium Chloride)، سوڈیم نائٹریٹ (Sodium Nitrate) یا سوڈیم بائی کاربونیٹ (Sodium Bicarbonate) اور پوٹاشیم کلورائیڈ (Potasium Chloride) شامل ہوتا ہے۔

مچھر کے کاٹنے کے سبب لاحق امراض:

برسات اور مچھروں کی بہتات ایک دوسرے سے لازم وملزوم ہیں لیکن چند احتیاطی تدابیر اختیار کر کے ان سے بچا جا

سکتا ہے۔ ملیریا اور ڈینگی بخار کا وائرس انسانی جسم میں متاثرہ مادہ مچھر کے ذریعے پھیلتا ہے۔ مچھر عام طور پر کسی متاثرہ انسان کا خون چوستے وقت یہ وائرس حاصل کر لیتا اور تقریباً آٹھ دس دن بعد (اس وائرس کا انکوبیشن پیریڈ آٹھ تا دس دن ہے) وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اسے کسی تندرست انسان کے اندر منتقل کر سکے۔

متاثرہ مادہ مچھر اپنے یہ اثرات اپنے انڈوں کے ذریعے بھی انسانوں تک پہنچا سکتی ہے لیکن اس سے بچاؤ ممکن ہے۔

انسانی جسم اس وائرس کا بہترین میزبان ثابت ہوتا ہے لیکن چند مشاہدات و تجربات ثابت کرتے ہیں کہ بندر بھی اس وائرس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ وائرس انسانی خون میں دو سے سات دن کے اندر اندر پوری طرح سرایت کر جاتا ہے اور اس وقت سے ہی انسان میں اس کی علامات جیسے بخار، سر درد اور جسم کا درد وغیرہ ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ ڈینگی اور ملیریا سے بچاؤ کے لیے درج ذیل ہدایات پر عمل کریں:

☆ گھر میں صاف پانی ذخیرہ کرنے والے برتنوں جیسے بالٹی، کنستر، ڈرم وغیرہ نیز پھولدان اور گملوں کے نیچے رکھے ہوئے برتن اور پانی کی ٹینکی کو ڈھانپ کر رکھیں۔

☆ مچھروں سے بچاؤ کے لیے دروازوں اور کھڑکیوں پر جالی لگائیں تاکہ مچھر اندر نہ آنے پائیں۔

☆ کمرے کے اندر کوئی مچھر محسوس ہو تو میٹ، کوائل یا سپرے استعمال کریں۔

☆ پورے گھر میں مچھر مار اسپرے وقتاً فوقتاً کرواتے رہیں۔

☆ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے اوقات میں جسم کے کھلے حصوں پر مچھر بھگاؤ تیل لگائیں۔

☆ چھوٹے اور شیر خوار بچوں کو مچھر دانی سے باہر ہرگز نہ سلائیں۔

☆ کھلی فضا میں بغیر حفاظت ہرگز نہ سوئیں۔

☆ پانی کھلا ہرگز نہ چھوڑیں۔

☆ گھر میں صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھیں اور گندگی اکٹھی نہ ہونے دیں۔

☆ علامات ظاہر ہونے پر فوری طور پر قریبی ہسپتال جائیں۔

پانی یا بارش میں بھیگ جانے کے سبب لاحق امراض:

برسات کے موسم میں سانس کے عوارض بھی لاحق ہو سکتے ہیں جیسے بہت سے افراد میں الرجی کا عارضہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بارش کے موسم میں بھیگ جانے کے سبب کھانسی، نزلہ، زکام اور فلو کی کیفیت ہو سکتی ہے۔ جب ناک سے پتلا مواد خارج ہونا شروع ہو جائے اور اس کا عمومی سبب ناک کی سوزش ہو تو اسے زکام کہا جاتا ہے جبکہ یہی رطوبت اگر حلق میں ٹپکنے لگے تو اسے نزلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس کے لیے انگریزی زبان میں بولا جانے والا لفظ کیٹر (Catarrh) دراصل یونانی لفظ ہے۔ اس کے معنی بہنے کے ہیں، اس لیے اسے حلق میں بہنے والے مواد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح آج کل فلو اور انفلوئنزا جیسے امراض بھی زبان زدِ عام ہیں۔ فلو اور انفلوئنزا ایک ہی بیماری کے دو نام ہیں اور یہ عموماً وبائی زکام جو وائرس یا بیکٹیریا کے سبب لاحق ہو، اُسے کہا جاتا ہے اور یہی برسات کے موسم میں لاحق ہوتا ہے۔ رے نی ٹس (Rhinitis) ایک یونانی لفظ ہے جو رائن بمعنی ناک اور آئی ٹس بمعنی سوزش یا ورم سے مل کر بنا ہے۔ یعنی ناک کی لعابی جھلیوں کی سوزش یا ورم کو رے نیٹس کہا جاتا ہے جبکہ زکام میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام الفاظ ایک ہی بیماری کے مختلف ناموں کو ظاہر کرتے ہیں۔ بیماری یا اس کا نام کوئی بھی ہو، اصل صحت اور سکون احتیاط میں ہی مخفی ہے۔

◆◆◆

پُراسرار کہانی

شاہ محی الحق فاروقی

مندر کا بھوت

تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ میں ایک ویران مینار کے برج نما کمرے میں بیٹھا ہوا مندر کے بھوت کا انتظار کر رہا تھا۔ مینار میں میری داہنی جانب تیراندازی کے لیے جو کھڑکی بنی ہوئی تھی اس سے میں اپنے سامنے پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک پہاڑی قطعہ زمین تھا جس میں سیاہ چٹانیں اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں نمایاں تھیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا ویران منظر تھا جو میرے اندر خوف کا ایک احساس پیدا کر رہا تھا۔ اس برج نما کمرے کی پتھر کی دیواروں کی وجہ سے خوف میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ اپنی بائیں جانب والی کھڑکی سے میں دیو دھر کے مندر کے زوال پزیر کھنڈر دیکھ سکتا تھا۔ اس بلندی اور فاصلے سے میں اس مندر کو مکمل طور پر دیکھ کر تصور کر سکتا تھا کہ اپنے عروج کے دنوں میں یہ کتنا عظیم الشان مندر رہا ہوگا۔ گرتے ہوئے ستونوں کو صدیوں کی ہوا، گرد اور بارش کھا گئی تھی۔ وسیع و عریض گلیارا ایک زمانہ پہلے اپنے کمروں سے محروم ہو چکا تھا اور پتھر کی جو سلیں چھت میں استعمال ہوئی ہوں گی وہ ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھیں اور یہ ٹکڑے، کچھ صحن کے اندر اور کچھ صحن کے باہر، بکھرے پڑے تھے۔ چوکور شکل کے اس بہت بڑے صحن میں کسی

کیا وہ کلکٹر پر اس لیے مہربان ہوئے کہ اُس نے اُن کے پُرکھوں کی زمین بچائی تھی... حیرت انگیز کہانی

زمانے میں پالش کیے ہوئے پتھر لگے ہوئے تھے۔ ایسے مخصوص مواقع پر جیسے اس وقت جب دیودھرمندر کے بڑے پروہت کی اپنے چیلوں چاٹوں کے ساتھ زرّہ بکتر سمیت اپنے روایتی شاندار لباس میں آمد ہوتی ہو، اس وقت ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوئے جاتری (زائرین) آسانی کے ساتھ اس صحن میں سما جاتے ہوں گے لیکن وہ دن اب رخصت ہو چکے تھے۔ اب وہاں صرف پانچ پجاری باقی رہ گئے تھے جو صبح و شام کی آرتی اُتارتے اور مندر کے اندرونی حصے کی جھاڑ پونچھ کر کے اسے صاف ستھرا رکھتے تھے۔

میں برج نما کمرے میں بھوت کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر بھوت نامی کسی چیز کا واقعی کوئی وجود تھا تو وہ یقیناً سوفٹ اونچے اسی ویران اور طویل مینار پر مٹرگشت کر رہا ہوگا۔ ان تنگ اور سیدھی سیڑھیوں پر سے جن کے ذریعے میں اُوپر آیا تھا کسی وقت بھی زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ بھوت کی آمد کا اعلان کر دے گی۔ مجھ پر بے چینی کا عالم طاری تھا اور میں انتظار کر رہا تھا۔

سیکڑوں برس پرانے یورپ کے گاتھی دور کی ایک ماورائے عقل کہانی والی صورتحال میں مَیں کیسے پھنس گیا تھا؟ میں سمجھتا تھا کہ ویران محل اور بے سر والے بھوت صرف بھوت پریت کی بھیانک کہانیاں لکھنے والوں کے دماغوں میں پائے جاتے تھے، جبکہ میں تو ایک نوجوان سرکاری افسر تھا جو اپنے معمول کے دورے پر گاؤں کا معائنہ کرنے آیا اور میرے دماغ میں دور دور کہیں کسی بھوت، برج والے کسی کمرے یا کسی ویران مندر کا کوئی خیال بھی نہ تھا۔ لیکن، عجیب بات ہے کہ، میں وہاں بیٹھا بھوت کا انتظار کر رہا تھا۔

اس پورے معاملے کی ابتدا رادھن پور میں میرے تقرر کے وقت سے ہوئی۔

پرانے دنوں میں، جو بہت اچھے دن تھے، جب سرکاری کام حکم کے بجائے حکمت سے چلائے جاتے تھے، ڈویژن کے کمشنر عموماً ایسی تہذیب کا مظاہرہ کرتے تھے کہ وہ اسسٹنٹ کلکٹروں کے تبادلے سے پہلے انھیں بلا کر ان کی اپنی سہولت اور خواہش معلوم کر لیا کرتے۔ جب سورت میں میرا عرصہ ملازمت پورا ہو گیا تو مسٹر ایف، این، رانا نے جو ان دنوں بڑودہ کے کمشنر تھے مجھے چائے پر بلایا:

''اب آپ اپنا تقرر کس جگہ پسند کریں گے؟'' انھوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

''میری کوئی خاص ترجیح نہیں ہے، سر لیکن مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر میری تقرری کسی ایسی جگہ ہو جائے جہاں ایک سرکاری جیپ موجود ہو اور جہاں مجھے کچھ شکار مل سکے۔''

تو گویا اس طرح میں رادھن پور پہنچ گیا۔ رادھن پور بنس کنتھا ضلع کا ایک سب ڈویژن ہے۔ اس کی سرحد کچھ وبیش وہی ہے جو رادھن پور کی سابق ریاست کی تھی۔ میرا تعلقہ مشرق کی جانب رن آف کچھ سے اور شمال کی جانب تھر کے پاکستانی ریگستان سے ملتا تھا۔ ضلع کے اور بقیہ حصوں کی طرح رادھن پور کا علاقہ بھی بنجر تھا جو میلوں میل تک کا ایک پہاڑی علاقہ تھا جس میں یہاں وہاں ریگستان کے ٹکڑے پائے جاتے تھے۔ زراعت بہت چھدری چھدری تھی اور لمبے لمبے سفر میں جو سبزہ بھی نظر آتا تھا وہ نگ پھنی اور ببول کے درختوں کا سبزہ تھا۔ سوائے اس کے کہ کہیں یہ زیادہ وہ کم اور کہیں وہ زیادہ یہ کم۔

رادھن پور جو اس سب ڈویژن کا صدر مقام تھا ان دنوں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی آبادی بیس ہزار سے کچھ اوپر تھی۔ اس قصبے کی خاص چیز قصبے کے وسط میں ایک جھیل اور ایک قلعہ تھا جس میں نواب کا محل بنا ہوا تھا۔ بہرحال وہاں حکومت کی طرف سے اسسٹنٹ کلکٹر کو ایک جیپ ملی ہوئی تھی

اور جن علاقوں میں جیپ سے نہیں جایا جا سکتا تھا، وہاں کے لیے ہر تعلقے کے صدر مقام پر دو گھوڑے اور دو اونٹ سرکار کی طرف سے مہیا کیے گئے تھے۔

رادھن پور آنے کے دو ہفتے بعد میں تھوڑی دیر پہلے رن کی سرحد پر سنتل پور نامی ایک مقام کا تیز دورہ کر کے واپس آیا تھا۔ چونکہ اس علاقے کے اندرونی حصے میں زیادہ دور تک جیپ سے نہیں جایا جا سکتا تھا کیونکہ لوگوں کے خیال میں جیپ کے لیے رن ایک ناقابل اعتبار علاقہ ہے لہٰذا میں نے صحرائی جہاز یعنی اونٹ اور کہیں کہیں گھوڑا استعمال کیا۔

ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا اپنے سفر کی ڈائری لکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے دفعدار یعنی بڑے چپراسی نے آ کر مجھے بتایا کہ دیودھر مندر کے بڑے پروہتوں کا ایک وفد مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

مجھے کچھ تجسس سا ہوا۔ میں نے پہلے اپنے ہیڈ کلرک جے سنگھ بھائی کو بلایا اور پوچھا۔ ''یہ دیودھر کا مندر کہاں ہے اور ان کا کیا مسئلہ ہے؟''

''حضور، یہ شمال کی جانب یہاں سے کوئی سو میل دور ہے (اس کا مطلب ایک غیر آباد علاقے میں پورے ایک دن کا سفر) اور ایک زمانے میں یہ اس علاقے میں شیوا کا سب سے اہم مندر تھا۔ روایت یہ ہے کہ جب کولی سردار وہاں حکومت کرتے تھے اور وہاں کے کنوؤں سے میٹھا پانی نکلتا تھا تو وہ علاقہ بڑا خوش حال تھا لیکن بعد میں لوگ مغرور اور جھگڑالو ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ پھر وہاں ڈاکو آ گئے۔ سردار کمزور پڑ گئے اور لوگوں نے دیوتاؤں کو نذر نہ دینا بند کر دیا تو وہاں کا پانی کھارا ہو گیا۔ اب وہاں مشکل ہی سے کوئی فصل ہوتی ہے۔ وہاں کی آبادی بہت چھدری چھدری ہے اور دیودھر کا مندر بھی کھنڈر ہوتا جا رہا ہے۔ بہرحال ان پروہتوں کا بیان ہے کہ 1946ء میں اس وقت کے نواب

رادھن پور نے مندر کو دو سو ایکڑ زمین کا عطیہ دیا تھا۔ ہمارے پاس ایسے کسی عطیہ کا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں۔ گزشتہ پندرہ سال سے جو نیا اسسٹنٹ کلکٹر یہاں آتا ہے یہ لوگ اس سے آ کر ملتے ہیں۔ ان سب نے کاغذات کی پڑتال کروائی لیکن کوئی دستاویز نہیں ملی۔ اب چونکہ یہاں آپ کا تقرر ہوا ہے لہٰذا یہ لوگ پھر اپنے کام پر لگ گئے۔''

یہ معاملہ بڑا کمزور لگ رہا تھا اور ان کی اُمید قابل رحم تھی۔ بہرحال مجھے ان لوگوں سے ملنا تو تھا ہی۔ میں نے دفعدار سے کہا کہ وہ وفد کو اندر بھیج دے۔

پانچ آدمیوں کا ایک وفد اندر آیا۔ یہ معمر اور باوقار لوگ اپنا لباس یعنی پگڑی اور دھوتی پہنے ہوئے تھے۔ ان کی پیشانیوں پر تلک لگا ہوا تھا۔ میں نے ان سے بیٹھنے کے لیے کہا اور بڑے مہذب انداز میں ان سے پوچھا کہ میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انھوں نے کم و بیش وہی کہانی دہرائی جو میرا ہیڈ کلرک مجھے پہلے ہی سنا چکا تھا۔

''جب آپ کو زمین کا یہ عطیہ ملا ہو گا تو نواب نے آپ کو کوئی سند دی ہو گی۔ اس سند کا کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''حضور، یہی تو ہماری بدقسمتی تھی۔ عام طور سے دیوان کا دفتر سند جاری کرنے میں ایک سال لگاتا تھا لہٰذا ہم نے سوچا کہ سند ہمیں اپنے وقت پر مل جائے گی۔ اس درمیان نواب کو شکار کھیلتے ہوئے ایک جنگلی سؤر نے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد جانشینی کا جھگڑا شروع ہوا۔ جب موجودہ نواب تخت نشین ہوئے تو دیوان کے دفتر کی تشکیلِ نو کی گئی۔ اس کے بعد آزادی کا دور آیا اور رادھن پور کی ریاست ملک میں ضم کر دی گئی۔ اس طرح ہمیں سند ملی ہی نہیں۔ انضمام کے بعد ہم نے ہر اسسٹنٹ کلکٹر سے اور دو ایک بار کلکٹر سے بھی ملاقات کی لیکن ہمیں کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔''

ان لوگوں کے چہروں پر افسوس اور نا اُمیدی کی جھلک نظر آتی تھی۔ مجھے ان لوگوں کے لیے افسوس ہو رہا تھا۔

''لیکن سوامی جی، کہا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کے علاقے میں زمین پتھریلی ہے اور زیادہ تر ناقابل کاشت۔ اگر آپ لوگوں کو زمین مل بھی جائے تو آپ اس کا کیا کریں گے؟ آپ کو پانی کہاں سے ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''صاحب جی۔'' بہت نمایاں ناک، آنکھوں کے نیچے تھیلی جیسی شکن، جھریاں پڑے ہوئے چہرے اور ٹھوڑی کے نیچے لٹکی ہوئی کھال والے ضعیف العمر پروہت نے کہا: ''اگر ہم کنواں کھودیں گے تو شیو مہاراج ہمیں میٹھا پانی دیں گے۔ لیکن پہلے ہمیں زمین تو مل جائے۔ ہم تو برسوں سے کوشش کر رہے ہیں۔ کیا ہمیں زمین مل جائے گی؟'' اس کے لہجے میں کامیابی کی آس نمایاں تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انکار میں جواب دوں اور اُمید کی یہ ہلکی سی لو بھی بجھ جائے۔

''مجھے اُمید تو ہے، میں کم از کم دل سے کوشش ضرور کروں گا۔'' میں نے کہا۔

جب وہ پانچوں پروہت چلے گئے تو میں نے جے سنگھ بھائی کو بلایا اور اس سے کہا: ''ریاست کے انضمام کے وقت آخر ہم نے نواب کی ریاست کے کاغذات کا محافظ خانہ لیا ہو گا۔ ان تمام دستاویزات کا کیا ہوا؟''

''ہاں حضور''۔ جے سنگھ بھائی نے کہا: ''ہمیں کچھ ریکارڈ ملا تو ضرور تھا۔ بہت تھوڑے سے کاغذات تھے۔ بقیہ شاید ضائع ہو گئے ہوں۔ اب بات یہ ہے کہ زمین کے جتنے مطالبات ہمارے پاس آ رہے ہیں، وہ باضابطہ اور اصل اسناد کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ہمارے محافظ خانے میں ان کی نقل موجود نہیں۔ جب ریاست پر قبضہ ہوا تھا اس وقت کے ہنگامے میں وہ سب اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں گے۔''

میں نے جے سنگھ بھائی سے ایک بار اور کوشش کرنے کے لیے کہا حالانکہ مجھے زیادہ اُمید نہیں تھی۔

اس واقعے کے کوئی دو ماہ بعد میں ایک روز محفر نامہ دیکھ رہا تھا جو ان چیزوں کی فہرست پر مشتمل تھا جو ہم لوگوں نے نواب کی ریاست سے وصول کیا تھا۔ جب پرانے کتب خانے کی عمارت کا اندراج میری نظر سے گزرا تو میں نے جے سنگھ کو بلا کر پوچھا کہ وہ عمارت کہاں تھی؟

جے سنگھ بھائی نے کہا: ''اچھا، وہ عمارت؟ وہ یہاں سے کوئی دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حضور، وہ بڑی خستہ حالت میں ہے اور ایک زمانے سے مقفل پڑی ہوئی ہے۔ کہا یہ گیا تھا اس میں کوئی چیز نہیں ہے۔ کبھی کوئی اندر گیا کبھی نہیں۔''

لیکن کوئی بھی عمارت جسے کتب خانہ کہا جائے میری اُمید اور شوق کو اُبھار دیتی ہے۔ کون کون سی پرانی کتابیں وہاں پڑی ہوں گی! کیسا خزانہ ہو گا! کون جانتا ہے کہ مجھے وہاں شیکسپیر اور مارلو کی جلدیں مل جائیں!

دوسرے دن میں عملے کے دو افراد کو ساتھ لے کر کتب خانے کی عمارت دیکھنے گیا۔ رادھن پور میں کبھی کبھار بارش کے جو چھینٹے پڑتے تھے وہ کچھ پہلے پڑ چکے تھے اور سڑک کیچڑ کیچڑ ہو رہی تھی۔ جب میں احاطے میں پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ لائبریری کی عمارت کے بڑے پھاٹک تک پہنچنا ایک مسئلہ ہو گا۔ ہر طرف لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس کی لمبائی سولہ سال پر محیط تھی۔ بہرحال اندر گھسنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں جیپ چلاتا ہوا سیدھے چلا گیا۔ اس کے ٹائر گھاس پھونس اور ان بہت سے کیڑے مکوڑوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جو جھاڑیوں میں بھاگ دوڑ لگائے ہوئے تھے۔ جب ہم عمارت کے دروازے پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ دروازے پر ایک پرانا زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ چونکہ اس کی

کنجی موجود نہیں تھی لہٰذا ہم نے تالا توڑنے کے لیے کار کا جیک استعمال کیا۔ جب ہم ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ عمارت کے اندرونی حصے کی حفاظت بیرونی حصے سے بہتر طور پر کی گئی تھی۔ اس میں بہت سی قطاروں میں ریک لگے ہوئے تھے جن پر لال کپڑوں میں بندھے ہوئے بنڈل رکھے تھے۔ ان بنڈلوں میں فائلیں بندھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر کی حالت بہت عمدہ تھی۔

وہاں مجھے کوئی کتاب نہ ملی، نہ کوئی نادر کتاب اور نہ کوئی عام کتاب۔ تاہم جب سارا ریکارڈ میرے دفتر میں منتقل کر دیا گیا اور ان کی درجہ بندی اور فہرست سازی ہوگئی تو ہمیں انھی کاغذات میں دیودھر مندر کے عطیے کی سند مل گئی۔

میں نے دیودھر کے پروہتوں کو بلایا اور زمین کے سلسلے میں ایک رسمی حکم نامہ جاری کر کے انھیں دے دیا۔

میں یہ سارا واقعہ بھول گیا۔ کوئی دو ماہ بعد میں دیودھر کے علاقے کے معائنے کے لیے دورے پر گیا۔ بنس کنتھا کا بے آب و گیارہ میدان جہاں ہلکی سی بارش بھی ہو جائے تو تمام سڑکیں غائب ہو جاتی ہیں، وہاں کا سفر بجائے خود ایک دلچسپ مہم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے تو یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میرا ڈرائیور کسی قطب نما کے ذریعے گاڑی چلا رہا تھا کیونکہ مجھے تو وہاں کوئی ایسا نشان نظر نہیں آ رہا تھا جس سے راستے کی شناخت ہو سکتی۔ وہی چٹانیں، وہی ناگ پھنی کے درخت، وہی اُلٹی سیدھی جھاڑیاں اور وہی چٹیل میدان۔

جب میں دیودھر کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک استقبالیہ جماعت میرا انتظار کر رہی تھی جس کے آگے آگے دیودھر مندر کے پروہت تھے۔ نمایاں ناک اور ٹھوڑی کے نیچے لٹکی ہوئی کھال والا بڑا پروہت ان میں شامل نہیں تھا۔ تقریباً دو سو دیہاتیوں کا ایک مجمع تھا۔ ڈھول، تاشے اور نفیری بجا کر میرا استقبال کیا گیا اور پھر مجھے ایک سجی ہوئی بیل گاڑی پر منتقل کیا گیا۔ دراصل قدیم تہذیب کے اس ماحول میں جیپ ایک جدید مغربی مداخلت ہوتی جو مہمانوں کے استقبال اور انھیں لے کر چلنے کی مہذب روایت کے مطابق نہ ہوتی۔ مجھے اسی انداز میں مندر تک لے جایا گیا۔ بیل گاڑی کے پہیے ڈھول کی آواز کے ساتھ ساتھ ڈگمگ چل رہے تھے۔

بڑے صحن میں مندر کے پورے اعزاز کے ساتھ میرا استقبال کیا گیا۔ مجھے مندر کے کھنڈر دکھائے گئے اور اس کے اندرونی حصے میں میں نے کچھ وقت گزارا۔ اس رات صحن میں ایک سموہک بھوجن (عام دعوت) کا انتظام ہوا جس میں پروہتوں نے مجھے اور ان تمام دیہاتیوں کو جو وہاں جمع تھے کھانا کھلایا۔ اس کھانے میں گھی کے اندر پکا ہوا دلیہ، سبزیاں، چاول، دال اور کافی مقدار میں دودھ موجود تھا۔ اگرچہ وہاں کی زمین ناقابلِ کاشت تھی لیکن مویشی بہت کثرت سے تھے اور مجھے اتنا عمدہ دودھ اور کہیں نہ ملا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو تمام دیہاتی رخصت ہو گئے اور چوکی پر جانے سے پہلے جہاں مجھے رات گزارنی تھی میں نے مندر کا ایک دوسرا چکر تنہا لگایا۔ مندر کی دیواروں کو چاندنی پوری طرح منور کیے ہوئے تھی۔ میں مندر کا ایک ایسا چکر لگانا چاہتا تھا جس میں کوئی میری راہنمائی کرنے والا نہ ہو کیونکہ میں نے اس میں کچھ ایسی تعمیراتی خوبیاں دیکھی تھیں کہ انھیں میں دوبارہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ایک منہدم گلیارے میں کھڑا تھا کہ میری ملاقات ضعیف العمر بڑے پروہت سے ہوگئی۔ اس کے ہاتھ لالٹین تھی۔ وہ مجھے اس مندر کی اہم خوبیاں دکھانے آیا تھا۔ ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نے مجھے مندر میں رات گزارنے کی دعوت دی۔

''آپ نے ہم پر مہربانی کی ہے۔ ہم اس زمین کو حاصل کرنے کے لیے پندرہ سال سے کوشش کر رہے تھے۔ کسی

نے ہماری مدد نہ کی لیکن صاحب جی، آپ نے اس سند کو تلاش کرنے کی تکلیف گوارا کی۔ آپ نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ مندر اور اس کے پجاری آپ کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔'' پروہت نے مجھ سے کہا۔

میں نے درخواست کی کہ اس بات کا ذکر نہ کیا جائے۔ میں نے کوئی خاص محنت بھی تو نہ کی تھی۔ یہ تو صرف ایک اتفاق تھا۔ میں تو پرانی کتابیں تلاش کر رہا تھا جو مجھے ملیں بھی نہیں۔

پروہت نے مجھے مندر میں رات گزارنے کی دوبارہ دعوت دی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس ویرانے میں میں کہاں رات گزاروں گا۔ اس نے صحن کے ایک کونے میں ایک پرانے انحطاط پزیر مینار کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کم از کم سو فٹ اونچا ایک مینار تھا جس کے اُوپر مجھے ایک برج نما کمرا نظر آ رہا تھا۔ جس میں تیر اندازوں کے لیے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ مجھے اس جگہ ٹھہرنے کا خیال بہت پسند نہ آیا۔ میں کچھ عذر کرنے ہی والا تھا کہ بوڑھے پروہت نے کہا: ''صاحب جی، آپ نے جو تکلیف اٹھائی ہے۔ یہ اس کا ایک حقیر سا بدلہ ہوگا۔'' اب اگر میں مزید انکار کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اس کی خاطر مدارات کو رد کر رہا ہوں اور پروہتوں پر میرا احسان باقی رہتا۔ یہ ان کے اوپر ایک بہت بڑا بار ہوتا، لہٰذا میں راضی ہوگیا۔

میں نے اپنے معالمت دار سے کہا کہ وہ جیپ لے کر چوکی پر چلا جائے اور رات کو وہیں سو جائے۔ بڑا پروہت سیڑھی کے نیچے لالٹین لیے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ سیڑھیوں پر چڑھتا جا رہا تھا۔ بعض جگہ پتھر گر چکے تھے اور ان کی جگہ گہرے اور باریک گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ پروہت کی لالٹین سے سیڑھیوں پر روشنی بھی بہت ہلکی پڑ رہی تھی۔

بہرحال ہانپتے کانپتے میں برج والے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے کے درمیان میں ایک چارپائی تھی اور اس پر ایک چادر اور تکیہ تھا۔ مجھے نیند میں جھومتے ہوئے بہت احترام کے ساتھ نمسکار کر کے پروہت مجھے اندھیرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ سوراخوں میں سے چاند کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں آدھی رات کے وقت میں دیودھر کے مندر میں برج نما کمرے میں پہنچا اور مندر کے بھوت کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن میرا انتظار فضول تھا۔ میرے اندر کارج از حواس ادراک کی جتنی بھی قوت تھی اس سب کو استعمال کر کے میں نے بھوت کو طلب کرنے کی جانب پوری توجہ دی۔ مجھے کامیابی کی امید بھی تھی اور مجھے خوف بھی تھا۔ کوئی چمگادڑ بھی اگر اڑتا ہوا گزرا تو میں نے اسے بھی بھوت ہی سمجھا۔ مینار کے سوراخ سے ہوا کی سرسراہٹ سنائی دی تو میری امید اور خوف میں اضافہ ہوگیا، لیکن کوئی بھوت نہیں آیا میں ۔ اونگھ بھی رہا تھا اور وقتاً فوقتاً جاگ کر دروازے کی طرف اس توقع کے ساتھ دیکھ بھی رہا تھا کہ ابھی ایک خیالی سایہ مادی شکل اختیار کر لے گا لیکن بھوت آخر تک نہ آیا۔

پو پھٹنے لگی تو میں نے شب بیداری ختم کی اور سیڑھی سے اتر کر نیچے آ گیا۔ اردگرد کوئی شخص موجود نہ تھا۔ غالباً پروہت حضرات ابھی تک سو رہے تھے۔ میں صحن سے باہر آ گیا۔ چوکی کا فاصلہ وہاں سے کوئی ایک میل تھا۔ صبح کی سیر نے مجھے تر و تازہ کر دیا تھا۔ معالمت دار جاگ چکا تھا اور میرا عملہ بھی تیار تھا۔ ہم اپنے معائنے پر چل پڑے۔ واپسی میں ہمیں پھر مندر کے سامنے سے گزرنا پڑا اور میں نے اپنے معالمت دار کو بتایا کہ کس طرح میں نے برج نما کمرے میں رات گزاری تھی اور میں نے اسے اپنی مایوسی بھی بتائی کہ بھوت نہیں آیا تھا۔ معالمت دار نے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''لیکن جناب، مندر میں تو کوئی مینار ہے ہی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ تم کیا فضول بات کر رہے ہو؟ میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے وہاں رات گزاری ہے۔''

''آپ دیکھیے تو حضور۔'' معاملت دار نے کہا: ''وہاں تو کوئی مینار نہیں ہے۔''

میں نے آنکھیں اٹھا کر اوپر دیکھا اور یہ دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا کہ وہاں کوئی مینار نہیں تھا۔ ایک کونے میں وہاں کبھی ایک مینار رہا ہوگا لیکن اسے گرے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا ہو گا۔ غالباً ایک صدی گزر چکی تھی۔ اب وہاں صرف کھنڈر رہ گیا تھا۔ جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ وہاں کنکر پتھر جم گئے تھے۔

میں اب بھی اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کر سکا۔ مجھ پر جو گزری تھی اس کی یادیں اتنی تازہ تھیں کہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ سب کچھ وہم تھا۔ اگر وہ سب کچھ وہم تھا تو کیا وہ بڑا پروہت بھی وہم تھا جو مجھے وہاں لے گیا تھا۔

ہم مندر کے بڑے پھاٹک پر رک گئے۔ وہ چاروں پروہت جنہوں نے گزشتہ شام میرا استقبال کیا تھا اور مجھے کھانا کھلایا تھا وہ مجھ رخصت کرنے کے لیے وہیں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جیپ سے نیچے اتر آیا۔ میں نے ان کے دیے ہوئے ہار پہن لیے اور ان سے پوچھا کہ بڑے پروہت کہاں ہیں۔

''آہ، آپ سوامی دیا شنکر کے بارے میں پوچھ رہے ہیں حضور!'' ان میں سے ایک نے کہا: ''وہ تو جب سند لے کر رادھن پور سے واپس آئے تو اس کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ بڑے نیک آدمی تھے وہ، حضور۔ دراصل انھوں نے ہی ہم لوگوں سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ جب کبھی آپ یہاں آئیں تو مندر کے پورے اعزاز کے ساتھ آپ کا استقبال کیا جائے اور آپ کے لیے سمو بک بھوجن کا انتظام کیا جائے۔''

میں بھی سوچتا ہوں کہ میں نے وہ رات کہاں گزاری تھی۔ ◆◆◆

افلاطون

افلاطون نے ایک بڑی تقریب منعقد کی اور اُس میں اپنے ہم عصر بڑے لوگوں کو دعوت دی۔ یہ بڑے لوگ علم و فضل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ انھی میں دیوجانس کلبی بھی شامل تھا۔ دیوجانس استغنا اور بے نیازی کا پیکر تھا۔ اُسے چار دیواروں والے مکانوں سے چڑ تھی۔ وہ کہتا تھا: ''جب سے انسان نے اپنے آپ کو ان مکانوں میں قید کر لیا ہے، اُس کی جملہ فطری صلاحیتیں بھی ختم ہوتی جا رہی ہیں۔''

چنانچہ اُس نے اپنی رہائش کے لیے ایک بڑا سا صندوق بنوا کر اُس میں پہیے لگوا لیے تھے۔ دن بھر اُسے کھینچتا رہتا اور جہاں رات ہوتی اُس صندوق میں لیٹ کر رات گزار دیتا۔ غذا میں ہر چیز کچی استعمال کرتا یہاں تک کہ گوشت بھی کچا ہی کھاتا تھا۔ چنانچہ ایک ایسے بے فکر اور آزاد منش فلسفی کو جب افلاطون نے اپنے گھر پر مدعو کیا تو دیوجانس گرد و غبار میں اَٹے ہوئے پیر افلاطون کے ہاں بچھے قالینوں سے رگڑنے لگا۔ افلاطون اُس کے استقبال کو آگے بڑھا اور نہایت خندہ پیشانی سے دریافت کیا: ''آؤ میرے دوست! لیکن تم یہ کیا کر رہے ہو۔''

دیوجانس کلبی نے حقارت اور رعونت سے جواب دیا: ''افلاطون کے تکبر اور غرور کو اپنے پیروں سے مسل رہا ہوں۔''

افلاطون نے فوراً جواب دیا: ''میرے دوست! کیا تم نے غور کیا کہ تم یہ کام کس تکبر اور غرور سے انجام دے رہے ہو۔''

صدف نایاب

کوئی بات نہیں

جملہ آج بہت سے گھروں سے ناپید ہو چکا اور چونکہ معاشرہ افراد پر مبنی ہوتا ہے تو اس لحاظ سے لوگوں میں یہ رجحان کم ہوتا جارہا ہے کہ دوسرے کی غلطی معاف کردیں اور ''کوئی بات نہیں'' کہہ کر مسئلہ ختم کردیں۔

کل ہی کہیں کسی صاحب کا واقعہ پڑھنے کو ملا۔ وہ کہتے ہیں کہ آج جب دفتر سے گھر لوٹا تو میری بیوی انتہائی پریشان تھی۔

میں نے پوچھا: ''کیا ہوا؟''

وہ کہنے لگی: ''آج واشنگ مشین میں کپڑے دھوتے ہوئے اچانک نظر پڑی تو دیکھا کہ آپ کا پاسپورٹ بھی ساتھ ہی دھل گیا۔''

وہ صاحب بتاتے ہیں کہ پہلے تو مجھے بہت ہی شدید غصہ آیا اور دل چاہا کہ فوراً ہی پھٹ پڑوں مگر اسی وقت ایک خیال آیا اور بیوی سے کہا:

''خیر ہے کوئی بات نہیں۔'' یہ سننا تھا کہ میری بیوی جس کی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں فوراً ہی نارمل ہوگئی اور تشکر سے مسکرانے لگی۔ وہ صاحب کہتے ہیں کہ مجھے فوری کوئی سفر کرنا تھا لہٰذا پاسپورٹ کی بھی اشد ضرورت تھی۔ میں نے سوچا اب نیا بنوانا ہی پڑے گا کسی بھی حال میں۔ بجائے یہ کہ چیخ و پکار کی جائے، اس معاملے کو ختم ہی کردیا جائے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب غصہ صرف دکھ اور پریشانی کو بڑھائے گا اور اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اس سوچ نے مجھے غصے سے بچالیا۔ اس طرح ہم میاں بیوی بھی پرسکون ہوگئے اور گھر کا ماحول بھی خراب نہیں ہوا۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ کا کیا ہی خوبصورت فرمان ہے۔

ارشاد نبی ﷺ: جو شخص انتقام کی قدرت کے باوجود غصہ پی جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو تمام مخلوقات کے سامنے بلا کر فرمائے گا کہ آج تم جنت کی جس حور کا انتخاب کرنا چاہو جاکر انتخاب کرلو (ابوداود الترمذی، بروایت انس بن معاذ)''

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غصہ کرنے اور پھٹ پڑنے سے

ایک چھوٹا سا جملہ بڑے بڑے مسائل کا حل ہے

معاملات سلجھ جائیں گے۔ جبکہ اس سے معاملات اور بگڑ جاتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جب تک ہم غصہ نہ کریں اور اپنی بات کہہ کر دل کی بھڑاس نہ نکال دیں، ہم پُرسکون نہیں ہوتے۔ ہمارا دین ہمیں عفو درگزر اور معاف کر دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسی تعلیم جو صرف روزے کی حالت میں نہیں، عام دنوں میں بھی ہمارے لیے سودمند ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ناخوشگوار واقعات اور حالات کے وقت اپنے آپ پر قابو پاسکتے ہیں اور اس بات کی دلیل سورہ آل عمران کی اس آیت سے ملتی ہے

الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ سورہ آل عمران آیت نمبر 134

ترجمہ: ''وہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور رنج میں اور غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے، اور نیک لوگ اللہ کے محبوب ہیں۔''

یعنی اللہ نے جو جذبات ہمارے اندر رکھے ہیں وہ ان سے سب سے زیادہ بخوبی واقف ہے۔ اگر اس نے انسانوں کے اندر غصے کا جذبہ رکھا ہے تو وہی جانتا ہے کہ اس پر قابو بھی پایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ بشارت الگ کہ ایسے لوگ اللہ کو محبوب ہوتے۔

سبحان اللہ! مجھے یاد ہے کہ میرے چھوٹے بھائی سے موٹر سائیکل کہیں ٹکرا گئی۔ گھر آیا تو اسے کافی چوٹیں لگی تھیں۔ اس نے مجھے والدین کو بتانے سے منع کیا اور خود بھی نہ بتایا۔ ظاہر ہے کہ اسے والد صاحب کی ڈانٹ کا خوف اور ان کی ناراضگی کا ڈر تھا۔ اس وجہ سے وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی چوٹیں دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے جا کر والد صاحب کو بتا دیا۔ وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں کمرے میں آئے اور بھائی کو پیار کرتے ہوئے بار بار یہی کہتے رہے۔

''کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں۔''

موٹر سائیکل کا بھی کافی نقصان ہوا تھا مگر میرے والد صاحب نے پھر بھی بھائی کو بالکل نہ ڈانٹا اور آرام سے سمجھاتے رہے۔

میں سوچتی ہوں کہ اگر اس وقت والد صاحب نرمی کا برتاؤ نہ کرتے تو اس کے کتنے برے اثرات میرے بھائی پر پڑتے۔ وہ آئندہ شاید ہمیشہ کے لیے والد صاحب سے متنفر ہو جاتا۔ اپنی باتوں کو والد صاحب سے چھپانے میں ہی عافیت سمجھتا۔

☆☆☆

تین الفاظ پر مشتمل یہ جملہ آپ کو زندگی بھر کے پچھتاوے، شرمندگی اور کسی بھی ناخوشگوار واقعے کے وقت غصہ کرنے کے بعد کی کڑواہٹ، بدمزگی اور عرصۂ دراز تک قائم رہنے والی دل آزاری جیسے احساسات سے بچا سکتا ہے۔

کچھ دن پہلے بازار جانا ہو۔ وہاں ایک آدمی اپنی موٹر سائیکل پارکنگ ایریا سے نکال رہا تھا۔ پیچھے نہ دیکھنے کی وجہ سے بائیک گاڑی سے ٹکرا گئی اور اس کے سامنے والی بتیاں ٹوٹ گئیں۔ بظاہر تو یہ بہت بڑا نقصان اور غصے والی بات بھی تھی مگر بائیک والے نے فوراً ہی اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگی اور گاڑی کے مالک سے کہا کہ آپ کا نقصان پورا کرنے کی میری استطاعت نہیں۔ گاڑی والے نے بھی اس کے غلطی مان لینے پر حیرانگی کا احساس لیے اپنے غصے پر قابو پایا اور بولا:

''کوئی بات نہیں، غلطی ہو جاتی ہے۔''

گھر آکر میں سوچتی رہی کہ اگر وہ بندہ بائیک والے کو

معاف نہ کرتا تو کتنا جھگڑا ہوتا۔ ساری دنیا تماشا دیکھتی۔ دو لوگ ایک دوسرے کے دست و گریبان ہو جاتے۔

اسی طرح میرے دونوں بڑے جیٹھوں کے ساتھ الگ الگ یہ واقعہ پیش آچکا:

وہ اپنی گاڑی ٹویوٹا کرولا میں سفر کر رہے تھے کہ ایک ٹرک نے اور میرے دوسرے جیٹھ کی گاڑی کو اسکواڈ کی ایک گاڑی نے ٹکر مار دی۔ دونوں کو کُل ۱۰۸ ہزار کا نقصان اُٹھانا پڑا مگر اس وقت جب یہ واقعات پیش آئے تو دونوں نے ہی گفت و شنید کے بعد تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف کر دیا۔

لوگوں کو معاف کرنے سے ہی معاف کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ اس جملے کو اپنی زندگی میں رائج کرنے کے لیے چند باتوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

1۔ ہر وقت لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم اور تعوذ کا ورد رکھیں۔ اس سے شیطان آپ سے دُور رہے گا۔

2۔ گھریلو خواتین گھر میں کھانا پکاتے ہوئے آٹا گوندھتے ہوئے، روٹیاں پکاتے ہوئے اور پانی پر بھی سورہ الناس و فلق پڑھ کر پھونکتی رہیں۔ اس طرح آپ کے کام بھی ہوتے رہیں گے اور ساتھ ساتھ ذکر الٰہی بھی ہوتا رہے گا۔

3۔ دن میں دس میں سے ایک بات پر روزانہ یہ جملہ "کوئی بات نہیں" کہنے کی عادت بنائیں۔

4۔ مسئلوں کا حل نکالیے۔ بجائے ہر بار تنگ ہونے کے۔ جھگڑوں اور باتوں کو دہرانے سے مسئلہ اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔

5۔ ایک بار بات دوسرے کو سمجھا دیں اور مختصراً بات کریں۔ یہ بھی سنت ہے۔ کچھ عرصہ خاموشی اختیار کیجیے۔ پھر بھی اگر مسائل حل نہ ہوں، تب دوبارہ بات کیجیے۔ مسلسل سمجھانا، لمبے لمبے لیکچر دینا، بات کی اہمیت کو ختم کر دیتا ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی سمجھ لی جائے۔ بچوں کی تربیت، گھریلو معاملات کو سلجھانے اور معاشرے میں ہونے والے کبیرہ گناہ مثلاً قتل، چوری، زنا، عدالتوں کی ناانصافی جیسے مظالم کو ہم ..... خیر ہے، کوئی بات نہیں، جیسا جملہ کہہ کر ٹال نہیں سکتے بلکہ ان پر فوری ردِعمل کی اور قانون کی پابندی کروانے کی ضرورت ہوگی۔

اگر ہم یہ بات سوچیں کہ درگزر کرنا اللہ کی اور ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سنت ہے تو اس پر عمل کرنا ہمارے لیے آسان ہو جائے گا۔

اس ضمن میں آپ ﷺ کا ایک بدو کو معاف کر دینے والا واقعہ کیا ہی خوبصورت مثال ہے۔ جب ایک بدو نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ صحابہ کرامؓ اس بدو کو مارنے کے لیے دوڑے۔

آپ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو اور پھر اس بدو کو اپنے پاس بلا کر پیار سے سمجھایا کہ یہ غلط حرکت ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کے اخلاق کو دیکھتے ہوئے وہ اسلام لے آیا۔

اگر آپ ﷺ اس بدو کو معاف نہ کرتے تو بات بڑھ جاتی اور وہ اسلام جیسی نعمت سے محروم رہ جاتا۔

وقتی طور پر کسی تلخ بات کو ہضم کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے مگر اس کے ثمرات ہمیں آگے جا کر سمجھ آتے ہیں اور جب ہم اخروی فائدے کو پیشِ نظر رکھتے ہیں تو اس پر عمل کرنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔

اس جملے کو کہاں کیسے اور کب استعمال کرنا ہے؟ اب یہ آپ پر منحصر ہے۔

لمحۂ فکریہ

ہادیہ امین

بس ایک جرثومہ

مشینی زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی کہ ایک خوردبینی جرثومے نے اپنی حاضری لگا کر ایک زور کا جھٹکا دیا۔ مانند زلزلہ جس کے بعد سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے۔ کئی لمحے انسان اس سوچ میں محو رہتا ہے کہ کیا اور کیوں ہو گیا؟ یہ میری سالوں پر محیط زبردست منصوبہ بندی میں کس نام کا سبق تھا؟ اور یوں اسے دل سے احساس ہوتا ہے کہ کاتب تقدیر وہ نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔

وہی طاقت، جس نے نمرود کو ایک مچھر سے اس کی حقیقت یاد دلائی مگر ہم سچ بولنے اور اس کا سامنا کرنے سے ڈرنے والے لوگ نمرود کے مچھر اور خوردبینی کرونا کو کبھی بھی ''اتفاق'' نہیں کہیں گے۔ ہم کرونا یا لاک ڈاؤن سے تھوڑی یا بہت متاثرہ قوم، کیا ہم نمرود جیسی خصلتوں کے حامل ہو گئے؟ یہ تو انتہائی بات ہے نا؟ نہیں یہ انتہائی بات نہیں۔

کئی ماہ پر مشتمل لاک ڈاؤن جس میں کتنے منصوبے ٹوٹے، ہر صبح ملنے والی وفات کی خبریں ''ولا ان کفرتم ان عذابی لشدید'' کا احساس دلاتی ہیں۔ ہاں وہ سازگار حالات، جس میں ہم اپنا زور دکھاتے تھے، کاروباری افراد ہیرا پھیری کرتے تھے، ہماری تقریبات بے جا اسراف پر مشتمل ہوتی تھیں، ہمارے بچے کتاب اللہ کے سوا ہر کتاب کی اہمیت جانتے تھے، وہ اچھا وقت نفاذ دین کے لیے تھا۔

کم از کم پانچ فٹ کے جسم پر ہی مگر ہماری اُس مشینی زندگی میں، اللہ نے بہت تھوڑا مطالبہ کیا تھا اور ہم ناعاقبت اندیشوں نے اس کی طاقتوں کو نہ پہچانا۔

اب بدلتی زندگی ہے اور ہم!! یہ بدلتی زندگی، ہماری کھلی آزمائش ہے۔ جس کے بعد کھرا اور کھوٹا الگ ہونا ہے کہ کون اس آزمائش سے کندن بن کر نکلتا اور کون اس جانور کی مانند ہے جسے پتہ ہی نہیں کہ مالک نے مجھے کیوں کھولا اور کیوں باندھا..... مگر مومن ہمیشہ صبر یا شکر میں سے کسی ایک سواری پر ہوتا ہے۔ یہی امّت کو درس دیا گیا ہے۔

ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم اس بدلتی زندگی میں صابر شاکر ہیں یا اب بھی ہماری ننھی سی زبان ذکر اللہ کے بجائے شکوہ کناں ہے؟ ہم اے ایم اور پی ایم کے فرق کو بالائے طاق رکھ کر وقت گزار رہے ہیں یا ان لمحات کو قرب الٰہی اور حصول علم کا ذریعہ بنا رہے ہیں؟ مگر ایک بات جو بلاگز، کتابیں، مباحثے نہیں سمجھا سکے وہ اس خوردبینی جرثومے نے سکھا دی۔

آپس کی ملاقاتیں کتنی بڑی نعمت تھیں؟ مسلمان سے مصافحہ کا بھی اپنا ہی لطف تھا۔ میری مصروف زندگی رب کا انعام۔ گھر آئے مہمان واقعی رحمت تھے۔ سڑک پہ رواں ٹریفک امن کی نشانی تھا۔ یہ وہ نعمتیں تھیں جن کی اہمیت کبھی گردانی ہی نہیں گئی۔

واقعی اے انسان! اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو کر ہی نہیں سکتے۔ اس بدلتی زندگی نے جاگتے ہوئے انسان کو واقعی بدل دیا اور جو سویا ہوا ہے اس کے لیے محض ایک ہوا کا جھونکا ہو کے گزر گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اے انسان! تم اولوالباب ہو یا شرّ الدّواب ہو؟ تم بدل گئے ہو یا سو رہے ہو؟

ہلکی پھلکی کہانی

محمد فاروق انجم

اللہ بنائے جوڑی

میں جس کمپنی میں ملازمت کرتا تھا اس نے اچانک میرا تبادلہ اپنی دوسری برانچ میں کر دیا جو میرے شہر سے تین گھنٹے کی مسافت پر ایک بڑے شہر میں تھا۔ مجھے اس تبادلے پر پریشانی بھی تھی اور خوشی بھی۔ پریشانی یہ کہ اس شہر میں ہمارا دور نزدیک کا کوئی رشتے دار نہیں رہتا تھا۔ اس لیے رہائش کا مسئلہ تھا۔ فی الحال کمپنی مجھے رہائش نہیں دے رہی تھی۔ خوشی اس بات کی کہ اس شہر میں میری محبوبہ ریحانہ رہتی تھی۔

ریحانہ کی میرے ساتھ دوستی کو ابھی محض سات ماہ اور تین ہفتے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوبصورت اور شیریں لہجے کی مالک لڑکی تھی۔ اس کے ریشمی بال اور غزالی آنکھیں مجھے ہر وقت اپنے حصار میں لیے رکھتیں۔ سات ماہ اور تین ہفتوں میں ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے تھے۔ ہماری دوستی ایک سوشل میڈیا کے ذریعے ہوئی اور اب ہم شادی کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔ ریحانہ کو یقین تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو شادی کے لیے منا لے گی کیونکہ اس کے گھر والے پڑھے لکھے اور کاروباری لوگ تھے۔ مجھے بھی پورا یقین تھا کہ میں جس لڑکی کی طرف اشارہ کروں گا میرے والدین انکار نہیں کریں گے سوائے پھوپھا مشتاق کے۔ وہ ہمارے خاندان کے ایسے بزرگ تھے جن سے مشورہ نہ بھی کیا

دو "مہذب" خاندانوں کے ملاپ کی پُرلطف کہانی... جن کا ملنا سبھی کو حیرت زدہ کر گیا

جائے تو وہ اپنا مشورہ لے کر گھر پہنچ جاتے اور اپنی بزرگی کا رعب ڈالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ بہرحال یہ بعد کی بات تھی۔

پھوپھا مشتاق میرے لیے خطرے کی گھنٹی اس لیے بھی تھے کہ ان کی بیٹی کو بہو بنانے کی بات ابا نے ایک محفل میں کر دی تھی۔ اس کے بعد جب پھوپھا مشتاق کی ضدی، اکھڑ اور بات بات میں دخل اندازی کی عادت مزید بڑھ گئی تو ابا نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ ان کی بیٹی کو خاندان میں اپنانے والا کوئی نہیں تھا اس لیے وہ بضد تھے کہ ابا میری شادی ان کی بیٹی کے ساتھ کرنے کے لیے ہاں کریں۔

مجھے سب سے زیادہ پریشانی رہائش کی تھی۔ میرے گھر والے بھی سوچ رہے تھے کہ میں کہاں رہوں گا۔ ایک دن میرے ابا نے اپنے دوست سے بات کی اور انھوں نے اپنے کسی جاننے والے سے جو اسی شہر میں رہتا تھا جہاں میرا تبادلہ ہوا تھا۔ انھوں نے سنا تو جھٹ سے کہہ دیا۔

”یہ تو پریشانی کی بات ہی نہیں۔ میرا فون اور اتا پتا دے کر بھیج دو۔ میں اسے مفت رہائش دے دوں گا۔“

ان کی بات اسی طرح دوست بادوست میرے ابا تک پہنچی اور میں نے شکر کیا کہ رہائش کا انتظام ہوگیا ہے۔ اب میری خوشی دوچند اس لیے بھی ہوگئی کہ ریحانہ سے اب ملاقات ہو پائے گی۔ میں نے اسے اطلاع کر دی تھی اور وہ بھی بہت خوش تھی۔

مقررہ تاریخ کو میں نے رخت سفر باندھا اور روانہ ہوا۔ مطلوبہ اسٹیشن آیا تو میں نے ابا کا بتایا ہوا پتا رکشے والے کو دیا اور اس جگہ جا پہنچا۔ دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اندر سے ایک صاحب نکلے۔ ان کی عمر پچاس سے زیادہ ہی ہوگی۔ انھوں نے میرا اچھی طرح سے جائزہ لیا اور مسکرا کر بولے۔

”ہاں وہ میرا ذاتی مکان ہے۔ میرے دوست نے بات کی تو میں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ تو مسئلہ ہی نہیں۔ جب تک چاہے بچہ اس مکان میں رہے۔“ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی موٹر سائیکل باہر نکالی جسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ موٹر سائیکل کی عمر بھی اُن صاحب سے ایک دو سال زیادہ یا کم ہی رہی ہوگی۔ انھوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور مجھے اپنے پیچھے بٹھایا اور ہم مکان کی طرف چل پڑے۔ وہ شاید کچھ باتونی تھے اس لیے تمام راستہ بغیر وقفہ وہ بولتے رہے۔

”میرے پاس کچھ پیسے پڑے تھے تو میں نے جگہ خرید کر اس پر ایک جیسے دو مکان کھڑے کر دیے۔ سوچا کہ بک جائیں گے تو منافع ملے گا لیکن ابھی آبادی کا اس طرف زیادہ رجحان نہیں ہے۔ خالی پڑے ہیں وہ مکان۔ اب تم ایک مکان میں رہو گے اور دوسرا مکان میں نے کرائے پر دے دیا ہے۔ وہ بھی ایک دو دن میں وہاں منتقل ہو جائیں گے......“

وہ بولتے رہے اور ہمارا سفر جاری رہا۔ جتنا ہم نے سفر طے کر چکے تھے مجھے خدشہ ہوا کہ وہ مکان کسی دوسرے شہر نہ ہو۔ وہ کالونی آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

بہرحال شہر کی آبادی پیچھے رہ گئی اور ایک سڑک آ گئی جس کے دائیں بائیں کھیت اور خالی جگہ تھی۔ پھر آبادی شروع ہوگئی اور وہ بولے۔ ”لو جی ہماری کالونی آ گئی۔“

میں نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ وہ کالونی کافی بڑی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی تین گلیاں مکانوں سے مکمل بھری ہوئی تھیں۔ اس سے آگے کہیں کہیں مکان نظر آ رہے تھے۔ جب وہ ’کہیں کہیں‘ نظر آنے والے مکان بھی پیچھے رہ گئے تو سامنے پھر خالی پلاٹ اور سڑکیں تھیں۔ کالونی کے آخر میں بالکل الگ تھلگ دو مکان ایستادہ تھے۔ ان دونوں مکانوں کے پیچھے، دائیں بائیں اور آگے خالی پلاٹ تھے۔ وہ دو معصوم سے مکان اس جگہ ایسے کھڑے تھے جیسے ہوم ورک نہ کرنے پر ماسٹر جی نے انھیں دھوپ میں کھڑا کر کے سزا دی ہو۔

میں حیرت سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اردگرد اُجاڑ بیاباں ویرانی تھی۔ انھوں نے ایک مکان کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر لے گئے۔ مکان بڑے نہیں تھے۔ دونوں بالکل ایک جیسے بنائے گئے تھے۔ ایک آگے اور ایک پیچھے کمرا، چھوٹا سا صحن اور باورچی خانے کے کیبنٹ بنے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ایک باتھ روم تھا۔

''لو میاں..... مزے سے رہو۔ ایک دو دن میں تمہارے ساتھ والے مکان میں کرائے دار آ جائیں گے تو رونق رہے گی۔'' انھوں نے کہا اور باتیں کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ساتھ والے مکان میں کرائے داروں کو یہ صاحب کہیں آنکھوں پر پٹی باندھ کر تو یہاں نہیں لائے؟

میں باہر نکلا تو حیرت سے چونکا۔ باہر نہ موٹر سائیکل تھی اور نہ وہ صاحب۔ دُور وہ مجھے جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس کا مطلب وہ مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ سوچا تو یہ تھا کہ وہ چائے پلا کر کچھ کھلا کر یہاں لائیں گے لیکن وہ ایسے بے مروت میزبان نکلے کہ سادہ پانی بھی نہ پوچھا۔

بہر حال مجھے رہنا تو تھا۔ جب تک کسی اور رہائش کا انتظام نہ ہو جاتا۔ میں باہر نکلا اور اس طرف چل پڑا جہاں آبادی تھی۔ پیدل چل کر بمشکل وہاں پہنچا تو ایک بڑا اسٹور تھا۔ میں نے سوچا کہ سونے کے لیے بستر کی ضرورت ہے۔ پہلے وہ خرید لیا جائے۔ اسٹور والے سے مارکیٹ کا پوچھا تو اس نے جس طرح نقشہ مجھے سمجھایا وہ ایسے ہی تھا جیسے میں جنگ کرنے جا رہا ہوں۔

سڑک تک پہنچا تو سواری کوئی نہ تھی۔ اسٹور والے نے بتایا تھا کہ لوکل بس جاتی ہے جو پہلے ہی سواریوں سے بھری ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہوا۔ جب بس آئی تو جتنے مسافر اندر تھے اس سے زیادہ باہر اور چھت پر تھے۔ میری اس بس میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے بعد ایک ٹرک مجھے آتا دکھائی دیا۔ میں اس سے لفٹ لے کر شہر تک پہنچا اور بستر وغیرہ خریدے۔ واپسی کا سفر ایک الگ داستان الگ ہے۔

☆.....☆.....☆

رات کو میں سونے کی نیت سے چھت پر گیا۔ دُور تک بھیانک کالی خاموشی کا راج تھا۔ جہاں آبادی تھی وہاں روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں اور خالی پلاٹ اندھیرے میں ڈوبے بے حد سرد مہر اور ہولناک تاثر دے رہے تھے۔

میری وہاں سونے کی ہمت نہ پڑی اور میں واپس نیچے آ گیا۔ موبائل فون پر نیٹ آن کیا تو ریحانہ آن لائن تھی۔ ہماری باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے بتایا کہ میں اس کے شہر آ چکا۔ وہ خوشی سے جھوم اُٹھی۔ ہم نے ملاقات کا وقت اگلی دوپہر دو بجے کا طے کر لیا۔

ایک تو رات اتنی خاموش اُوپر سے ریحانہ سے پہلی ملاقات کا جوش..... مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ بڑی مشکل سے رات کا اندھیرا، دن کی روشنی میں گم ہوا تو میں نک سک سے تیار ہو کر سواریوں سے بھری بس میں بمشکل سوار ہوا اور اپنے آفس پہنچا۔ دوپہر تک ساتھیوں سے ملنے ملانے اور تعارف میں جیسے تیسے نکالا اور دو بجے سے کچھ پہلے میں سیدھا اس ریستوران کی طرف دوڑا جہاں ہماری ملاقات طے تھی۔

ریحانہ نے بتایا تھا کہ اس نے سبز رنگ کا ڈوپٹا اوڑھا ہوگا۔ میں نے اپنی نشانی سفید شلوار قمیص کے اُوپر نیلے رنگ کا کوٹ بتائی تھی۔ جونہی اندر داخل ہوا میری متلاشی نگاہیں اسے تلاش کرنے لگیں۔ اچانک میرے عقب سے ایک مترنم آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''آپ قمر ہیں.....؟''

میں فوراً گھوما۔ میرے بالکل قریب ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے نیلا ڈوپٹا اوڑھا ہوا تھا۔ وہ تصویر سے

بھی کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

''آپ ریحانہ ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

دونوں کے چہروں پر خوشی کے پھول کھل رہے تھے۔ ہم ایک میز کی طرف بڑھے اور آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ویٹر آیا اور اس نے مینو کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ ریحانہ نے بڑی بے تکلفی سے بہت کچھ آرڈر میں لکھوایا اور پھر ہم باتیں کرنے لگے۔

''میں نے اپنے گھر والوں سے آپ کی بات کر لی ہے۔ آپ کے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ انھیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میں بھی اپنے گھر والوں سے جلد از جلد بات کر لوں۔'' میں جھٹ سے بولا۔

''آپ کا مجھ سے شادی کا ارادہ ہے تو آپ بات کر لیں ورنہ رہنے دیں۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''میرا ارادہ کیا میرا پختہ ارادہ ہے کہ میں آپ سے ہی شادی کروں گا۔'' میں مزید کچھ بولنا چاہتا تھا مگر ویٹر کھانا لے کر آ گیا۔ ہم کھانا کھانے کے دوران بھی باتیں کرتے رہے۔ ریحانہ بتا رہی تھی کہ کاروبار کی وجہ سے اکثر اس کے والد اور تینوں بھائیوں کو شہر سے باہر جانا پڑتا ہے۔ وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔ پھر ریحانہ کچھ اور باتیں بھی بتانے لگی اور ہماری پہلی ملاقات یادگار لمحات کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچی۔

☆.....☆.....☆

گھر آ کر میں سوچنے لگا کہ اپنے والدین سے کیسے بات کروں؟ حالانکہ مجھے بات کرنے کی پوری آزادی تھی لیکن پھر بھی مناسب الفاظ کا چناؤ بھی ضروری تھا۔ میں اسی سوچ میں گم تھا کہ ساتھ والے مکان میں کوئی ہلچل سی محسوس ہوئی۔ کچھ بولنے، سامان اُٹھانے اور رکھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر اپنا کان دیوار سے لگا دیا۔ پتلی سی دیوار سے آوازیں میرے کان میں پڑنے لگیں۔ مرد غصے سے کہہ رہا تھا۔

''ہزار بار منع کیا ہے میری ڈائری ادھر ادھر نہ کیا کرو۔ میرا ہر پروگرام اس پر لکھا ہوتا ہے۔''

پھر تیز نسوانی آواز سنائی دی۔ ''میں ڈھونڈ دوں گی ڈائری.....اس میں کچھ نہیں لکھا ہوا.....ابھی کوئی کام نہیں ہے تم لوگوں کے پاس۔''

''جتنا میں پوچھا کروں اتنا ہی جواب دیا کر۔ تیز گام کی طرح اپنی زبان باتوں کی پٹڑی پر نہ ڈالا کر۔'' مردانہ آواز سنائی دی۔

''میں نے اتنا ہی جواب دیا ہے۔ مجھے بھی تیرے ساتھ فالتو بکواس کا شوق نہیں۔'' نسوانی آواز سنائی دی اور اس کے بعد لڑائی شروع ہو گئی۔ جب ان کا شور مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں سیدھا باہر گیا اور ان کا دروازہ بجایا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر ایک کالا سا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے چمکدار کرتے کے ساتھ سفید شلوار پہنی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے اسے بالکل اُمید نہ ہو کہ ان کے مکان کا بھی کوئی دروازہ بجائے گا۔

''میں اس ساتھ والے مکان میں رہتا ہوں۔'' میں نے تھوڑے سخت لہجے میں اپنے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اپنے پیلے دانت نکال کر مسکرایا۔ ''بڑی خوشی ہوئی ہے جی.....ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے جہاں ہم نے کرائے پر مکان لے لیا ہے اب ہم صرف اپنی چھت پر کوؤں کی ہی آواز سنا کریں گے۔ ہماری خوش نصیبی کہ آپ کی آواز ہمیں اپنے دروازے پر سنائی دی۔''

میں اس کی بات سمجھ نہیں سکا کہ اس نے مجھے بھی کوا کہا یا ایسے ہی بات کی تھی۔ بہرحال میں نے اس سوچ میں پڑنے کے بجائے اس سے رعب دار آواز میں کہا۔

''مجھے شور پسند نہیں۔ جو بات بھی کرنی ہے، وہ آہستہ آواز میں کریں۔''

''میں اپنے گھر والوں سے لکھ کر بات کر لیا کروں؟'' اس نے معصومیت سے اور میٹھے لہجے میں پوچھا اور میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ فنکار لوگ ہیں۔

''کان کھول کر سن لو۔ میں یہاں شور برداشت نہیں کروں گا۔ آئندہ مجھے تم لوگوں کے لڑنے جھگڑنے کی آواز نہ آئے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' میں نے آنکھیں نکال کر دھمکی دی اور اپنے مکان کی طرف بڑھا تو اس آدمی نے دروازے میں ہی کھڑے کھڑے اندر کی طرف منہ کر کے آواز دے کر پوچھا۔

''میں نے کہا...... اگر تمہاری لڑائی ختم ہوگئی ہے تو میں اندر آجاؤں اور اگر ابھی اور لڑنا ہے تو چلو اپنے کسی رشتے دار کے گھر چلتے ہیں۔ یہاں آواز نہیں نکالنا منع ہے۔''

اس آدمی کے اس طنزیہ لہجے پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں تیزی سے پلٹ کر اس کی طرف بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑا اور اسے ایک طرف جھٹک کر اندر چلا گیا۔ اس کے بعد پھر آواز نہیں آئی۔ میں نے اطمینان سے امی کو فون کیا اور ریحانہ کے بارے میں بتانے لگا۔ میں نے بتایا کہ وہ پڑھی لکھی اور کاروباری فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ امی بہت خوش ہوئیں اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ابھی ابا سے بات کرتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد امی کا فون آ گیا۔ امی نے کہا۔

''دیکھ بیٹا! میں نے تیرے ابّا سے ساری بات کر لی ہے۔ انھوں نے کہا ہے اگر خاندان اچھا ہے اور تم مطمئن ہو تو چپ چاپ اس سے نکاح کر لو۔ تمہارا پھوپھا مشتاق اپنی بیٹی کا رشتہ لیے اس وقت بھی ہمارے گھر موجود ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہماری ہاں سن کر ہی جائے گا ورنہ یہیں پڑا رہے گا۔ تم جانتے ہو کہ خاندان میں سبھی اس سے کنی کتراتے ہیں۔ تمہارے ابا اور میں بہت پریشان ہیں۔ تم نکاح کر لو گے تو ہم کہہ دیں گے لڑکے نے خود ہی نکاح کر لیا، اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟ پھر اسے یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ اس کی ضد اور پتھر میں ٹھوکی کیل میں کوئی فرق نہیں۔''

میں بہت خوش ہوا۔ مجھے تو بڑی آسانی سے اجازت بھی مل گئی تھی اور میں شادی بھی کر سکتا تھا۔ کچھ باتوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا اور ریحانہ کے خیالوں میں کھو گیا۔

رات خاموش تھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرے اندر بھی رعب اور دبدبہ ہے۔ اسی لیے ہمسائے ڈر گئے۔ اب وہ ایک دوسرے سے باتیں بھی کانوں میں کر رہے ہوں گے۔

رات کا آخری پہر تھا جب باجا بجنے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں نیند سے اُٹھ بیٹھا۔ اس کے بعد گانے کی آواز سنائی دینے لگی اور ریاض ہونے لگا۔ لمبی لمبی تان نکالی جانے لگی۔ ایک کی تان ختم ہوتی تو دوسرے کی شروع ہو جاتی۔ یہ سلسلہ صبح تک جاری رہا اور میں اس دوران ایک لمحہ بھی نہ سو سکا۔

صبح ہوتے ہی میں تیزی سے باہر نکلا اور ان کا دروازہ پیٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی آدمی باہر نکلا اور اپنے میٹھے اور مخصوص لہجے میں بولا۔

''بھائی صاحب میں بہرہ بالکل بھی نہیں۔ ہلکی سی آواز بھی سن لیتا ہوں۔ خواہ مخواہ آپ نے اپنے ہاتھوں کو اتنی تکلیف دی۔''

''یہ کیا ڈراما لگا رکھا ہے؟ میں پوری رات بالکل بھی نہیں سو سکا۔ تمہارا باجا کہاں ہے؟ میں ابھی اسے توڑتا ہوں۔'' میں غصے سے چیخا۔

وہ اپنے دھیمے اور میٹھے لہجے میں بولا۔ ''ہم خاں صاحب لوگ ہیں۔ ہمارا باجا ہی توڑ دیا تو ہم کس کام کے...... اب ہم ریاض کریں گے تو ہمیں کام ملے گا۔ پہلے ہی اتنا مندا

ہے کہ کوئی فنکشن نہیں مل رہا، اُوپر سے آپ ہم پر غصہ نکال رہے۔''

''میں کہہ رہا ہوں۔اب مجھے تم لوگوں کا ریاض سنائی نہ دے اور نہ میرے کانوں میں تم لوگوں کی آواز پڑے ورنہ میں اس مکان کو آگ لگا دوں گا۔'' میں نے اور بھی غصے سے کہا اور آنکھیں نکال کر اسے گھورا اور واپس اپنے مکان میں چلا گیا۔اس کے بعد ایسی خاموشی ہوئی کہ جب تک میں دفتر کے لیے چلا نہیں گیا مجھے کسی کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔

☆.....☆.....☆

دفتر میں امی کے مسلسل فون آتے رہے کہ پھوپھا مشتاق نے ہمارے گھر میں دھرنا دیا ہوا ہے۔اس کے حامی رشتے دار بھی ہمارے گھر آ کر اس کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ پھوپھا مشتاق ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ جو میرے ابا نے الفاظ کہے انھیں پورا کریں۔حالانکہ ابا نے محض ایک سرسری بات کی تھی۔ پھوپھا مشتاق سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔امی کہہ رہی تھی کہ جیسے بھی ہو، نکاح کر کے جلد از جلد نئی دلہن اور اس کے ابا امی کو گھر لے آؤ۔ میں نے امی کو تسلی دی اور فون بند کر کے ریحانہ کو فون کیا اور ساری بات صاف بتا دی۔ وہ بولی۔

''میں اس وقت اپنی خالہ کے گھر ہوں۔ چند دنوں سے یہیں رہ رہی ہوں۔ میں ابھی ابا اور امی سے بات کر کے آپ کو فون کرتی ہوں۔''

ایک گھنٹے کے بعد ریحانہ نے بتایا کہ میں نے گھر والوں سے بات کی تو پہلے تو وہ حیران رہ گئے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ شادی ایسے تھوڑی ہوتی ہے۔ جب میں نے آپ کا مسئلہ بتایا اور ساتھ یہ کہ آپ کے اماں ابا یہی چاہتے ہیں تو میرے ابا اور اماں بھی مان گئے۔انھوں نے کہا کہ اگر میں مطمئن ہوں تو آج ہی نکاح کر دیتے ہیں۔البتہ بھائی مخالفت کر رہے ہیں۔''

''اگر وہ راضی ہیں تو مجھے کچھ وقت دو۔ میں آج ہی اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر آتا ہوں ورنہ پھوپھا مشتاق اور ان کی ہلاکو بیٹی میرے گلے پڑ جائے گی۔'' میں گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

ایسی شادی بھی شاید ہی کسی کی ہوئی ہو۔آناً فاناً سب کچھ ہوا۔ میں نے دفتر سے آدھے دن کی چھٹی لی اور اپنے دوستوں کو لے کر، اچھی طرح تیار ہو کر ریحانہ کی خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ ہمارا نکاح ریحانہ کی امی کی اجازت سے ہوا کیونکہ ریحانہ کے ابا عین وقت پر اپنے اس بیٹے کو سمجھانے چلے گئے تھے جو اس نکاح کی بہت مخالفت کر رہا تھا۔ ہمارا نکاح ہو گیا اور میں نے امی کو فون کر کے بتا دیا کہ میں نے نکاح کر لیا ہے اور کل اپنی نئی بیوی اور اس کے ماں باپ کے ساتھ ملنے کے لیے آ رہا ہوں۔

ریحانہ دلہن بنی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں نے کرائے پر گاڑی لی اور اپنی دلہن کو لے کر اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ ادھر میں نے اپنے دروازے پر کار رکوائی، ادھر وہ خاں صاحب اپنے گھر سے باہر نکلے اور مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک کر اسی جگہ رک گئے۔ میں نے پہلے اسے گھورا اور پھر ریحانہ سے آہستہ سے کہا:

''ایک منٹ میں ابھی آیا۔''

میں خاں صاحب کے پاس پہنچا اور اس کا بازو تقریباً مروڑتے ہوئے ایک طرف لے جا کر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''اگر آج رات باجا بجایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

وہ بے چارہ مجھے معصومیت سے دیکھتا ہی رہا۔ میں واپس ریحانہ کے پاس آیا، اس کا ہاتھ پکڑا اور پیار سے اندر لے گیا۔ اندر جاتے ہی ریحانہ نے جو سوال کیا اس نے میرے پیروں تلے سے زمین ہی کھسکا دی۔ اس نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کیا کہہ رہے تھے..... میرے ابا سے؟''

میں نے ریحانہ کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا۔ ''کون ابا.....؟؟''

''وہی جو آپ کے ساتھ والے گھر سے باہر نکلے تھے اور آپ انھیں ایک طرف لے جا کر کچھ کہہ رہے تھے۔''

''وہ تمہارے ابا ہیں؟؟'' مجھے لگا مکان کی چھت میرے سر پر آن گری ہو۔

''ہاں۔'' وہ اسی مسکراہٹ سے بولی جس پر میں فدا تھا۔

''وہ تو خاں صاحب ہیں۔'' میں حیرت کی گہرائی میں گرتا جا رہا تھا۔

''خاں صاحب کیا انسان نہیں ہوتے؟ وہ ایک فنکار ہیں۔ میرے بھائی بھی فنکار ہیں۔ ابھی ہم یہاں حال ہی میں شفٹ ہوئے ہیں۔ مجھے میری خالہ نے کچھ دن کے لیے روک لیا تھا۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے گھر والے کاروباری لوگ ہیں۔ اکثر شہر سے باہر آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''اپنا کماتے ہیں..... فنکشن کے لیے شہروں سے باہر بھی جاتے ہیں۔ کسی سے بھیک نہیں مانگتے..... تنخواہ دار ملازم نہیں ہیں تو کاروباری ہی ہوئے نا۔''

میں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور دل ہی دل میں بولا۔

''کہاں تم خاں صاحب گھرانے سے اور کہاں میں راجپوت خاندان کا لڑکا..... میرے گھر والوں کو پتا چلا تو وہ ایسی ایسی باتیں کریں گے، ایسا طنز و مذاق کا نشانہ بنائیں گے کہ میرے ماں باپ اپنا چہرہ چھپائیں گے اور مجھ پر لعن طعن کریں گے کہ میں نے کس خاندان کی لڑکی کو ان کی بہو بنایا۔''

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' ریحانہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے پوچھا۔ میں جواب دینے کی بجائے محض اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں تب چونکا جب میرا موبائل فون بجا۔ میں نے موبائل فون کان سے ایسے لگایا جیسے وہ گرم استری ہو کیونکہ وہ کال امی کی تھی۔

ان کی خوشی بھری آواز آئی۔ ''میں نے سب کو بتا دیا ہے کہ میرے بیٹے نے اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ تمہارے پھوپھا نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور کہا کہ اسے یقین نہیں۔ میں نے کہا کہ کل وہ اپنی دلہن اور اس کے ماں باپ کے ساتھ آ رہا ہے۔ خود دیکھ لینا۔ اب تم کل لازمی آ جانا۔ ساتھ نکاح نامہ بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی، تاکہ تمہارے پھوپھا کی ٹیں..... ٹیں ختم ہو..... اب بتاؤ تم کل کس وقت آؤ گے؟''

میں دم بخود امی کی بات سن رہا تھا۔ جب انھوں نے دو، تین بار مجھ سے پوچھا کہ کس وقت آؤ گے تو میرے منہ سے نکلا۔ ''کل دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔''

☆.....☆.....☆

میرے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ریحانہ کے ابا کے پاس جا کر اپنے رویے کی معذرت بھی کروں اور انھیں یہ بھی کہوں کہ وہ کل میرے ساتھ میرے گھر جا رہے ہیں۔

ہم دونوں ریحانہ کے گھر بیٹھے تھے۔ میرے سامنے ریحانہ کی امی اور ابا براجمان تھے جبکہ اس کے بھائی ہمارے اردگرد کھڑے تھے۔ میں معذرت کرنے کے بعد انھیں کہہ چکا تھا کہ وہ کل میرے ساتھ میرے گھر چلیں گے۔ دونوں میاں بیوی چلنے کو تیار تھے اور خوش بھی۔ اس موقع پر ریحانہ کے ابا نے بتایا کہ ہفتوں سے فنکشن مل نہیں رہے تھے، بغیر لیے دیے بیٹی کا بوجھ سر سے اُتر رہا تھا اس لیے ہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جس بیٹے کو اعتراض تھا اب وہ بھی مان چکا۔

خاں صاحب (سسر جی) بول رہے تھے اور میں سب کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ ان سب کے چمکیلے سوٹوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا کہ فنکار گھرانہ ہے۔

''کل آپ کوئی اور کپڑے پہن لیجیے گا۔'' میں نے معصومیت سے اپنے سسر جی سے کہا۔

''میرے پاس ایک بوسکی کا سوٹ بھی ہے۔ وہ پہن کے جاؤں گا۔'' سسر جی ہنستے ہوئے بولے۔

میرا دل چاہا میں ان سے کہوں کہ وہ میرے گھر والوں کو یہ نہ بتائیں کہ وہ کیا کرتے ہیں مگر میں کہہ نہ سکا کیونکہ زندگی بھر کا معاملہ تھا۔ پوری زندگی اتنی بڑی بات چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں گھر والوں کو کیسے بتاؤں؟ ایک دم بتانا بھی مناسب نہ تھا۔ پھر میں نے کہہ ہی دیا۔

''آپ سے ایک گزارش ہے۔ ہم راجپوت فیملی سے ہیں۔ آپ ابھی یہ کسی کو نہ بتانا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ بس کہہ دینا کاروبار کرتے ہیں۔''

میری بات سن کر سب نے ایک دوسرے کا منہ ایسے دیکھا پھر سسر جی بولے۔

''میں کہہ دوں گا ہمارا ہول سیل ڈھول فروخت کرنے کا کام ہے۔''

''آپ کہہ دینا کہ ہمارا پولٹری فارم ہے۔'' میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے انھیں کاروبار بھی بتادیا۔ بادل نخواستہ سسر جی نے اثبات میں سر ہلایا جیسے انھیں پولٹری کا نام سن کر غصہ آ گیا ہو کہ چوزہ کھائے مدت ہوئی اور داماد جی کہہ رہے ہمارا پولٹری کا کاروبار ہے۔

☆......☆......☆

اگلے روز سسر جی نے بوسکی کا دھلا ہوا سوٹ پہنا۔ اب وہ بالکل بھی خاں صاحب نہیں لگ رہے تھے۔ ساس صاحبہ نے بھی اچھا لباس پہنا۔ ہم وقت پر گھر سے نکل پڑے اور میں سارا راستہ ان کا تلفظ درست کراتا رہا۔ ریحانہ بہت خوش تھی۔ جیسے جیسے شہر قریب آرہا تھا میرا دل گھبرا رہا تھا۔ آخر میرا شہر بھی آیا اور پھر میرا محلہ بھی۔ ہم جب اپنے گھر کے سامنے پہنچے تو وہاں خوب ہلچل تھی۔

جونہی ہم نے اپنے گھر میں قدم رکھا، سامنے میرے والدین، پھوپھا مشتاق اور ان کے حامی رشتے دار کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ایک دم ایسی خاموشی چھائی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی نہ سنائی دے۔ پھر میرے ابا جذباتی ہوکر ہماری طرف بڑھے۔ میں سمجھا ابا مجھ سے لپٹنا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی معانقہ کرنے کے لیے اپنے بازو کھولے مگر وہ سیدھے میرے سسر جی سے ان کا نام لے کر لپٹ گئے۔ اس کے بعد سبھی ہمیں بھول کر ریحانہ کے ابا اور امی سے لپٹ کر رونے لگے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ حد تو یہ کہ پھوپھا مشتاق بھی ریحانہ کے ابا کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔

میں ابا کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ ''آپ انھیں جانتے ہیں؟؟''

''ہاں بیٹا جی......تیری بیوی کا ابا، تمہارے دادا کی دوسری بیوی کی اولاد ہے۔ تیرے پھوپھا مشتاق کی بھی قریبی رشتے داری ہے ان سے۔ بہت سال پہلے ناراضگی ہوگئی تھی۔ ملنا جلنا بھی ختم ہو گیا تھا۔ ہم تو ایک دوسرے کو بھول ہی چکے تھے اور اب تو ٹھکانہ بھی معلوم نہ تھا۔ آج اچانک سامنے آیا تو ساری ناراضگی ختم ہوگئی۔ دیکھو سبھی ان سے مل رہے ہیں۔ سب اس ملاپ پر بہت خوش ہیں۔'' ابا نے انکشاف کیا۔

''لیکن ابا ہم تو راجپوت خاندان سے ہیں؟'' میں نے فوراً سوال کیا۔

میرے ابا نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر راز افشا کیا۔

''دراصل بہت سال پہلے ہمارے خاندان والے یہ کام چھوڑ چکے تھے۔ ہم چپکے سے راجپوت ہو گئے......مگر بیٹا! آج وقت نے ایک بات ثابت کر دی۔ ہم اصل سے جتنا بھی بھاگیں یا چھپیں، وہ ہمیں ایک نہ ایک دن ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔''

یہ کہہ کر ابا پھر ان کی طرف بڑھ گئے۔

◆◆◆

ڈاکٹر یونس بٹ

پابندی کی اوقات

میں وقت کا اِس قدر پابند تھا کہ عین اس وقت دوسروں کے گھر پہنچتا جب وہ کھانا شروع کرنے لگتے، لیکن جب سے میرے پروفیسر دوست ایک تقریب میں پابندیِ وقت پر تقریر کر کے لوٹے ہیں، میں نے اس پابندی سے آزادی کا اعلان کر دیا ہے۔

پروفیسر موصوف مقامی کالج میں لیکچرار ہیں۔ لیکچرار کی تعریف یہ ہے کہ وہ شخص جو دوسروں کی نیند میں بولتا ہے، لیکن ہمارے پروفیسر صاحب کی کلاس میں تو کوئی نہیں سو سکتا، بہت بلند بولتے ہیں۔ جب میرے کلاس فیلو تھے، تب بھی کلاس میں کسی کو سونے نہ دیتے۔ ان کے خراٹوں کی وجہ سے پاس سوئے ہوئے کی فوراً آنکھ کھل جاتی۔ جب سے پروفیسر طاہر القادری صاحب نے لیکچرار اور پروفیسر کے فرق کو ختم کیا ہے، وہ بھی پروفیسر کہلانے لگے ہیں کہ اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہی نہیں خود کو پائے کا لیڈر بھی سمجھتے ہیں۔ یوں بھی ہمارے ہاں چھوٹے پائے بڑے پائے کے لیڈر ہی ہیں، بڑے سر کے لیڈر کم ہیں۔

انھیں ایک کونسلر نے پابندیِ وقت پر تقریر کرنے کے لیے اپنے محلے میں بلایا۔ پروفیسر صاحب اِس قدر باُصول ہیں کہ ٹریفک کی سرخ بتی پر سائیکل کو لٹا کر کپڑے جھاڑتے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

بتی سبز ہوتی ہے، تو سائیکل پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بتی پھر سرخ ہو جاتی ہے اور وہ وہاں لال پیلے ہوتے رہتے ہیں۔ اِس قدر تیز چلتے ہیں کہ جب تک آپ رُک نہ جائیں، آپ کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ چل رہے ہیں۔ بال بنانے میں اِتنی دیر لگاتے ہیں جیسے امجد اسلام امجد ہر بال سنوارنے میں آدھ منٹ لگاتا ہے۔ یوں اُسے بال سنوارنے میں دس منٹ لگ جاتے ہیں جب کہ پروفیسر صاحب کو بھی لگتے تو دس منٹ ہی ہیں، مگر یہ بال سنوارنے میں نہیں، بال ڈھونڈنے میں لگتے ہیں۔ شیو یوں آہستہ آہستہ کرتے ہیں کہ جتنی دیر میں شیو مکمل کرتے ہیں، اِتنی دیر میں وہ دوبارہ بڑھ چکی ہوتی ہے۔

''فارغ البال'' ہونے کی وجہ سے انھیں منہ بھی دُور تک دھونا پڑتا ہے۔ سو اَبھی اُنھوں نے منہ دھونا شروع ہی کیا، تو

اہم آدمی اُس وقت آتا ہے جب سب آ چکے ہوتے ہیں

میں نے برین واشنگ شروع کر دی، یوں بھی برین واشنگ آج کل اتنی اہمیت حاصل کر گئی ہے کہ امریکا میں 94 فی صد گھرانوں میں ٹی وی سیٹ تو موجود ہیں، مگر نہانے کے ٹب صرف 91 فی صد گھروں میں ہیں۔ ویسے بھی میں اِس قدر صفائی پسند ہوں کہ جس کے پیچھے پڑتا ہوں، ہاتھ دھوکر پڑتا ہوں۔ سو میں نے انھیں قائل کر لیا کہ بقول شیکسپیئر ''تین گھنٹے پہلے جانا ایک منٹ دیر سے جانے سے بہتر ہے'' کیونکہ وہ دیر کرنے میں ذرا دیر نہیں کرتے۔ یہ ان کی پیدائشی خوبی ہے، پیدا بھی دسویں مہینے ہوئے۔ شام کو تقریب سے لوٹے، تو لوٹے کم اور لُٹے زیادہ لگتے تھے، آ کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ حالانکہ مقرر، ڈاکٹر اور بیوی کی خاموشی کوئی اچھا شگون نہیں ہوتی جبکہ سیاست دان کی نبض نرس 72 فی منٹ بتائے، تو اس کا مطلب ہوگا 72/ الفاظ فی منٹ۔

میں نے پوچھا: ''کیا ہوا؟''

''بڑی بے عزتی ہوئی۔''

''کوئی نئی بات بتاؤ۔ تمھیں کہا تھا وقت پر نہیں پہنچو گے، تو ایسا ہوگا۔''

''وقت پر پہنچا تھا، اسی لیے تو بے عزتی ہوئی۔''

ہوا یوں کہ جب پروفیسر صاحب عین وقت پر جلسے کی جگہ پر پہنچے، تو جلسہ ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ جمعدار جھاڑو دے رہا تھا۔ ٹینٹ والے سامان اُتار رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی موصوف کو نہیں پہچانتا تھا۔ سو اُنھوں نے محلے والا سمجھ کر چھوٹے موٹے کام لینے شروع کر دیے۔ دریاں تک بچھوانے والے نے کہا:

''ذرا صاحب! دوسری طرف سے پکڑنا، آپ ہی کا کام کر رہے ہیں۔'' جب تک کونسلر صاحب آئے، موصوف کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب تک کوئی باقاعدہ تعارف نہ کرواتا، یہ خود کو بھی نہ پہچان سکتے۔ اوپر سے شکل اللہ نے ایسی دی کہ ریلوے میں سفر کریں، تو ٹکٹ چیکر سب سے پہلے ان کا ٹکٹ چیک کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر ان کے پاس ٹکٹ ہے، تو ڈبے کے ہر مسافر کے پاس ہوگا۔ بہرحال انتظامیہ نے انھیں کرسیِ صدارت پر بٹھا دیا، بلکہ لٹا تو دیا، مگر ساتھ ساتھ یہ پوچھتے رہے کہ فارغ تھے جو بہت جلدی آ گئے۔ ان کے خیال میں صدارت کے شوق نے پروفیسر صاحب کو اتنی جلدی وہاں پہنچوایا تھا۔

ویسے دیکھا جائے تو یہ ہے بھی ٹھیک، ہم آزاد قوم ہیں، پابندی چاہے وقت کی کیوں نہ ہو، اس کی ہمارے سامنے کیا اوقات۔ دیر کرنے میں تو ہم ذرا دیر نہیں کرتے۔ سابق وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو تو ایسے تھے کہ شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے نکلتے، تو ویسے پر پہنچتے۔ آج کا کام کل پر نہ چھوڑتے، بلکہ کل کا چھوڑا ہوا کام آج ہی کر لیتے۔ یوں بھی دیکھا جائے، کہ آپ اکیلے جلدی کام کریں گے، تو دیر تو ہو گی۔ اندھوں میں پہلے وہ گرتا ہے جسے تھوڑا نظر آتا ہے۔ آپ وقت کی پابندی کر کے زیادہ سے زیادہ وہ کام صرف ایک ہفتے میں کر لیں گے جسے دوسری صورت میں پورے سات دن لگ جائیں گے۔

کہاوت ہے ''دیر آید درست آید۔'' اپنی آمد درست ثابت کرنے کا اب ایک ہی طریقہ ہے دیر سے آئیں۔ جتنی دیر آپ دوسروں سے انتظار کرواتے ہیں، دراصل اتنی دیر آپ ان سے اپنا ذکر کرواتے ہیں۔

اہم آدمی اُس وقت آتا ہے جب سب آ چکے ہوتے ہیں اور اس کی آمد کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ دیر سے آنا دراصل عام سے خاص ہونے کا عمل ہے۔ آپ دیر سے آ کر کہیں کہ بہت مصروفیت تھی، صرف آپ کی خاطر چند منٹ نکال کر آیا ہوں۔ یوں انھیں اپنی اہمیت کا احساس دلائیں کہ جب تک آپ خود کو اہم نہیں سمجھیں گے، کوئی آپ کو اہم نہیں سمجھے گا۔

چند ہفتوں کا مہمان

حکیم سید صابر علی

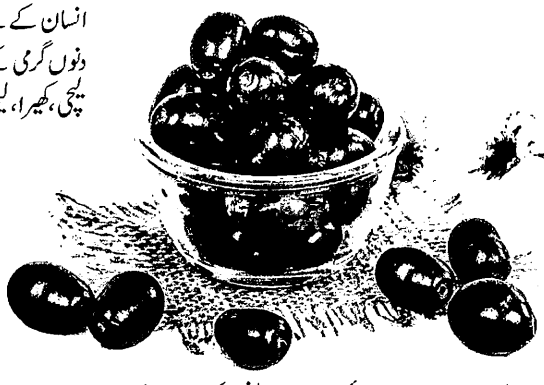

باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے وہ ستانے کے لیے ایک پیڑ تلے بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی جھولی میں چھوٹا سا جامن آن گرا۔ اس نے اُسے اٹھایا اور کپڑے سے صاف کر کے منہ میں ڈال لیا۔ میٹھا شہد جامن رسیلا تھا۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ للچائی نظروں سے درخت کو دیکھنے لگا۔ اچانک اس کے ذہن میں تدبیر آئی۔ اس نے بینچ پر کھڑے ہو کر درخت کی موٹی بھری شاخیں ہلانی شروع کر دیں۔ پھر تو جیسے قدرت نے اس کے اردگرد اس نعمت جیسے پھل کی برسات کر دی۔ پھولوں کی طرح برستے جامن بہت بھلے محسوس ہو رہے تھے۔ اسے دیکھ کر کچھ بچے بھی جامن کھانے کے شوق میں وہاں آ گئے اور جھولیاں بھرنے لگے۔ کچھ دیر پہلے سنسان معلوم ہوتے باغ میں جیسے زندگی دوڑ گئی۔ پھل کو درخت سے براہ راست توڑ کر کھانے میں جو مزہ ہے وہ بازار سے خرید کر کھانے میں کہاں۔

اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا انسان شکر ادا نہیں کر سکتا۔ جھلسا اور تڑپا دینے والے موسم گرما کے ان ایام میں قدرت کاملہ نے انسانی صحت کو برقرار اور موذی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے بے حد مفید پھل، سبزیاں اور نعمتیں حضرت انسان کے لیے پیدا کی ہیں جو وافر مقدار میں ملتی ہیں۔ ان دنوں گرمی کے اثرات کے خاتمہ کے لیے تربوز، آلو بخارہ، لیچی، کھیرا، لیموں جیسی نعمتوں کے علاوہ ایک بہت بڑی نعمت خوش ذائقہ پھل جامن ہے۔

یہ پھل اگرچہ چند ایام کے لیے مارکیٹ میں آتا ہے لیکن موسم کی شدت سے پیدا ہونے والے امراض کے علاج کے لیے نعمت عظمیٰ ہے۔ خوش رنگ جامن منوں کے حساب سے مارکیٹ آتے ہیں۔ ریڑھی والے اور چھابڑی والے گلی محلوں اور بازاروں میں ”کالے راجوں دے“ کی آواز لگا کر بیچتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جموں کے جامن اپنے ذائقہ مٹھاس اور افادیت کے اعتبار سے منفرد ہوتی مگر جامن پاکستان کے ہر علاقہ میں خصوصاً سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں کثرت سے ملتا ہے۔

قدرت نے ہر پھل کو دوسرے سے غذائیت اور افادیت میں ہم پلہ بنایا ہے، پھر چاہے وہ سستا سا جامن ہی کیوں نہ ہو

جامن کے درخت بلند و بالا ہوتے ہیں۔ سبز پتوں کے درمیان ہزاروں کی تعداد میں یہ مختصر سائز کا سیاہ رنگ (بلکہ گہرے نیلے رنگ) کا پھل اپنی بہار دکھاتا ہے۔ جو

لوگ تجارت کی غرض سے درجنوں کے حساب سے درخت لگاتے ہیں، وہ اس پھل کو نقد آور پھل کی حیثیت سے توجہ دیتے ہیں۔ عام طور پر اس کی زمین پر گرنے والی گٹھلی خودرو پودے کی حیثیت سے اُگتی ہے اور نرسری سے خریدنے کی بجائے یہ پودا اپنی اولاد کو خود جنم دیتا ہے۔

جامن کا خوش رنگ پھل آنکھوں کو بھاتا ہے۔ کچا پھل زبان کو خشک کرتا مگر پکا ہوا پھل میٹھا، خوش ذائقہ اور مزیدار ہوتا ہے۔ عموماً اس پھل کو درخت پر سیڑھی لگا کر توڑا یا حاصل کیا جاتا ہے مگر وسیع پیمانے پر درخت کو ہلا کر نیچے گرا کر اکٹھا کیا جاتا ہے۔

اصولاً کوئی بھی پھل بغیر دھوئے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے پھلوں کے درختوں پر مختلف زہریلے اسپرے کیے جاتے ہیں جو انسانی صحت کے لیے بہت نقصان دہ ہوتے ہیں۔

جامن کی افادیت:

بلند فشارِ خون میں یہ بہت مددگار ثابت ہوتا ہے کیونکہ اسے کھانے سے بلڈ پریشر فوری کم ہوتا ہے۔ اس پر نمک چھڑک کر کھانا سودمند رہتا ہے کیونکہ نمک اس کے منفی اثرات روکتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جامن میں موجود آئرن کو نمک ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

جامن انسانی جسم پر شدت گرمی کے بد اثرات، مثلاً بھوک کی کمی کا خاتمہ کرتا، بلکہ بھوک لگاتا ہے۔ صفرا اور خون میں حدت اور جوش کے بڑھنے کو اعتدال پر رکھتا ہے۔ خاص طور پر یہ موسم گرما میں گرمی دانے ''پت'' کو ختم کرنے میں معاون و مددگار ہے۔

ان دنوں نعمت عظمیٰ جسے پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے کی وافر مقدار سے انسان جی بھر کر لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس چیز کا ادراک کیے بغیر کہ ہر چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے۔ چاہے وہ پھل کتنا ہی صحت بخش کیوں نہ ہو، اعتدال سے تجاوز کرنا انسانی جسم کی کارکردگی کے لیے نقصان دہ ہے۔ بے تحاشا آم کھانا بھی کسی طور صحت مند عادت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمتِ بے بہا اور خوش ذائقہ پھل کی زیادتی کے نتیجے میں کیا جانے والا علاج بھی اپنی ایک دوسری نعمت میں رکھ دیا ہے۔ آم کے منفی اثرات ختم کرنے میں تربوز اور جامن سے بڑھ کر کوئی دوا نہیں۔

جامن سے علاج:

معدے اور جگر کی گرمی، مقرالدم (خون کی کمی) صفراوی بخار کے بعد سرخ ذرّوں کی کمی کی وجہ سے انسانی رنگت میں چہرے پر زردی کے نمایاں ہونے کا خاتمہ کرتا ہے۔ پیشاب کی جلن میں جامن کا استعمال بے حد مفید ہے۔ ہاتھ پاؤں کی جلن اور پسینہ آنے سے روکتا ہے۔ شدت کی گرمی میں منہ کا خشک ہونا، بے جا پیاس کا تنگ کرنا، گھبراہٹ اور ایک حد تک خفقان ختم کرنے میں جامن کا پھل مفید اثرات کا حامل ہے۔

عام طور پر گرمی کے موسم میں بچوں کا منہ پک جاتا ہے، چھالے بن جاتے ہیں جسے طب میں آگلرخم کہتے ہیں۔ جامن کا پانی نچوڑ کر چینی ملا کر پلانے سے مرض دور ہو جاتا ہے۔ خونی پیچش جن کے ساتھ مروڑ ہو اور بعض اوقات بواسیر کے خون کو روکنے میں بے حد مفید پھل ہے۔

دل کی بیماری کے لیے مفید:

جامن انسان کو دل کی بیماریوں سے بچاتا ہے کیونکہ اس میں پوٹاشیم بڑی تعداد میں موجود ہے۔ 100 گرام جامن میں 55 ملی گرام پوٹاشیم ہے جو دل کی بیماریوں، ہائی بلڈ پریشر اور سٹروک وغیرہ سے محفوظ رکھتا ہے۔ جامن کا باقاعدگی سے استعمال شریانیں سخت ہونے سے روکتا ہے۔

دانت مضبوط کرنا:

وٹامن سی اور اینٹی بیکٹیریل خصوصیات کا حامل جامن،

دانتوں کے لیے بہت مفید ہے۔ جامن کا شربت پینے یا اس کا رس دانتوں پر لگانے سے دانت سے متعلقہ تمام مسائل کو دور کیا جاسکتا ہے۔

بغیر گٹھلی والا جامن:

جامن کی ایک قسم جو ہمارے علاقے میں نہیں ہوتی، شنید ہے کہ گٹھلی کے بغیر ہے۔ اس کا نام بیدانہ بتایا جاتا ہے۔ اس کا سائز عام جامن سے قدرے بڑا ہوتا ہے۔ یہ ذائقہ کے اعتبار سے عام جامن سے بہت زیادہ خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ ایسا جامن حکیم نبی خاں جمیل سویدا کے ہاں ایک دعوت کے بعد کھانے کا موقع ملا تھا۔ اسے ہم نے سویٹ ڈش سمجھ کر گلاب جامن کی حیثیت سے کھایا تھا۔ مرحوم نے بتایا کہ یہ دہلی سے خاص تحفہ آیا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

درخت کے فوائد:

جامن کا درخت بجائے خود بے حد مفید ہے۔ جامن کا درخت 1911ء میں فلوریڈا سے امریکہ میں متعارف کروایا گیا تھا۔ اس درخت کی چھال کے کئی طبی فوائد ہیں۔ بہت سے عرق جو شوگر کے مرض کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ ان میں اس درخت کی چھال بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی چھال جلا کر بہ طور منجن استعمال، پائیوریا میں مفید ہے۔

ہمارے ہاں پنجاب کے علاقہ میں ایک عام مرض جو موسم گرما میں زیادہ ہوتا ہے۔ بغل کے پسینے کی ناگوار بدبو دور کرنے کے لیے اس کی چھال کو پانی میں اُبال کر بغلیں دھونے سے چند دن میں یہ مرض ختم ہو جاتا ہے۔ جامن کا پھول خشک کر کے بطور نسوار استعمال کرنا نکسیر میں بے حد مفید ہے۔

پتوں کے فوائد:

جامن کے پتے جوش دے کر ان کی کلی کرنا پائیوریا اور دانتوں کے درد میں مفید ہے۔ جامن کے پتے (6 یا 7 عدد) پانی میں بھگو کر اس پانی کا استعمال شوگر میں بے حد مفید ہے۔

تین چار پتے گھوٹ کر پانی چھان کر چینی ملا کر پلانا خونی پیچش میں مفید ہے۔

گٹھلی کے فوائد:

محاورہ مشہور ہے آم کے آم، گٹھلیوں کے دام۔ یہ جامن پر پورا اُترتا ہے۔ کیونکہ اس کی گٹھلی کے ان گنت فوائد ہیں۔ تمام قدیم طبی کتب میں افادیت کے طور پر اس کی گٹھلی کو شوگر کا سستا ترین علاج قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے چند ایک تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔

☆: جامن کی گٹھلی، گڑمار بوٹی، کریلا خشک کردہ، برابر وزن لے کر سفوف تیار کرلیں۔ شوگر کے لیے مفید ہے۔

☆: گٹھلی جامن 9 تولہ، باریک سفوف کر کے زیتون خالق 6 ماشہ ملا کر مونگ کے برابر گولیاں بنا لیں۔ شوگر اور پیچش دونوں میں مفید ہیں۔

☆: گٹھلی جامن اور گٹھلی آم برابر وزن لے کر سفوف تیار کرلیں۔ ہر قسم کے جلابوں میں مفید ہے۔ خصوصاً جو جلاب زیادہ آم کھانے سے ہوئے ہوں، ان کے لیے مجرب نسخہ ہے۔

شربت جامن:

جامن کو اچھی مسل کر پانی نکالیں اور چینی ملا کر شربت تیار کرلیں۔ خون کی کمی، بھوک کم لگنا، پیشاب کی جلن، پیاس کی زیادتی، ہاتھ پاؤں کی جلن میں مفید ہے۔ یہ شربت جامن کے نہ ملنے کے موسم میں جامن کا نعم البدل ہے۔

سرکہ جامن:

جامن کا سرکہ بھی بے حد مفید ہے۔ قے، متلی، بدہضمی میں فائدہ دیتا ہے۔ یہ خوش ذائقہ سرکہ قدرے گلے میں خراش کرتا ہے۔ قدرے چینی ملا کر استعمال کریں۔ شربت اور سرکہ حقیقت میں دونوں جامن کا نعم البدل ہیں۔

منظر علی خان منظر

ہائے اُردو!

قومی زبان سے مُراد ظاہر ہے اُس زبان سے ہے جسے پُوری قوم بولتی ہے یا کم از کم بول سکتی ہے اور جب بول سکتی ہے تو سمجھ بھی سکتی ہے۔ اب اپنا تو باوا آدم شروع ہی سے نرالا ہے۔ یہاں زبان کا سوال تو بہت بعد میں آتا ہے، پہلے مسئلہ یہ ہے کہ کون سی قوم؟ فرض کیجیے کہ وہ جو اس مُلک میں رہتی ہے تو فوراً دوسرا سوال آ کھڑا ہوتا ہے کہ کون سا مُلک؟ آپ نے جناب شفیق الرحمٰن صاحب کی نگارشات میں آنکھوں کے ٹیسٹ کا سوال پڑھا ہوگا کہ مریض کی نگاہوں سے وہ دیوار ہی غائب تھی جس پر حُروف تہجی اُلٹے سیدھے لکھے تھے۔ لہٰذا جب دیوار ہی غائب ہو تو چارٹ کا اور اس پر لکھے ہوئے حُروف کا نظر آنا محال اور ایسے مریض کو اگر خوردبین بھی دے دی جائے تو شاید کام نہ چلے۔

یہاں بھی مسئلہ کچھ ایسا ہی ہے قومی زبان کی بات تو جب طے ہو کہ قوم اور ملک کا مسئلہ واضح ہو۔ آپ نے مُلک کے ایک بڑے اخبار میں مستقل سلسلہ نگارشات دیکھا ہوگا کہ پاکستانی قومیت کیوں نہیں اُبھر سکی؟ تو جب قومیت ہی مفقود ہو تو اُس کی زبان کہاں سے اُجاگر ہو اور کیسے پروان چڑھے۔ ہم لوگ بہرحال اس معاملے میں خاصے خُوش قسمت ہیں کہ ہم نے قومی زبان تو طے کر ہی ڈالی ہے یہ اور بات ہے کہ اسے طے کرنے کے سلسلے میں ہم نے آدھا مُلک اپنی ''سوتیلی قوم'' کو بخش دیا کہ ہمیں کوئی برادران یوسف میں شمار نہ کرے اور قوموں کی تاریخ میں اس بخشش کی یادیں صدیوں منائی جاتی رہیں۔ بات تھی قومی زبان کی، جسے ہم نے طے کر ہی لیا اور ایک بار نہیں بار بار طے کیا کہ کوئی مائی کا لال یہ نہ کہہ سکے ہم کچھ طے ہی نہیں کر سکتے۔ یوں طے کرنے کو ہم نے بہت کچھ طے کر لیا ہے بلکہ کچھ ہمارے اجداد نے ہمارے لیے طے کر دیا اور کچھ ہم نے اپنی اولاد کے لیے! مثلاً یہ کیا کوئی کم اہم مسئلہ تھا کہ ہمارا مذہبی تشخص کیا ہو؟ سو ہمارے اجداد نے اسے طے کر دیا اور سارے بزرگواران نے ہمارے لیے مسلمان

جب قومیت ہی مفقود ہو تو قومی زبان کہاں سے اُجاگر ہوگی؟

ہونا پسند کیا۔ یقیناً نہیں تو غالباً وہ بھی مسلمان ہی تھے۔ اب یہ تو وہ طے کر گئے تھے لہٰذا ہمارے مسلمان ہونے میں کیا مجال کسی کافر کی کہ اعتراض کرے۔

بزرگوں کی روایت پر چلتے ہوئے ہم نے بھی اپنی اولاد کو مسلمانی بخشی، ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک ذرا ہچکچائے کہ اب کاروباری دور میں نفع و نقصان پر نظر رکھنی ہی پڑتی ہے اور مسلمان ہونے کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ دھن کالا ہو یا گوراڈھائی فیصد تو گیا ہی گیا۔ بہرحال یہ تو اگلوں نے بھی طے کر دیا اور کچھ ہم نے بھی کہ دین کے خانے میں ''مسلمان'' لکھا جائے کہ آج ہر ہر قدم پر مختلف فارم پُر کرنے پڑتے ہیں اور دین کا خانہ خالی رہ نہیں سکتا۔ مانا کہ اس دین اور بے دینی کے چکر سے نجات دلانے والے ہر چند کہ نزدیک آ تو گئے ہیں لیکن کچھ زور دار قسم کے دینداروں نے ان کی مزاج پرسی شروع کی ہوئی ہے لہٰذا ان کی مراجعت یقینی نظر آتی ہے دیر سویر کی بات اور ہے۔

تو ہم مسلمان ہیں یہ طے ہے۔ ہم اس کا اعلان بھی ایک جگہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی شلوار کرتہ بھی پہنتے ہیں کہ مسلمانی لباس ہے۔ یوں پہننے کو تو شیروانی بھی کہ شرعی جامہ ہے پہن ڈالیں اگر درزی حضرات سے جنہیں اس ترقی یافتہ دور میں ٹیلر ماسٹر کہتے ہیں، یارانہ ہو۔ ورنہ اسباب دو بئی سے لاکھ پارچہ جات ارسال کریں شیروانی بننے سے تو رہی کہ تنخواہ کے بڑے حصے کے گم ہو جانے کا خطرہ! بہرحال جب یہ طے ہے کہ ہم مسلمان ہیں تو اور دوسری آزمائشوں میں کیوں پڑے؟

یوں بھی ہم اپنی مسلمانی کو تبرک بنا کر بحفاظت رکھنے کے عادی ہیں۔

جس طرح ہمارا مسلمان ہونا طے شدہ ہے اسی طرح ہماری قومی زبان بھی طے شدہ ہم اسے، خُدا ہمیں مزید توفیق عنایت کرے، بڑی متبرک

چیز خیال کرتے ہیں اپنے ٹیلی وژن والے ہمیشہ ٹی وی سے سلیس قومی زبان میں لغت شریف سُناتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی متبرک مہینے میں کچھ تقاریر بھی خالص قومی زبان میں سنوا دیتے ہیں۔ اس میں کسی طرح کی پھینٹ پھانٹ نہیں کرتے کہ قومی زبان کی تقدیس پر آنچ نہ آئے۔ ڈراموں اور دوسرے پروگراموں کی اور بات ہے کہ وہ ''بابا لوگ'' کی زبان میں ہوتے ہیں جس کی قومیت ہی کا ہنوز پتہ لگانا باقی ہے۔

ہمارے احساس تقدس کا عالم یہ ہے کہ جس طرح ہم جزدان میں قرآن پاک کو سنبھال کر رکھتے ہیں اور اسے زیادہ استعمال اس پر عمل نہیں کرتے نہ اس کے احکام پر اور نہ اس کی رُوح پر، اسی طرح ہم اپنی قومی زبان کو زیادہ استعمال، بلکہ خرچ نہیں کرتے کہ اس کی تقدیس پر حرف نہ آئے۔ کبھی میلاد شریف میں، مجلسوں میں یا جمعہ کے خطبے میں اسے استعمال کرتے ہیں یا قوالی وغیرہ بھی اسی زبان میں گاتے ہیں کہ بہت سی متبرک یادیں اس سے وابستہ ہیں۔ دفاتر وغیرہ میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ ہوتے ہیں ورنہ جانے کن حالتوں میں دفتروں میں آتے ہیں اگر قومی زبان استعمال کرنا شروع کر دیں تو بھلا سوچیے قومی زبان کی ''عبارت'' کیسے برقرار رہے گی! اور پھر اصراف بے جا الگ ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے بظاہر اسے اب ذرا زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اُونچے ایوانوں میں بھی گاہے گاہے یہ مروج ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن وہ جو ''بابا لوگ'' کا پاپا لوگ کافی بلندیوں پر دوڑ دھوپ کرتا رہتا ہے اللہ اس کا بھلا کرے اس اصراف بے جا کا فوراً تدارک کر دیتا ہے۔

آپ نے پورے شہر کا اگر کبھی جائزہ لیا ہے تو آپ پر یہ بات واضح ہوگی کہ ہر گلی اور ہر محلے میں بے شمار نئے اسکول کھلے ہیں جن میں ذریعۂ تعلیم صرف انگریزی ہے۔ ظاہر ہے چھوٹے چھوٹے بچے اس احساس تقدس کے حامل کہاں کہ

قوم کی۔

علامہ اقبال رحمت علیہ نے کہا تھا:

''جا کے مسجد میں ہوتے ہیں صف آرا
تو غریب۔''

یہ غریب بھی خُوب لوگ ہیں، اذان کے ساتھ ساتھ مسجد میں جا کر صفِ آراء ہو جاتے ہیں اور ذرا خیال نہیں کرتے کہ

انھیں متبرک قومی زبان سے بچپن ہی سے روشناس کرا دیا جائے ہاں ذرا جب بالغ ہو جائیں تو پھر کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیں گے اور نہیں بھی سیکھ پائیں گے تو کیا؟ آخر پُورے محلے میں ایک مسجد ہی تو ہوتی ہے جہاں دو بندے اگر قومی زبان جاننے والے ہوں بلکہ مؤذن صاحب کا جاننا بھی اتنا ضروری نہیں تو

پاگل

برطانیہ کے سابق وزیرِ اعظم لائڈ جارج کا ایک لطیفہ بڑا مشہور ہے۔ وہ اپنے زمانۂ وزارتِ عظمیٰ میں وینس کا دورہ کر رہے تھے۔ دورے کے سلسلے میں شام کو ایسے مقام پر پہنچے جہاں کوئی ہوٹل نہ تھا۔ رات گزارنے کی فکر میں مکان تلاش کرتے ہوئے ایک کافی شاندار عمارت کے پھاٹک پر پہنچے۔ دربان سے کہا: ''بھائی! میرا نام لائڈ جارج ہے۔ میں برطانیہ کا وزیرِ اعظم ہوں۔ رات کو یہاں قیام کرنا چاہتا ہوں۔''

دربان نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ''آپ بھی لائڈ جارج ہیں؟ بہت خوب! شوق سے قیام فرمائیے!''

لائڈ جارج دربان کا منہ دیکھنے لگے، بولے: ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

دربان نے کہا: ''بات یہ ہے کہ یہاں چار لائڈ جارج پہلے سے موجود ہیں۔''

مزید تفصیل دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مسٹر لائڈ جارج جس عمارت کے دروازے پر کھڑے ہیں، وہ پاگل خانہ ہے جس میں چار پاگل ایسے موجود ہیں جن میں سے ہر اپنے آپ کو ایک اپنے لائڈ جارج وزیرِ اعظم برطانیہ بتاتا ہے۔

کام چل ہی جائے گا۔ یوں امام صاحب بھی گریز کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پورے محلے بلکہ پورے شہر کے لیے کیا ضروری ہے کہ قومی زبان کی تقدیس سے کھیلے۔ ان کے لیے اپنا سابق، آقا جو میراث چھوڑ گیا ہے اُسی کی حفاظت ضروری ہے کہ اُسی کے سہارے تو وہ مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھ سکتے ہیں اور بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔

پھر آپ دیکھیں قومی زبان میں شین قاف کا چکر الگ ہے چاقو کو اگر آپ ''چاکو'' کہہ دیں تو ہر چند کہ اس کی دھار اور تیز محسوس ہوتی ہے لیکن اہلِ زبان تو آپ کو کند ذہن ہی کہیں گے لہٰذا ''ڈائی گر'' کہہ کر کام نکالتے ہیں۔ دوسری الجھن یہ کہ ہم پینٹ پہننا چھوڑ بھی نہیں سکتے اور پینٹ کو پتلون کہہ کر خود کو ''بیک ورڈ'' باور کروانے میں نہ اپنی خدمت ہوتی ہے اور نہ

یہاں اُمراء آ سکتے ہیں، انھیں بھی راستہ دیں۔ یہی حال اُن غربا کا قومی زبان کے ساتھ ہے۔ خود بھی بولیں گے اور بچوں کو بھی اُسی اسکول میں ڈالیں گے جہاں بے شک نشست کے لیے بُوری بچھی ہو مگر قومی زبان پڑھائی جاتی ہو اور اس طرح ساری کی ساری زبان کے خود اجارہ دار بن بیٹھتے ہیں۔ ذرا خیال نہیں کرتے کہ آخر یہ قوم کی ''امانت'' ہے اور اس پر امراء کے بال بچوں کا بھی حق ہے لہٰذا اسے اب اتنا نچلے درجے پر تو استعمال نہ کیا جائے کہ یہ بڑے صاحبان اور ان کے صاحبزادگان کے استعمال کے لائق ہی نہ رہے۔

خدا قومی زبان اور اس کا تقدس برقرار رکھے یا کم از کم تقدس ہی برقرار رہے۔ زبان خواہ اُونچے ایوانوں میں گم بھی ہو جائے تو کیا مسجدوں اور امام باڑوں میں تو شاید جاری ہی رہے گی۔

شعر و سخن

مرتب: عافیہ جہانگیر

14 اور 15 اگست ۱۹۴۷ کی درمیانی شب دنیا کے نقشے پر ایک نئی اور نظریاتی مسلم ریاست معرضِ وجود میں آنے والی تھی۔ امرتسر اور مونا باؤ سے آنے والے مہاجرین اپنا سب کچھ لٹا کر اس ارضِ وطن پر قدم رکھنے والے تھے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ یہ نئی مملکت بطورِ مسجد وجود میں آ رہی۔ اس لیے وہ سرحدِ پاکستان پر قدم رکھتے ہی جوتے اُتار دیتے اور سجدہ شکر میں گر جاتے۔

ٹھیک بارہ بجے ریڈیو پاکستان لاہور سے اُردو میں غلام مصطفی ہمدانی کی آواز گونجتی ہے، ''ہم ریڈیو پاکستان سے بول رہے ہیں''۔ جس پاکستانی سامعین نے یہ آواز سنی، اس کی آنکھیں چھلک گئیں کیونکہ کچھ لمحات قبل اس کی غلامانہ شناخت تھی۔ اب نصف شب وہ آزاد مسلم ریاست کا شہری بن چکا تھا۔ ہر طرف پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعرے گونج رہے تھے۔

اسی اثناء میں ریڈیو پاکستان پشاور سے ایک قومی نغمہ اسٹیشن ڈائریکٹر سجاد سرور نیازی اور ساتھیوں کی آواز میں گونجتا ہے۔

پاکستان بنانے والو! پاکستان مبارک ہو
قومی شان بڑھانے والو! پاکستان مبارک ہو

گویا ریڈیو پاکستان پشاور کی جانب سے پاک فضاؤں میں بکھرنے والا حب الوطنی کا پہلا نغمہ تھا، جسے احمد ندیم قاسمی نے تحریر کیا۔ منور سلطانہ ریڈیو پاکستان لاہور پر اپنا فریضہ انجام دینے کے لیے تیار تھیں۔ ہنگامے عروج پر تھے مگر ان کے والد انھیں ریڈیو لاہور خود چھوڑ آئے۔ رات ساڑھے بارہ بجے ان کی آواز میں نغمہ نشر ہوا تو ہر پاکستانی کا دل بھر آیا اور سب نے اس نغمہ کو اپنے دل کی آواز اور نئی مملکت کے ساتھ اپنے عزم کا اظہار سمجھا۔

''چاند روشن چمکتا ستارہ رہے
سب سے اونچا یہ جھنڈا ہمارا رہے
اس جھنڈے پر اب قوم کی لاج ہے
اس جھنڈے پہ سب کی نظر آج ہے
جان سے کیوں نہ ہم کو یہ پیارا رہے''

اسے شوکت تھانوی نے لکھا تھا اور یہ سبز ہلالی پرچم کا ترجمان تھا۔ اس نغمے کا کوئی حصہ آج بھی نشر ہو تو نسلِ نو کے

افراد بھی دل سے سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

وطنِ عزیز کے شاعروں اور مطربوں نے قومی نغمات کو اتنی اہمیت دی کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ قومی نغمات پاکستان ہی میں گونجتے ہیں۔ ان نغمات کے علاوہ بے شمار شعراء ایسے بھی ہیں جو بابائے قوم کے عشق اور ان سے محبت میں اس قدر بے تحاشا مبتلا تھے کہ انھوں نے بار ہا اپنی اس محبت وعقیدت کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعے کیا۔

جس طرح تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی شعراء اور ادبی شخصیات نے نغمات پاکستان تخلیق کرنا شروع کر دیے تھے۔ جن میں میاں بشیر احمد، مولانا ظفر علی خان، اصغر سودائی، کیف بنارسی اور رئیس امروہوی قابل ذکر ہیں، اسی طرح اُردو شاعری میں قومی شاعری کا آغاز علامہ شبلی نعمانی نے کیا تھا جس کی بنیاد پر مولانا محمد علی جوہر، علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ محمد اقبالؒ جیسے جید شعراء ملت نے مستحکم عمارت تعمیر کی۔

قیامِ پاکستان سے قبل باضابطہ قومی نغمات کا سلسلہ تحریکِ پاکستان کے دوران لکھی جانے والی انقلابی نظموں، قائداعظم کو خراجِ تحسین اور دیگر قومی نظموں سے ہوتا ہے۔

بہتر سال پہلے ایک دن ایسا بھی آیا تھا
جب اک سورج نکلنے پر
چمکتی دھوپ پھیلی تھی تو منظر جگمگایا تھا
اگرچہ میں نے وہ منظر بہ چشمِ خود نہیں دیکھا
مگر جب یاد کرتا ہوں تو سانسیں گنگناتی ہیں
کئی صدیوں سے صحرا میں بکھرتی ریت کی صورت
کروڑوں لوگ تھے جن کا
نہ کوئی نام لیتا تھا، نہ کچھ پہچان باقی تھی
ہر اک رستے میں وحشت تھی
سبھی آنکھوں میں حسرت تھی
نہ آباء سی ہنرمندی، نہ اگلی شان باقی تھی
کھلا سر پر جو اس اعلان کا خوشبو بھرا سایا
تو ان کی جاں میں جاں آئی
دہن میں پھر زباں آئی
بہتر سال پہلے کا وہ اک احسان مت بھولو
خدا کی خاص رحمت ہے یہ "پاکستان" مت بھولو

(کلام: امجد اسلام امجد)

☆☆☆

دیکھیے ان جینے والوں کا نشان زندگی
دیکھیے ان مرنے والوں کا جہان زندگی
دیکھیے ان پستیوں میں آسمان زندگی
دیکھیے ان خاک کے ذروں کی شان زندگی
بیٹھیے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر
دیکھیے روح وفا کیا کیا ابھرتی ہے یہاں
دیکھیے حب وطن دل میں اترتی ہے یہاں
دیکھیے دل کی فضا کیسی نکھرتی ہے یہاں
دیکھیے رحمت خدا کی طواف کرتی ہے یہاں
بیٹھیے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر
اس جگہ بے رنگیاں بھی عالم تصویر ہیں
اس جگہ تاریکیاں بھی شمع کی تنویر ہیں
اس جگہ خاموشیاں بھی اک لب تقریر ہیں
اس جگہ روپوشیاں بھی دل کی دامن گیر ہیں
بیٹھیے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر
اُٹھ گئے دنیا سے لیکن ایک دنیا ہو گئے
بلبلے پانی کے تھے ٹوٹے تو دریا ہو گئے
یہ وہ تھے ذرات جو اڑ کر ثریا ہو گئے
یہ وہ تھے بیمار جو مر کر مسیحا ہو گئے
بیٹھیے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر
دل کے اجڑے باغ کو آباد ہوتے دیکھیے

روح کی افسردگی کو شاد ہوتے دیکھیے
بندگی کو قید سے آزاد ہوتے دیکھیے
پر شکستہ صید کو صیاد ہوتے دیکھیے
بیٹھیے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر
آیئے اس خاک سے کسب فضیلت کیجیے
آیئے قربان اس پر دل کی دولت کیجیے
ہاں ذرا رک جایئے اتنی نہ عجلت کیجیے
اس زیارت گاہ عالم کی زیارت کیجیے
بیٹھیے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر
(کلام: جوش ملسیانی)

☆☆☆

بے اثر ہو گئے سب حرف و نوا تیرے بعد
کیا کہیں دل کا جو احوال ہوا تیرے بعد
تو بھی دیکھے تو ذرا دیر کو پہچان نہ پائے
ایسی بدلی ترے کوچے کی فضا تیرے بعد
اور تو کیا کسی پیماں کی حفاظت ہوتی
ہم سے اک خواب سنبھالا نہ گیا تیرے بعد
کیا عجب دن تھے کہ مقتل کی طرح شہر بہ شہر
بین کرتی ہوئی پھرتی تھی ہوا تیرے بعد
ترے قدموں کو جو منزل کا نشان جانتے تھے
بھول بیٹھے ترے نقش کف پا تیرے بعد
مہر و مہتاب وہیم ایک طرف خواب دو نیم
جو نہ ہونا تھا وہ سب ہو کے رہا تیرے بعد
(افتخار عارف)

☆☆☆

میرے آبا و اجداد نے
اپنی آزادیوں کے سفر میں
تجھے قائدِ فتح مندی کہا تھا
کہ تو اپنی آواز میں بولتا تھا
قفس میں پرندوں کے پر کھولتا تھا
تری سوچ میں روحِ عصر رواں تھی
جو نقارہ جسم و جاں تھی
قیادت تری
جذبہ و عقل کی لوح پر نقش آزردگاں تھی
ترے قافلے میں وہ لوگ آ گئے تھے
جو پچھلی صدی کا نمائندہ کردار بن کر جیے
ان کی نسلیں
تجھے اپنے خوابوں میں آباد دیکھنا چاہتی تھی
ہماری نئی زندگی کی حدوں میں
جو تاریخ چہرہ گری کر رہی ہے
وہاں سب سے اُونچائی پر
تیری تصویر رکھی ہوئی ہے
دھول اُڑاتے ہوئے روز و شب میں
ترا حوصلہ
عزم و ہمت کے سورج اُگاتا رہا
لشکرِ دشمناں کے مقابل بھی تو
اپنی مشعل جلاتا رہا
اپنی تہذیب کی منفرد اہمیت
جس کی پہچان خود آگہی ہے
برف گرتی رہی
اور تیرا ارادہ نئی دھوپ کا استعارہ بنا
ہر سیہ پوش موسم میں تو ہی ستارہ بنا
جو زمیں مدتوں سے غلامی کو پہنے ہوئے تھی
اسے تو نے چاہا
تو وہ پاک ارض وطن بن گئی
وہ جو اپنے پرانے حصاروں میں
بوڑھی حویلی میں زخموں سے لبریز تھے

جشن آزادیوں کا منانے لگے
جبر کے خوف سے جل رہے تھے جو لوگ
اپنی خوش رنگ بارش میں آ کر نہانے لگے
تازہ خوشیوں کے پرچم اُڑانے لگے
میرے آباواجداد نے تجھ کو قائد کہا تھا
کہ تو اپنی آواز میں بولتا تھا
قفس میں پرندوں کے پر کھولتا تھا.....

(کلام: جاذب قریشی)

☆☆☆

ہم عہدِ تازہ میں رہنماؤں کی عظمتوں کو
خراج دینے کی ہر روایت بھلا چکے ہیں
بھلا چکے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اپنی ہستی
یہ جسم وجاں کی شگفتگی کا تمام قصہ
یہ شہریت کا
وطن سے وابستہ زندگی کا تمام قصہ
بس اس حقیقت پہ منحصر ہے
کہ عہدِ رفتہ میں
رہنماؤں کی عظمتوں نے
ہمیں شعورِ حیات بخشا
نئے زمانوں کی آہٹوں کو
سمجھنے والی سماعتوں کا مزاج بخشا
خود اپنے روح و نفس کو آزاد کر کے
زندہ و شاد ماں سی گزرنے والی
حیات نو کا شعار بخشا
مگر عجب ہے کہ
عہدِ تازہ میں
رہنماؤں کی عظمتوں کا
یقین تک ہم نے کھو دیا ہے
کسے خبر ہے اگر عقیدت
لہو میں بنیاد رکھ چکی ہو
تو اپنے اظہار کی ضرورت کے لفظ
خود ہی تراشتی ہے
میں اس حوالے سے چاہتا ہوں
عقیدتوں کا بس ایک لمحہ
جو روحِ قائد کی نذر کر کے
خود اپنی تسکین کر سکوں میں
محبتوں کا بس ایک لمحہ
وطن پہ قربان ہو سکوں میں

(سرور جاوید)

☆☆☆

اس زمیں کے ہونے سے اب ہمارا ہونا ہے
یہ زمیں ہی چاندی ہے یہ زمیں ہی سونا ہے
رنگ اور خوشبو کی ہر طرف ضیاء رکھنا
اِس حسین گلشن کو تم ہرا بھرا رکھنا
یہ جمیل ہریالی رُوح میں سمونا ہے
یہ زمیں ہی چاندی ہے یہ زمیں ہی سونا ہے
عزم کے چراغوں سے دل کی رہگزر چمکے،
چاندنی کے ساون میں ایک ایک گھر دمکے
زندگی کے دھاگے میں روشنی پرونا ہے
یہ زمیں ہی چاندی ہے یہ زمین ہی سونا ہے
اِس پہ رَب کعبہ کی برکتیں برستی ہیں
آخری پیمبر کی رحمتیں برستی ہیں
یہ زمیں ہی اب اپنا اوڑھنا بچھونا ہے
اس زمیں کے ہونے سے اب ہمارا ہونا ہے

(کلام: نجیب احمد)

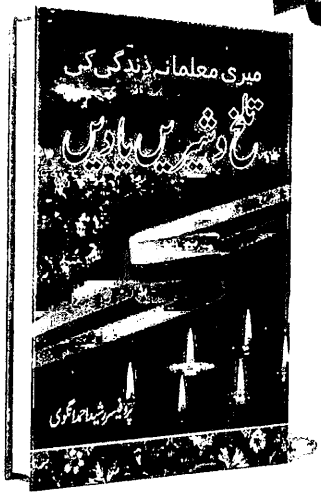

تبصرۂ کتب

عافیہ جہانگیر

مجھے عظیم لوگوں، ادیبوں، مصنفوں اور مشہور لوگوں کی آپ بیتیاں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ یوں کہیے کہ اب یہ شوق زیادہ پروان چڑھ چکا۔ اس کی وجہ یہ کہ دن رات کتابوں کی دنیا میں رہنے سے انسان کا ایک روحانی تعلق کتب بینی کے ساتھ خود بخود جڑ جاتا ہے اور پھر وہ چاہ کہ بھی اس طلسماتی دنیا سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔ وہ ہر روز ایک نئے جہان سے متعارف ہوتا ہے کیونکہ ہر کتاب اپنے اندر ایک نئی کہانی، ایک الگ زمانہ اور نئی جہتیں لیے ہوتی ہے۔

آپ بیتی، رُوداد یا آٹو بائیوگرافی، کسی زمانے میں مجھے بہت بور مواد لگتا تھا۔ میں سوچا کرتی کہ بھلا کسی کی گزری زندگی سے عام قاری کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اس نے اپنی زندگی میں کیا کِیا؟ کس سے ملا؟ اس کے گھر میں کتنے افراد تھے؟ اس نے تعلیمی مدارج کہاں سے طے کیے؟ ان سب سے ہمارا کیا لینا دینا؟ لیکن یہ غلط سوچ تھی۔ انسان کو اپنے راستے، اپنی منزل اور صحیح راہنمائی کے ان تمام لوگوں کی زندگیوں میں جھانکنا پڑتا ہے جو ان تمام مراحل سے بخوبی گزر چکے ہوں۔ ان کی ناکامیاں، برے تجربات، اچھی یادیں، علمی نچوڑ، ہمارے لیے درست سمت کی طرف قدم اٹھانے میں بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب آپ بیتی ہو کسی اُستاد کی، کسی علمی راہنما کی، کسی ایسے انسان کی جس کا اوڑھنا بچھونا صرف علم ہی رہا ہو، تو ایسے انسان کے تجرباتِ زندگی ہمیں بہت سی نئی راہیں دکھلاتے اور زندگی کے بہترین اسباق سے روشناس کرواتے ہیں۔

موضوعِ سخن میرا، آج کی خوبصورت کتاب، پروفیسر رشید احمد انگوی کی تلخ و شیریں یادیں ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے تعلیمی مدارج کے دوران ملنے والے کچھ عظیم لوگ، (عظیم لوگ وہی نہیں ہوتے جو بہت مشہور و معروف ہوں اور جنھیں ایک دنیا جانتی ہو۔ عظیم لوگ وہ بھی ہیں جو شاہراہِ زندگی پر اچانک آپ سے ایک گمنام انسان کی صورت ٹکراتے مگر آپ کا بازو پکڑ کر جانے انجانے، چلتے چلتے، یونہی آپ کو گھما کر آپ کا رُخ، آپ کا راستہ بدل دیتے ہیں اور بھٹکتا ہوا انسان اچانک درست سمت سامنے پا کر سوچتا ہے کہ یہ راستہ اسے پہلے کیوں نہ سوجھا؟ اس نے پہلے یہ کیوں نہ دیکھا؟) تو ایسے عظیم لوگ آپ کی زندگی میں ایک دم آتے ہیں اور آپ کو بہت کچھ سکھا سمجھا کر واپس پلٹ جاتے ہیں۔ آپ بیتیاں ایسے ہی لوگوں کی ان گنت امثال سے بھری ہوتی ہیں۔

پروفیسر صاحب نے اپنی معلمانہ زندگی کے دوران ایسے بہت سے لوگوں کو اپنا ہمراہی اور ہمنوا پایا جنھوں نے اس سفرِ علم میں ان کا ساتھ دیا۔ کسی سے انھوں نے علم کے تجربوں کے بیش بہا موتی اکٹھا کیے تو کسی نے نہ مٹنے والی یادوں کا گلدستہ ہاتھ میں تھما دیا۔ یادیں بھی ایسی کہ جب پروفیسر صاحب اپنی کتاب اور یادداشتیں لکھنے بیٹھے تو جھپاک کر کے وہ تمام لوگ، اپنا حصہ ڈلوانے یادوں میں آن پہنچے۔

ایک فائدہ آپ بیتی پڑھنے سے یہ بھی ہوتا ہے کہ جس

زمانے کی آپ بیتی پڑھ رہے، مصنف نے اس دور میں ہونے والے اہم واقعات وحالات کا بھی مفصل تذکرہ لکھا ہوتا ہے کہ وہ کن حالات میں کن ادوار میں اور کن کن واقعات کا چشم دید گواہ بنا۔ پھر ان واقعات وحالات کا تجزیہ اپنے علم ومشاہدات کی بنیاد پر کرتا ہے یوں آپ کے پاس اچھا خاصا تاریخی مواد بھی جمع ہو جاتا ہے اور معلومات میں اضافہ بھی۔

مثال کے طور پر اس کتاب کے صفحہ نمبر 162 پر مصنف نے قاضی حسین احمد کے خطاب بحوالہ جہاد کشمیر کے بارے میں لکھا ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں مولانا مودودیؒ، مایہ ناز محقق وڈاکٹر محمد حمید اللہ کے اسلام پر راہنما لیکچروں کا ذکرِ خیر، ان کا خوبصورت تعارف، ایران کے عظیم انقلابی راہنما آیت اللہ خمینی کی تفاصیل اور ان کے بارے میں تجزیات ونظریات، آج کے طالبعلموں کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

اب آتے ہیں اس کتاب کے ایک اور دلچسپ اور اہم حصے کی طرف۔ پروفیسر صاحب نے اپنے مختلف اسفار کی تفصیل کو یوں قلمبند کیا ہے کہ اس نے ایک مختصر سفرنامے کی شکل اختیار کر لی۔ پھر چاہے وہ حج کی سعادت کا تذکرہ ہو، چولستان کی سیر، سبی کی گرمی کا احوال ہو یا مختلف مقامات تعلیم وتدریس کی ایک جھلک کا بیان۔ مصنف نے کہیں کوئی کثر نہیں چھوڑی کہ قاری اس کے لفظوں کے جال سے خود کو آزاد کرا سکے۔

ایک کے بعد ایک باب، انوکھا موضوع، دلچسپ معلومات اور مزید اور واقعات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا سب سے بہترین اور خوبصورت حصہ اختتامی انداز ہے جس میں تمام بڑی نامور ہستیوں کا ذکرِ خیر ہے۔ ان میں حضرت بنوریؒ، مولانا محمد چراغؒ، حضرت مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیلؒ، حضرت مولانا محمد ذاکرؒ، مولانا محمد نافعؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے بارے میں خوبصورت تعارفی پیراگراف شامل کیے گئے ہیں۔

اور کیوں نہ ہو۔ جس شخصیت کے والد گرامی استاذ العلماء، شیخ الحدیث حضرت مولانا قاضی محمد خلیلؒ ہوں، جو محدثِ کبیر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ وعلامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے شاگردِ خاص تھے، اسے مذہبی وادبی دونوں اعتبار سے ان تمام شخصیات سے محبت وعقیدت رہتی ہے جو ان کی زندگی کے دائرہ کار میں کسی کہکشاں کے مانند گھومتی ہوں یا یہ کہنا زیادہ معتبر ہوگا کہ صاحب کتاب کی زندگی ان عظیم شخصیات کے پُرنور ہالے کے اردگرد ہی گھومتی ہے۔

کوئی بھی انسان کتنا ہی بڑا لکھاری، مشہور ادیب، کامیاب انسان، بہترین مسلمان ہو، اس کی عقیدت اور محبت کا ایک محور صرف اور صرف اس کی ماں ہوتی ہے۔ ماں جیسی ہستی بڑے سے بڑے انسان اور شخصیت کی اوّلین درسگاہ اور ایک مکمل دنیا لیے ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنی والدہ ماجدہ کے متعلق صفحہ 261 پر رقم طراز ہیں:

''دنیا جہاں کے قسم قسم کے موضوعات پر سینکڑوں مضامین گھسیٹ ڈالے مگر نہ معلوم کیا راز ہے کہ وہ پاک ہستی جس کی کوکھ سے میں نے جنم لیا، وہ اپنی حسین وجمیل، عظمت وعزیمت سے بھرپور، پُرشکوہ وپُرجمال، بے مثل زندگی کی ستاسی بہاریں دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوئی تو کتنی ہی مرتبہ جی چاہا کہ اپنی اس حقیقی یونیورسٹی کے بارے میں قلم اُٹھاؤں مگر قلم نے ہمت نہ کی۔ شاید قلم بردار سے بڑھ کر خود قلم کو یاد تھا کہ اسے کانے کی قلم اور لکڑی کی تختی کے راستے کاغذ پر لکھنے کی راہیں کس پاک وجود نے دکھائیں۔ وہ ہستی جس کا اپنا بچپن تعلیم وتصوف کی باوقار ہستی قاضی حسین محمدؒ کے حسنِ تربیت میں گزرا تھا اور رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر قاضی العصر حضرت قاضی مقبول الٰہی کے مایہ ناز لختِ جگر قاضی محمد خلیلؒ کی شریک حیات بننا قدرت نے لکھ دیا تھا۔''

یہ خوبصورت کتاب اس نمبر پر رابطہ کر کے منگوا جا سکتی ہے:

0300-4723514

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سجا کالم

مطالعۂ پاکستان کو لازمی ہونا چاہیے

اسلامی جمہوریہ پاکستان اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا۔اس کی غرض وغایت مختلف مواقع پر اہل ذوق ودانش بڑے اچھے اسالیب تحریر وتقریر کے اندر بیان کرتے اور پھر ان اہل علم کے الفاظ کو اہل ذوق وادب اپنے قلوب واذہان میں جگہ دے کر انھیں سمجھ کر آگے آنے والی نسلوں تک بھی پہنچاتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی نصاب میں بھی مطالعہ پاکستان نامی مضمون پڑھایا جارہا ہے۔اسی طرح میٹرک اور انٹرلیول سے لے کر پی۔ایچ۔ڈی تک تاریخ پاکستان کے نام سے اختیاری مضمون موجود ہے۔ تعلیمی پالیسی میں نہایت ہی کم اس امر کی جانب توجہ دی گئی کہ مطالعۂ پاکستان اور تاریخ پاکستان کو اسلامیات کی طرح لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہماری نسل نو اپنی تاریخ، اپنی ثقافت، اپنے محسنین تہذیب سے ناآشنا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ درجہ ششم سے لے کر ماسٹر لیول تک مطالعہ پاکستان اور تاریخ پاکستان کے مضامین لازمی قرار دیے جائیں۔سب سے پہلے ہمارے تعلیمی نظام کا بیڑا غرق جس چیز نے کیا وہ انگلش میڈیم سسٹم تھا۔جس کے باعث ہمارے طلباء ناکام ہونا شروع ہو گئے۔ پرائمری اسکولوں میں قلم، دوات اور تختی جیسی اشیاء جو طلباء کی ذہانت اور ان کی خط نویسی اور خوش خطی جیسی صفات اور صلاحیتوں کو اُبھارتی تھیں انھیں ختم کر دیا گیا۔

مجھے ابھی تک یاد ہے جب میں چہارم کلاس کا طالب علم تھا تو اس وقت استاد صاحب ہمیں دن میں دو دفعہ تختی لکھوایا کرتے اور طلباء کو خود قلمیں بنا کر دیتے لیکن اب تو پورا پرائمری سسٹم ہی تباہ ہو چکا۔اب تو دسویں جماعت کے طلبا کی لکھائی بھی کسی دوسری جماعت کے بچے جیسی ہوتی ہے۔ ہجے اور املا کی اغلاط الگ۔ دیکھ کر پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔اُردو ڈائجسٹ کی وساطت سے چند قیمتی میں وزیراعظم پاکستان اور صوبائی وزیر تعلیم پنجاب تک پہنچانا چاہتا ہوں:

(۱) بورڈ کے امتحانات میں مطالعہ پاکستان اور تاریخ اسلام کے مضامین کو لازمی قرار دیا جائے۔

(۲) پنجاب یونیورسٹی لاہور کی رجسٹریشن اور داخلہ فیس میں نمایاں کمی کی جائے تاکہ ہر طالب علم باآسانی اپنے تمام تعلیمی مراحل طے کر کے ملک وقوم کی خدمت اور ترقی میں اپنا صالحانہ کردار ادا کر سکے۔

(۳) پنجاب ایجوکیشن انڈومنٹ فنڈ میں طلباء کو بھی شامل کریں جو بطور پرائیویٹ امیدوار کسی بورڈ یا یونیورسٹی سے اچھے نمبر لیتے ہیں، اس میں 50 فیصد یتامیٰ کا کوٹہ بھی ہونا چاہیے جو طلباء یتیم ہیں انھیں 65 فیصد نمبروں پر بھی اسکالرشپ ملنا چاہیے۔

(۵) میٹرک کے بجائے انٹرلیول تک مفت کتابیں فراہم کی جانی چاہئیں۔

(۵) ضلعی سطح پر ہر چھے ماہ بعد تحریری مضامین کے مقابلہ جات کا انعقاد ہونا چاہیے۔

(محمد اکرام الحق، سوہاوہ ضلع جہلم)

☆☆☆

خراجِ تحسین بہ نام کشمیری عوام

جولائی کے مہینے میں گرمی خاصی کم تھی۔ اس حساب سے بجلی کا استعمال بھی کچھ زیادہ نہ ہوا۔ اے سی چلانا تو ویسے ہی خواب وخیال کی باتیں مگر بل اکتیس ہزار کا۔ اگرچہ میری پنشن ہی اکتیس ہزار، سات سو روپے ماہوار ہے سو اس پر بھی حکمرانوں کا بس نہیں چلتا پنشن میں اضافے کا امکان ہی ختم کر ڈالیں۔

اس بار آٹھ جولائی کو شمارہ مل گیا۔ اس کے آنے سے کچھ خوشی ہوئی۔ سرورق رنگ اچھا تھا۔ صفحہ پلٹا، کھلتے بارونق چہرے، مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ ایسے خوبصورت اور خوب سیرت باکردار لوگوں کے جانے سے چمن ویرانوں جیسا ہو گیا ہے۔ خدا کرے کہ ان کی سیرت وکردار ہماری سوانح حیات بن جائے۔ غموں کی طویل داستان ہے، زندگی رہی تو پھر سہی۔

انیسویں صدی کے جبر سے آغاز ہوا تو ظلم نبرد آزما کشمیریوں نے پھر ڈوگرہ حکومت کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔ 1937ء میں پاکستان ہندوستان ہی نہیں اس وقت پورا برصغیر ہی برطانوی سامراج کے زیر نگیں تھا۔ آزادی یا انگریزوں کے خلاف ابھی کوئی بڑی تحریک یا قربانی پیش نہیں کی گئی تھی۔ اس کے برعکس کشمیری عوام اپنے حقوق فرائض سے نہ صرف آگاہی رکھتے تھے وہ پوری طرح تیار بھی تھے۔ اگرچہ نہتے مگر بہادر، نڈر، دین مصطفیٰ ﷺ خاتم النبیین ﷺ کے شیدائی، اللہ اکبر کی صدا بلند کرنے کے لیے سری نگر کی جیل کے سامنے جمع تھے اور چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا جب اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی تو ڈوگرہ ملٹری فورس نے آذان دینے والے مؤذن کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ یہ پہلا شہید تھا اور پھر چشم فلک نے دیکھا کہ آذان مکمل کرنے والے بائیس شہدا یکے بعد دیگرے شہید ہوتے گئے۔ انھوں نے شہادت کا رتبہ حاصل کر لیا جو تمغہ مؤذن کشمیریوں کے ہاتھ لگا اور سینے پر سجا، وہ رہتی دنیا تک کشمیریوں کی میراث ہے۔ یہ ہے وہ لازوال قربانی جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے گی۔ اسے کہتے ہیں آذان شہیری۔ یہ ہے تمغہ جنت الفردوس، یہ ہے سچی محبت۔

جیتی جاگتی خبر یہ ہے کہ پی ٹی وی کے ماہانہ چارجز ایک سو روپے کر دیے گئے جس سے اضافی ستر ارب روپے حکومتی خزانے میں بیٹھے بٹھائے آئیں گے۔ اوّل تو پی ٹی وی بہت کم لوگ دیکھتے ہیں۔ وہ زمانے گئے جب اکلوتے لاڈلے کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ پھر ٹی وی چینلوں کی بہار آ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ فصل کاشت کر دی گئی۔ اتنے ٹی وی چینل، اتنے اینکر پرسن پیدا ہوئے کہ اسی مد میں باہر کی یونیورسٹیوں نے وظائف کی بھرمار کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینئر اینکروں کی لشکر کشی اور جونیئروں کی پیش قدمی نے نظام حیات میں شرافت کی جگہ خرافات کو داخل کیا۔ اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈالا اور بداخلاقی کے ساتھ چیخ چیخ کر بولنے کو رواج دیا۔

ایمان داری کی جگہ بے ایمانی، بلیک میل کرنے، پگڑیوں

کو سنبھالنے کی جگہ اُچھالنے کی مجموعی روش بڑھ گئی۔ روپے پیسے کے لیے سب کچھ نیلام ہونے لگا۔ دھن دولت سمیٹنے میں مگن ان لوگوں نے پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارا نہ کیا۔ حق حلال کی تمیز جاتی رہی۔ کفِ افسوس ملنے کے سوا بس رب کریم سے التجا ہے کہ ہمیں دنیا آخرت کی رسوائیوں سے بچالے مالک۔ جنہوں نے بے جا ظلم زیادتی کی، ان کو دنیا و آخرت میں رسوائی کے علاوہ کچھ نہ ملے گا۔ (شیخ نذیر احمد، اسلام آباد)

☆☆☆

شمارۂ جولائی.....اُمنگوں بھرا ڈائجسٹ

آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا شمارۂ جولائی کا سرورق اپنے آپ میں ایک کہانی لیے ہوئے تھا۔ بادی النظر میں ایک خاتون کی تصویر اور پھانسی کا پھندہ.....؟ دل نے سوچا یہ کیسی اُمنگ ہے؟ پھر غیب سے جیسے مدد آئی اور فیس بک پر اس سرورق کا پورا پس منظر ادارے کی جانب سے پڑھنے اور سننے کو ملا منجانب آرٹسٹ اسلم کمال۔ سوچ کی تمام گتھیاں سلجھتی گئیں اور یوں یہ معمہ حل ہوا۔

مضامین تمام بہترین تھے خصوصاً مزاح میں کہنہ مشق مشہور مصنفین کے شاہکار شاملِ اشاعت دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ شخصیات جو دنیا سے منہ موڑ گئیں، بلاشبہ باکمال تھیں۔ خاص طور پر طارق عزیز صاحب ملک کا لاجواب اثاثہ تھے جو ہم سے بچھڑ گیا۔ یورپی سامراج کی خونریزیاں رونگٹے کھڑے کر دینے والی تاریخ ہے۔ ایک ایک سطر پڑھ کر دل کانپتا رہا کہ یا اللہ! یہ ظلم کرنے والے آخر انسان بھی تھے کیا؟ وحشت اور بربریت کی جو داستان ان ظالموں نے رقم کی، وہ انسانیت کی توہین کے سوا اور کچھ نہیں۔ مایوسی اور بے کاری یا یوں کہہ لیں کہ بے روزگاری کے ان دنوں میں اُردو ڈائجسٹ کا ایسے نمبر نکالنا اس بات کا غماز ہے کہ آپ لوگوں کی نبض پہچانتے ہیں کہ انھیں کس وقت کس چیز کا تحفہ دینے کی ضرورت ہے۔ شکریہ اردو ڈائجسٹ۔ (منظور احمد خان، راولپنڈی)

معاشرے میں پھیلتی بے سکونی

بسا اوقات ہم حالات و واقعات یا کسی کے نامناسب رویہ کی وجہ سے اندر ہی اندر کڑھتے اور بے سکون رہتے ہیں۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ کیا کریں۔ زندگی میں پھیلے انتشار نے پورے بنی نوع انسان کو مایوس کر رکھا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی ایک مشہور شخصیت کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ان پر بہت تنقید ہوتی تھی لیکن وہ جواب نہ دیتے۔ بس اپنے کاموں میں مگن رہتے۔ ایک مرتبہ کسی محفل میں ان سے سوال کیا گیا کہ لوگ تو آپ کے خلاف اتنی تنقید کرتے اور باتیں کرتے بھی ہیں، اخبارات میں شائع بھی کرتے ہیں لیکن آپ کسی کا جواب نہیں دیتے۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں اپنے خلاف کی جانے والی تنقید یا باتوں کا جواب دینے لگ جاؤں تو جو تعمیری کام میں کرتا ہوں وہ نہ کر سکوں۔ اس لیے میں توجہ اپنے کاموں اور اپنے مقصد کے حصول پر مرکوز رکھتا ہوں۔ مانا کہ لوگوں کے رویے اور الفاظ نشتر کی طرح دل میں پیوست ہو کر ہمارے جذبات و احساسات کو زخمی کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے کہ یہ زخم سارے جسم میں پھیل کر ناسور بن جائے ہمیں لوگوں کو معاف کر کے اپنا آپ آزاد کروا لینا چاہیے۔ ورنہ لوگ تو آرام کی نیند سو جائیں گے اور ہم اپنا آپ جلاتے رہیں گے۔ اس لیے لوگوں کو معاف کریں اور منفی رویہ والے لوگوں سے احتراز برتتے ہوئے اپنی فکروں کو اللہ کے ذکر میں سمو کر کے پرسکون ہو جائیے۔ اللہ کریم کا عملی ذکر سکون کے حصول کے لیے زیادہ مؤثر ہے۔ اللہ کریم کے ذکر کی عملی صورت دوسروں کی مدد کرنا، کسی کو پانی پلا دینا، کسی کو کھانا کھلا دینا، کسی کو پڑھا دینا، کسی کو کوئی ہنر سکھا دینا بھی ہے۔ مثبت و تعمیری کام اللہ کریم کے عملی ذکر اور سکون کا ذریعہ ہیں۔

(شاہد محمود، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

◆◆◆

مایوسی کا علاج ہنسی!

ریڈیو کی دنیا بھی ایک عجیب دنیا ہے۔ یہاں پر ہر بات ناپ تول کر کرنا پڑتی ہے۔ ایک لفظ کے ہیر پھیر سے بات کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہے۔ کلام کو سمجھ کر گانے والے گلوکار ش، ق، زبر زیر اور اضافت کا حد درجہ خیال رکھتے ہیں۔ ایسے ہی گلوکار گاتے وقت مطالب اور مفاہیم میں ڈوب کر گاتے ہیں اور سامعین بھی کلام کا صحیح لطف حاصل کرتے ہیں۔ بصورت دیگر بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ روایت ہے کہ کراچی ریڈیو سے ایک گلوکارہ غالب کی مشہور غزل ''دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت'' گا رہی تھیں۔ کم پڑھی لکھی تھیں۔ جب اِس شعر پر پہنچیں ''قیدِ حیات و بندِ غم'' تو اسے یوں گایا:

قید وحیات و بند وغم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

بابائے نشریات مرحوم ذوالفقار علی بخاری گھر پر ریڈیو سُن رہے تھے۔ انھوں نے فوراً ڈیوٹی آفیسر کو فون کیا اور کہا کہ گلوکارہ سے کہو کہ یوں گائے۔

قید وحیات و بند وغم، اصل میں چاروں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(ریڈیو پاکستان کراچی کی پچاس سالہ علمی و ادبی خدمات از ڈاکٹر محمد اقبال خان اسدی)

☆☆☆

مشہور مزاح گو شاعر احمق پھپھوندوی ایک ایسے مشاعرے میں گئے جس میں بہت سے شاعر ان کے ناپسندیدہ تھے۔ انھوں نے اپنے تخلص کا سہارا لے کر ان پر یہ چوٹ کی: ''ادب نوازیِ اہلِ ادب کا کیا کہنا۔ مشاعروں میں اب احمق بلائے جاتے ہیں۔''

Conditional tenders and tender not accompanied with earnest money @ 2% of the estimated amount in shape of CDR/Bank Draft/Cashier's cheque of any scheduled Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

PPRA Rule 35 will be followed in true letter & sprit for rejection of tenders.

Rs. In Million

Sr. No.	Name of Scheme	Estimated Cost & Earnest Money (2% Estimated Amount)	TS No. & Date	Completion Time	Tender Fee
1.	Rehabilitation / Improvement of Adda Naya Lahore to Chak No.340/JB Via 339/JB (Kajly) Length = 2.19 KM	9.067 0.197	E.E. No. 1281 27.07.2020	04 months	Rs.10000/-
2.	Rehabilitation / Improvement of Toba Shorkot Road, Al-Halal Chowk to Shabaz Chowk (Left Side) Length = 0.40 KM	0.197	E.E. No. 1281 27.07.2020	04 months	Rs.10000/-
3.	Construction of Road from 57/4 Tukra to Sher Singh Length = 0.65 KM	7.215 0.144	E.E. No. 1282 27.07.2020	04 months	Rs.10000/-
4.	Widening / Improvement of Road Sindhilian Wali to Waghi (Sindhianwali) Kamalia Road from Km No.0.50 to 0.96 Km Length = 0.46 KM	8.747 0.175	E.E. No. 1281 27.07.2020	04 months	Rs.10000/-

IPL - 6365

Executive Engineer
Highway Division T.T. Singh

Superintending Engineer
Highway Circle, No.2, Faisalabad.

NOTICE INVITING TENDER

Sealed tenders based on item rates (as per TS Estimate) are hereby invited, for the works mentioned below from the contractors/firms enlisted/renewed with C&W Department for the financial year 2020-21 in the field of Highway/Bridges.

Tender Bid documents from the date of publication can be obtained, from the office of the Executive Engineer, Highway Division Toba Tek Sigh on payment of prescribed tender/bid fee in the form of CDR/Bank Draft Cashier's Cheque of any scheduled bank date of publication from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of enlistment/ upto date renewal letter, PEC license, Identity Card of contractor / managing partner/ director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR/ Bank Draft/Cashier's Cheques of any scheduled bank:-

i) Chief Engineer (Central) Punjab Highway Department Lahore.
ii) Commissioner Faisalabad Division, Faisalabad.
iii) Superintending Engineer Highway Circle No.2, Faisalabad.
iv) Deputy Commissioner, Toba Tek Singh.
v) Executive Engineer, Highway Division Toba Tek Singh
vi) Assistant Commissioner, Toba Tek Singh

Tenders rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No rebate on tendered rates will be acceptable.

Tenders will be issued from the date of publication upto 18.08.2020 and will be received on 20.08.2020 upto 02:00 PM and the same will be opened after 30 minutes of the closing time i.e. at 02:30 P.M. simultaneously in the offices of the Chief Engineer, (Central) Punjab Highway Department Lahore and the Commissioner Faisalabad Division, Faisalabad on fixed date and time by the respective Tenders Opening Committee at the above venues in the presence of intending contractors or their representatives.

﴿ایک آنے کا دودھ لیا، اس میں بھی مکھی!﴾

صاحب! اتنے تھوڑے دودھ میں مکھی نہیں تو کیا ملے گا ہاتھی۔

یہ کہاوت نہایت بخیل یعنی کنجوس شخص کے لیے کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت سے متعلق یہ چھوٹی سی حکایت مشہور ہے:

حکایت:

ایک مرتبہ کسی آدمی نے ایک دُکاندار سے ایک آنے کا دودھ خریدا جس میں مکھی پڑی ہوئی تھی۔ آدمی نے دُکاندار سے کہا:

''اس میں تو مکھی پڑی ہوئی ہے''۔ تو دُکاندار نے جواب دیا:

''صاحب ایک آنے کے ذرا سے دودھ میں مکھی نہیں تو کیا ہاتھی نکلے گا''۔

☆☆☆

﴿اینٹ کی پانت، دمدار﴾

جس کسی شخص کو اپنی قوت اور لیاقت کا اندازہ نہ ہو اور وہ اپنی صلاحیت سے زیادہ کسی کام کو کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک اعتقاد سے ہے:

حکایت:

کانپور ضلع کے ایک گاؤں مکن پور میں حضرت بدیع الدین زندہ شاہ مدار کی درگاہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی روحانی قوت یا امت کی وجہ سے ان کی تُربت کے اوپر ایک بھاری پتھر فضا میں معلق ہے۔ ہر شخص کو ایسی روحانی قوت و کرامت کہاں نصیب ہوتی ہے۔

(یہ کہاوت صرف اعتقاد اور سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ میں بذاتِ خود کئی مرتبہ زندہ شاہ مدارؒ کی مزارِ اقدس واقع مکن پور میں حاضر ہوا مگر آپ کی تُربت عالیہ کے اوپر نہ تو فضا میں معلق کوئی پتھر ہی نظر آیا اور نہ ہی اس قسم کے کوئی آثار ہی معلوم ہوئے)۔

☆☆☆

﴿بِش دیتے بِشیاری، ایسے دین دیال﴾

اگر کوئی شخص کسی کا برا چاہے اور اس کو اس سے فائدہ ہو جائے یا کوئی شخص جس تدبیر سے کسی کو نقصان پہنچانا یا کسی کی جان لینا چاہے اور وہی تدبیر اس کے حق میں مفید ثابت ہو تو یہ کہاوت استعمال کی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے یہ چھوٹی سی حکایت بیان کی جاتی ہے۔

حکایت:

ایک شخص کسی کی جان لینا چاہتا تھا۔ اس نے اس شخص کو سمجھا بجھا کر اپنی بیوی کے پاس بھیجا۔ ادھر اس نے اپنی بیوی کو ایک چٹھی لکھی کہ فلاں شخص تمہارے پاس آرہا ہے۔ میں نے اسے بھیجا ہے۔ اسے وِش (زہر): دے دینا۔ بھیجنے والے شخص کی ایک خوبصورت بیٹی تھی جس کا نام وِشیا یا وِشیاری تھا۔ گھر میں سبھی لوگ اسے پیار سے وِش کہہ کر بلاتے تھے۔ بیوی نے وِش کو زہر نہ سمجھ کر وِشیاری سمجھا۔ وہ آدمی جونہی اس کی بیوی کے پاس پہنچا۔ بیوی نے نہایت عزت واحترام کے ساتھ اس کو بٹھایا۔ خاطر مدارت کی اور اپنی پیاری بیٹی وِشیا کو اس کے حوالے کر دیا۔ شادی کرنے کے بعد وِشیا کو لے کر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

☆☆☆

﴿بندگی ایسی اور انعام ایسا﴾

اگر کوئی شخص کسی کی بھلائی کرے اور اس کے عوض اس کو برا بھلا کہا جائے یا سزا دی جائے تو اس کہاوت کو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کا استعمال ایسے موقع پر بھی کرتے ہیں جب کوئی شخص کوئی بڑا کام کرے اور اسے کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہو۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت بیان کی جاتی ہے۔ جو اس طرح ہے:

حکایت:

ایک بار ایک برہمن کسی بادشاہ کے دربار میں گیا اور تین بار سلام یا بندگی کرنے کے بجائے صرف ایک بار ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ جبکہ اس دربار کا اصول تھا کہ بادشاہ کے دربار میں جو بھی حاضر ہوگا وہ جھک کر اور ہاتھ کو اپنی پیشانی تک لے جا کر تین بار سلام کرے گا۔ سلام کرنے کے بعد دست بستہ نیچی نظر کر کے بادشاہ کے سامنے کھڑا ہوگا۔ برہمن کے ایک بار سلام کرنے پر بادشاہ نے اپنی بے عزتی محسوس کی اور فوراً سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس بدتمیز اور دربار کے آداب سے ناواقف برہمن کو میرے سامنے تین طمانچوں کی سزا دی جائے۔ برہمن جو انعام واکرام کی لالچ میں بادشاہ کے دربار میں گیا تھا، اپنے دل میں سوچنے لگا:

''بندگی ایسی اور انعام ایسا''

☆☆☆

5. The procuring agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of bid. The procuring agency shall upon request communicate to any bidder, the grounds for its rejection of all bids or proposal, but shall not be required to justify those grounds. In case of any clerical mistake the tender will be review as per PPRA Rules, 2014.
6. The Contractors have registration with the P.S.T and Income Tax Department bearing valid No.1 of P.S.T & NTN Numbers can only participate in Tender process.
7. Fake/doubtful/conditional & over written Tenders will not be acccptable.
8. This Tender Notice can be read in PPRA Punjab (www.ppra.punjab.gov.pk).
9. All the prevailing taxes levied in country like PST, Income Tax, etc as per prevailing will be deducted from the bill of contractor, accordingly.
10. The execution/completion of work will be strictly in accordance with the specification approved design/drawing and requirement of contract agreement to the entire Estimate (satisfaction) of Municipal Corporation Sialkot which will be whole responsibility of the contractor. The work shall be executed in accordance with the PLG Works Rules, 2017 wherever these rules (PLGA Works Rules, 2017) remain silent; the B&R code will prevail. The lowest contractor who will be awarded the contract after completion of codal formalities shall bound to submit invoices, gate passes, requisite laboratory tests of tuff tiles, sewerage pipes and water supply pipes before submitting payments for his work before MC Sialkot.
11. As per PPRA Rules, 2014 successful bidder has to furnish **Additional Performance Security** similar to the below rate of bidder according to the Estimated Cost in shape of CDR/Bank draft from any schedule bank of Pakistan within **15 days** after the issuance of acceptance of tenders and same will be released after completion of the work as per government instructions.
12. For furthermore details, DNITs and bid (tender) documents can be obtained from the office of Municipal Officer (I&S), MC Sialkot Deputy Director (Development) Sialkot and Director Local Govt. Gujranwala on payment of prescribed fee i.e. **Rs. 5,000/-** immediately, after publication of this tender notice upto 17.08.2020.

IPL - 6415

CHIEF OFFICER

MUNICIPAL CORPORATION

SIALKOT

OFFICE OF THE MUNICIPAL CORPORATION SIALKOT

TENDER NOTICE

Sealed tenders based on item rates percentage or below on approved estimated amount are, hereby, invited for the works mentioned below from the contractors/firms enlisted renewed with Municipal Corporation Sialkot OR registered in any Local Government within the Gujranwala Division for the current financial year. The Tender shall be issued upto 17.08.2020 from the publication of tender notice in newspapers and shall be received upto 18.08.2020 at 12:00 PM. The bids/tenders will be opened on the same day at 12:30 PM. The detail is as under:

Sr. No.	Name of Schemes	Estimated Cost	TS No.
1.	Rehabilitation / reconstruction of Nallah from Eid Gah road to Church road U.C Haji Pura Sialkotof Adda Naya Lahore to Chak No.340 JB Via 339.JB (Kajly) Length = 2.19 KM	3.500	MCS/I&S/65 25.04.2020

Terms & Conditions

1. Tender documents (Bids Document), DNITs and further details can be obtained immediately from the date of publication of invitation to Bids in the Newspapers / PPRA Website from the office of Municipal Officer (I&S), MC Sialkot as well as from the office of Deputy Director (Development), Sialkot and Director, Local Government, Gujranwala on written request accompanied with attested copies of enlistment/up to date renewal letter, PEC License of relevant clause relating to the above works, Identity Card of contractors/Director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee i.e. Rs. 5000/- in the form of CDR/Bank Draft from any scheduled Banks upto 17.08.2020 till the closure of office time.
2. Tender rates and amounts should be filled in figures as well as in words. Tenders should be signed as per general directions given in the bid documents. No negotiation on tender rates will be acceptable after the opening of tenders.
3. Tenders will be received in the office of Municipal Officer (I&S), Municipal Corporation Sialkot and will be opened simultaneously on fix date and time by the respective tender opening committee at the above venue in the presence of intending contractors who wish to participate/present or their representatives at the time of opening of tenders.
4. Conditional tenders and tenders not accompanied with; earnest money at 5% of the estimated cost in shape of CDR/Bank Draft of any schedule Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firm, will not be entertained.